مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ یوسف

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ یوسف

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	.....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۂ یوسف)
دروس	.....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	.....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	.....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	.....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	.....	اگست 2016ء
مطبع	.....	باقر یونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات **سورہ یوسف**
مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: **سورۃ یوسف** (آیات 1 تا 14)

سورۃ یوسف کا شخصی کریکٹر اور سیرت کی مضبوطی کی داستان
اپنے اندر لے ہوئے ہے _____ 21

یورپ میں جنسی بدنہادی کے مہلک اثرات کے نتائج _____ 22

قرآن حکیم کے نزدیک عصمت کی قدر و قیمت اور پھر
مربوط شکل میں داستانِ حضرت یوسف کا تفصیلی ذکر _____ 22

پورے معاشرے میں ایک فرد کی ثابت قدمی اور استقامت
بھی بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے _____ 23

صفات کے لحاظ سے قرآن حکیم ہر قسم کے تضادات سے
پاک، روشن، فصیح، آسان، سہل، دوٹوک، واضح اور بے مثل ہے _ 23

قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس کے
ایک ایک لفظ پر غور و فکر کرے _____ 24

ہمارے ہاں کے دارالعلوموں میں قرآن حکیم کے متعلق پایا
جانے والا تصور اور پھر ارباب شریعت کی سوچ کا ذکر _____ 24

قرآنی حقائق کو سمجھنے کے لیے قرآنی اصطلاحات کے صحیح
مفہوم کو ان کی اپنی وضاحت کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے _ 25

علم حاصل کرنے کے دو طریق ہیں _____ 25

قرآن حکیم میں نہ تو کسی کشف کا ذکر ہے اور نہ ہی کسی الہام کا _ 25

70 یا 80 برس سے علمائے کرام اور احمدی حضرات کے مابین
مناظرے جاری رہنے کی وجہ وحی کی ماہیت کو نظر انداز کرنا ہے 26

لفظ احسن القصص کا مفہوم اس کی اہمیت _____ 26

وحی کا علم نازل ہونے سے پہلے کوئی بھی نبی اُن حقائق سے
باخبر نہیں ہوتا تھا _____ 27

قرآن حکیم کے نازل ہونے سے پہلے تورات اور انجیل
میں تحریف ہو چکی تھی _____ 28

موجودہ ریسرچ کی روشنی میں حاصل ہونے والا اعتراف __ 28

آج ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات تو انہیں غلط روایات
پر ہی مبنی ہیں _____ 28

قرآن حکیم نے داستانِ حضرت یوسف کو احسن القصص
کے حسین انداز میں بیان کیا ہے _____ 29

سائیکولوجی کی دنیا میں خواب کا شعبہ بڑی اہمیت کا حامل ہے _ 29

سائیکولوجی دراصل دو حصوں میں تقسیم ہے ایک شعوری اور
دوسری غیر شعوری شکل جو بڑی طاقت کی حامل ہے _____ 30

سائنس ہمیں یہ تو بتا سکتی ہے کہ یہ کیا ہے لیکن اسے استعمال
کیسے کرنا ہے یہ نہیں بتا سکتی، یہ بتانا صرف وحی کا کمال ہے __ 31

پہلے پہل بچے کا بات کرنے کا طریق _____ 31

Unconscoious mind اور Intellect
(شعور) میں فرق _____ 32

غیر شعوری طور پر دل و دماغ میں گذرنے والے تصورات
سے مربوط سوچ کی عکاسی تک پہنچنے کا طریق _____ 32

علامہ پرویزؒ کی طرف سے دورِ تصوف کی کچھ نظریاتی تعلیم کا ذکر 33
ڈاکٹری علاج میں ہپناٹزم کا استعمال _____ 33
ہمارے ہاں ہپناٹزم کی جگہ کرامات نے لے رکھی ہے _____ 33
امریکہ میں ہپناٹزم کی بنیاد پر چھ چھ گھنٹے کا آپریشن _____ 34
حضرت یوسفؑ کا شجرۂ نسب اور آپ کے خواب کی تعبیر
اور 10 بھاؤں کا حسنِ سلوک _____ 34
قرآن حکیم نے انسان کے سرکش جذبات حسد' انتقام'
نفرت' سازش' عداوت کو ہی شیطان کہا ہے _____ 35
انسان کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ جو چاہے ہے سو آپ کرے'
لعنت کرے شیطان پر _____ 36
خوابوں کی تعبیر بیان کرنے کی بنیاد علم النفس پر استوار ہوتی ___ 36
لفظ تاویل کے لغوی معنی کسی بات کے انجام کا سامنے رکھنا
ہوتا ہے نہ کہ کوئی تعبیر بتانا _____ 37
وجدانی طور پہ کسی بات کا ذہن میں آنا کوئی غیبی یا باطنی شے
نہیں ہوتی بلکہ یہ عقل انسانی کی ہی ایک لطیف شکل ہوتی ہے _ 38
قرآن حکیم کی روشنی میں تاویل الاحادیث کی وضاحت جسے
انگریزی میں Intuition اور اُردو میں وجدان کہا جاتا ہے _ 39
Politician اور Statesman میں فرق _____ 39
اقبال نے یہاں تاویل الاحادیث کے مفہوم کو آئینہ
ادراک کے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے پیری مریدی کی
جڑ کاٹ دی ہے _____ 40
حضرت یوسف کے اپنے آئینہ ادراک کا ذکر _____ 40
مصر کے قید خانے سے مصر کی بدحالی کو سنبھالا دینے کی
خواہش کا اظہار _____ 41
خوابوں کی تعبیریں بیان کرنے کے قصے کی ماہیت
اور تورات کا بیان _____ 41
حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں حضرت یعقوبؑ کی نگاہ بعدیت 41
نبی اکرم ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے بھائیوں کی طرف
سے کیا جانے والا سلوک اور پھر ان کے حالات _____ 42
اہل فکر کے لیے داستانِ حضرت یوسفؑ میں بہت
بڑی نشانیاں ہیں _____ 43
حضرت یوسفؑ اور اس کے بھائی کے خلاف دوسرے
بھائیوں کے حسنِ سلوک کی وجہ _____ 43
عصبیتِ جاہلیہ کی بنا پر انسانوں میں وجہ جامعیت' غلط معیار کی
جگہ فکر و نظر کی ہم آہنگی کی اہمیت _____ 43
حدیث نبویؐ عصبیت کے نام پر ایک دوسرے کو بلانے
والا ہم میں سے نہیں _____ 44
مملکتِ پاکستان کی بنیاد وطن' خون رنگ' نسل زبان پر نہ تھی ___ 44
قبیلوں کا لفظ تو دورِ اولیٰ میں یہ صرف ایک تعارفی نشان تھا ___ 44
قبائلی زندگی کا تصورِ عصبیت کی بنیاد مہیا کرنا ہے
امتِ واحدہ کا نہیں _____ 45
حضرت یوسفؑ کو بھائیوں کے ہاتھوں قتل کرنے کا پروگرام _ 45
صالحین کے لفظ کا بنیادی مفہوم _____ 45
عربی زبان میں مرادفات کا صحیح مفہوم اور ان کا استعمال
اور حضرت یوسفؑ کے ساتھ ہونے والے سلوک کی روئداد ___ 46

دوسرا باب: **سورۃ یوسف** (آیات 15 تا 24)

حضرت یوسفؑ کی داستانِ مسلسل _____ 49
اندھے کنویں سے مصر کی تخت نشینی اور ان بھائیوں کو غلے
کی فراہمی کی سبق آموز داستانِ ایمانیت کا ذکر _____ 50
داستانِ یوسف کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا اندازِ بیان اور
بھائیوں کی حیران کن تتلاتی زبان _____ 51
باب کے سامنے حضرت یوسفؑ کے متعلق بھائیوں کی غلط

بیانی کا انداز _____ 52
والد کی طرف سے صبرِ جمیل اور خدائے علیم وخبیر سے اظہار تمنا _ 52
قافلے والوں کو کنویں سے ایک غلام کے ملنے کی خوشی کا ذکر ___ 53
حضرت یوسفؑ کو اب انسانوں کی برادری سے نکال کر
غلاموں کیکیٹا گری میں شامل ہو گئے _____ 53
حضرت یوسفؑ کی ذات کو خرید وفروخت کی نذر کرنے کا ماجرا 54
قرآن حکیم کے بیان کے مطابق حضرت یوسفؑ کو قافلے
والوں نے ہی بیچا تھا اور نہایت ہی سستے داموں بیچا _____ 55
چند سکوں کے عوض ایک جان کا سودا-مولانا غلام رسول
کا ایک روح پرور شعر _____ 55
لفظ زہد کا حقیقی مفہوم لاپرواہو جانے کا ہوتا ہے _____ 56
قرآن حکیم میں اُن تمام نفسیاتی بیماریوں کا علاج مضمر ہے کہ
جس کا انسان شکار ہو سکتا ہے _____ 56
لفظ عزیز کے معنی احترام کے نہیں ہوتے بلکہ مقام بلند یا
اقتدار کے ہوتے ہیں _____ 57
قرآن حکیم میں استعمال کیے گئے حروف کی بناوٹ ان کو بنانے
کا طریق اور اس لفظ کی گہرائی کی وضاحت _____ 57
قرآن الفاظ کا ہماری زبان میں ترجمہ الفاظ کا حلیہ بگاڑنے
کا باعث بنتا ہے _____ 58
غلامی میں حضرت یوسفؑ کو تکریم آدمیت کے ساتھ تمکن کا
میسر آجانا ایک نعمت سے کم نہ تھا _____ 58
حضرت موسیٰ کو قدم قدم پر خدائے رحیم وکریم کا مشکور
ہونے کی تلقین _____ 59
حکومت وقت کے سربراہ کی ذمہ داری اور رعایا کے ساتھ
روا رکھنے والا سلوک _____ 60
عہدِ فاروقی میں مصر کے ایک گورنر کو سزا دینے کی نوعیت ___ 60
مملکت کی سربراہی کے اسرار ورموز جاننے کے لیے
حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے محلات میں رکھا گیا _____ 61
مملکت کی سربراہی کے لیے تاویل الاحادیث کی اہمیت ____ 62
ایک ذہنی الجھن کا ازالہ اور..... _____ 63
حضرت یوسفؑ کی داستان میں ترغیباتِ نفس کے صبر آزما
مراحل اور عزیز کی بیوی کی دل باختگی کا ذکر _____ 63
حضرت یوسفؑ کی طرف سے بلندی کردار کا مظاہرہ اور
لفظ تعوذ کا مفہوم _____ 64
حضرت یوسفؑ کی طرف سے احسان فراموشی کے الفاظ
خدائے علیم وخبیر کے لیے تھے _____ 65
عزیز کی بیوی کی طرف سے شدت جذبات کا اظہار _____ 66
لفظ ھَمَّ بِھَا کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات ___ 66
اسی آیت کا دوسرا حصہ جس نے بات کو واضح کر دیا _____ 67
ہمارے ہاں کی متضاد سوچ _____ 67
عدالت کے اندر حضرت یوسفؑ کی پاک دامنی کی
شہادت خود عزیز کی بیوی کی زبانی _____ 67
عصمت کی پابندی انسان کو بلندیوں سے ہم کنار کر دیتی ہے _ 68
جنسی جذبات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی تعلیم _____ 68
مذہب کی دنیا میں جذبات کی نفس کشی کا عمل _____ 69
احکاماتِ خداوندی کے برعکس جذبات کی تسکین
Pervertion بدنہادی کہلاتی ہے _____ 69
نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ابلیس کو مسلمان کرنا ہوگا ____ 70
ھُمَّ بِھَا کی عملی تفسیر اور اس کا نتیجہ اور ابلیس وآدم کے قصے
کی عملی شکل _____ 70
خدائی قانون کی عمل داری کے بغیر اچھا بھلا انسان شیطان
کے ہاتھوں ٹٹو بن کر رہ جاتا ہے _____ 71

حفاظت عصمت کا سارا دارومدار قوانین خداوندی کو
ملحوظِ خاطر رکھنے کی داستان ہے _____ 71

تیسرا باب: سورۃ یوسف (آیات 25 تا 35)

معاشرتی سطح پر پھیلی ہوئی فحاشی کا شافی علاج _____ 72
اخلاقی کمزوری کی بنیادی وجہ اور اس کا سدِّ باب _____ 73
حضرت یوسفؑ کے سامنے اقدارِ خداوندی کی اہمیت اور
قرآن حکیم کا ارشاد اور ذکرِ خدا کا مفہوم _____ 74
ہمارے ہاں مساجد میں ذکرِ خداوندی کی محفلیں اور قلب
کی ضربیں _____ 74
ہمارے ہاں تسبیح کے استعمال کا انداز _____ 75
ذکرِ خدا کا اور روٹی خیرات کی _____ 75
رسول اپنی زندگی بشری حیثیت سے گزارتا ہے اور اس کا
اختیار وارادہ سلب نہیں کیا جاتا _____ 76
حضرت یوسف کے متعلق خدا علیم کا ارشاد _____ 76
کیا برہانِ ربی صرف حضرت یوسفؑ کے لیے ہی تھا _____ 77
خدا مجھے دیکھ رہا ہے پر ایمان' بدنگاہی اور خیانت کے لیے
ڈھال کا کام دیتا ہے _____ 77
انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین دل کے اندر گزرنے والے
خیالات کی گرفت نہیں کر سکتے _____ 78
کراچی میں گزرے ہوئے وقت کا واقعہ _____ 78
ہر قسم کی بدعملی کو روکنے کا ایک ہی طریق' اقدارِ خداوندی اور
مکافاتِ عمل پر یقین محکم _____ 79
مکافاتِ عمل کے تحت ایک ایسی سزا جو انسانی ذات کو بدنما
کرتی ہے _____ 80
مکافاتِ عمل پر یقین محکم رکھنے والی شخصیت کا ردِّ عمل اور خدا
کی بارگاہ میں کی جانے والی التجا _____ 80
جنسیاتی بدنہادی کے اثرات تو قوموں کو مفلوج کر دیتے ہیں _ 81
اقدارِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھنے والی شخصیت کا حسنِ عمل اور
اس کے مقابلے میں عزیز کی بیوی کی غلط بیانی _____ 82
بیوی کی طرف سے جھوٹی ہوس کا سہارا اور سزا دلوانے کی اپیل 82
ہر دو فریقین کے معاملے کو حل کرنے کے لیے ایک تیسرے
فریق کی ضرورت کو پورا کرنے کا طریق _____ 83
پیچھے سے قمیض پھٹنے کے معاملے نے سارا مسئلہ حل کر دیا ___ 84
ندامت کے سلسلہ میں ایک معاشرتی پہلو _____ 84
ہمارے ہاں کی تفسیروں میں عورت کا مقام تو نہایت پست
سطح پہ پیش کیا جاتا ہے _____ 85
باپ کی بیوی ہو تو جنت کی مالک اور اگر اپنی بیوی ہو تو
مکاریوں کا سرچشمہ _____ 85
ہیروارث شاہ کے حوالے سے ہمارے ہاں کی تفسیروں کا معیار 85
مولانا رومی کی مثنوی کو تو فارسی زبان میں قرآن کا درجہ دیا
جاتا ہے' خدا پناہ! _____ 86
مصر جیسے تہذیب وتمدن ماحول کی تصویر کشی _____ 87
شرم وحیا کے پیشِ نظر علامہ پرویز کی زندگی کا ایک اہم ترین
دل خراش واقعہ _____ 87
قوم کے اندر سے جذبۂ غیرت نکال دیجیے تو پوری قوم چلتی
پھرتی لاش کا روپ اختیار کرے گی _____ 88
تقسیمِ ہند کے دوران 20 ہزار بچیوں کا سکھوں کے نرغے
میں لے جانے کے باوجود لاہور میں سکھوں کی ٹیم کے
پھولوں کے ساتھ استقبال پر' پرویزؒ کی آہ وفغاں _____ 88
مغلانی بیگمات پوری طرح سماٹ ہونے کے باوجود' فاتح
بادشاہ پر ہاتھ نہ اٹھا سکیں _____ 89
کوئی قوم خواہ وہ کتنی بھی مہذب کیوں نہ ہو اس کی موت

ہمیشہ غیرت کو خیر باد کہنے سے ہی ہوتی ہے _____ 89
مہذب معاشرے میں طعن وتشنیع کی نوعیت _____ 89
عدالت میں اپنی بدنیتی کا اعتراف _____ 90
زلیخا نے ناکام رہنے کے بعد ایک اور چال چلی جب کہ
اس نے حضرت یوسفؑ کو زبردست قوت ارادہ کا مالک پایا _ 90
لفظ اللہ اکبر اور المتکبر کا واضح مفہوم _____ 90
لفظ قطع ید کا مفہوم اور اس کے استعمال کے مختلف پہرائے ___ 91
عربی محاورے کے مطابق زلیخا کی سہیلیوں نے اپنے ہاتھ
کھانے سے روک لیے تھے اور زخمی کر لیے تھے _____ 92
اختیار، قوت یا استطاعت رکھنے کے باوجود کسی کے
ساتھ انکساری سے پیش آنا ہی حسنِ عمل ہے _____ 93
تمام کوششوں کے باوجود میں اپنے پروگرام کو نظر انداز کرنے
والی نہیں _____ 93
حضرت یوسف u کی خدائے خبیر سے التماس _____ 94
لفظ صبی کا مفہوم اور خدائے علیم وخبیر اور رحیم وکریم سے
توفیق مانگنا اور اس کا ملنا _____ 94
معزز خواتین کا فیصلہ کہ یوسفؑ کو وقتی طور پر جیل میں قید
کر دیا جائے _____ 95

چوتھا باب: **سورۃ یوسف** (آیات 36 تا 52)

حضرت یوسفؑ کے خلاف سیاست فرعونی کی جھلک کے
بنیادی نکات اور قید کے دو ساتھیوں کا ذکر _____ 98
حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والے کی کیفیت ___ 98
خدا کا پیغام پہنچانے والے کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے
نہیں دیتے _____ 99
زندگی کا ایک نفسیاتی پہلو کسی کو اپنی طرف مرکوز کرنا بھی ہے ___ 99
وحی اور خواب کی تعبیر میں فرق _____ 100
خدا کی طرف سے انسان کو ملنے والی صلاحیتوں کو بھی علم
کہا گیا ہے _____ 100
آئندہ دور میں سائیکولوجی کے علم کو بڑی قدر کی نگاہ سے
دیکھا جائے گا _____ 101
دو قیدیوں کے ساتھ حضرت یوسفؑ کا اپنا تعارف _____ 102
عربی لغت کے تحت لفظ آبا کی وضاحت اور ایک اہم مسئلہ
کی نشاندہی یعنی مرے کو مارے شاہ مدار _____ 102
یتیم کو حصہ دلانے پر پرویز کو کفر کا فتویٰ _____ 103
حضرت یوسفؑ کی دو قیدیوں سے تفصیلی گفتگو _____ 103
لفظ توحید جو مقامِ انسانیت ہے ان کی اور شرک کی وضاحت _ 103
کسی انسان کا کائناتی قوتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اگر شرک
ہے تو کسی انسان کے سامنے جھک جانا بہت بڑی ذلت ہے _ 104
حضرت یوسفؑ کا اپنے ساتھیوں سے ایک اہم سوال _____ 105
لفظ معبودیت کا لغوی اور قرآنی مفہوم پرستش نہیں بلکہ
اطاعت کرنے کے ہیں _____ 105
قرآن حکیم کو سمجھنے یا سمجھانے کی سند خود قرآنِ حکیم کی
ہونی چاہیے _____ 106
حکومت کا حق صرف خدا کو ہے جس کا عملی ذریعہ اس کے
احکام ہیں، اس کی کتاب ہے _____ 106
خدا اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا اور یہی اس
کی عبادت ہے اور یہی اس کا امر ہے _____ 107
ہم نے احکامِ خداوندی کی بجائے بادشاہ کو ظل اللہ علی الارض
کہنا شروع کر دیا _____ 108
حضرت یوسفؑ کا دورانِ قید اپنے ساتھیوں کے سامنے
کیا جانے والا وعظ _____ 108
خوابوں کی تعبیر اور فرعون کے زمانے میں پھانسی دینے کے

طریق کا ذکر _____ 108
خواب کی تعبیر ظن کی بنیاد پر ہوتی ہے جب کہ وحی کا ظن سے
کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا _____ 109
ملوکیت کے دور میں وکیلوں کی ضرورت' ایک ضروری
امر ہوتا ہے _____ 109
حضرت یوسفؑ بادشاہ تک اپنی بے گناہی کا پیغام نہ پہنچا سکے
اور پھر کئی برس قید رہے _____ 110
محاوراتی زبان کی حقیقت _____ 110
خوابوں کی تعبیر کا ذکر نیز فالیں نکالنے والوں کی تکنیک کا ذکر _ 111
سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والوں کا اپنا حال اور
ان کے پاس جانے والوں کی سطح ادراک _____ 111
حضرت یوسفؑ کے ساتھ بادشاہ کا خواب رابطے کا
باعث بن گیا _____ 112
حضرت یوسفؑ کے نزدیک بادشاہ کے خواب کی تعبیر اور
اس کا حل _____ 112
پیغمبر اور پیغامبر میں فرق _____ 113
حضرت یوسفؑ کا بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے سے
پہلے ایک باوقار طریق نشاندہی _____ 113
ہمارے ہاں کی غلط روایات نے نبی اکرم ﷺ کے بلند مقام کو
بھی داغ دار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی _____ 114
غلط اور وضعی روایات کے انکار کرنے پر علامہ پرویزؒ اور
مولانا اسلم جیراجپوریؒ کا باآواز بلند اعلانِ عام _____ 115
اپنی سچائی کو معاشرے کی حد تک واضح کرنا نہایت ضروری ہے 115
نبی اکرم ﷺ کی پاک دامنی اور حقانیت کو سامنے لانے کے
سلسلہ میں ایک حدیث کا ذکر _____ 116
بادشاہ کی طرف سے حضرت یوسفؑ کے مقدمے کی
ازسرِنو سماعت کرنے کا حکم _____ 116
حضرت یوسفؑ کی جانب سے نبوت کی بلند ظرفی کی
ایک لاجواب مثال _____ 117
لفظ 'خیانت' کا لغوی اور قرآنی مفہوم _____ 117
پانچواں باب: **سورۃ یوسف** (آیات 53 تا 54)
حضرت یوسفؑ کے خلاف استغاثہ دائر کرنے والوں کی
طرف سے اپنی الزام تراشی' غلطی تسلیم کر لی گئی _____ 119
ہمارے ہاں نفسِ انسانی کے متعلق پایا جانے والا تصور اور
اس کی حقیقت _____ 119
ہمارے ہاں کی تفاسیر پر اسرائیلیات اور عیسائیت کی گہری
چھاپ کے اثرات کی نوعیت _____ 120
ہمارے ہاں نفسِ امارہ کے مروجہ تصور کی نوعیت اور پھر ابلیس
اور شیطان کے عقیدہ کے علاوہ زندگی کے ارتقا کی کہانی ____ 121
انسان کے لیے ارتقائی منزل کے تقاضوں کی اہمیت
حلال وحرام سے متعلق ہے _____ 122
انسانیت کی خاطر حدود کے تعین کا اختیار صرف
خالقِ کائنات کو ہی ہے _____ 123
انسانیت کی غیر متبدل حدود کو توڑنے کا نام سرکشی ہے _____ 123
اختیار وارادہ کے تحت کیا گیا عمل ہی نیکی نیکی ہے
اور بدی بدی ہے _____ 124
جنت کے حصول کے لیے تو یہودیوں کے گھر میں پیدا
ہونا ہی کافی ہے _____ 124
قرآن حکیم نے اپنے اندر قصہ ابلیس وآدم کو ایک
محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے _____ 125
قصہ آدم کو بیان کرنے کا قرآنی انداز _____ 125
خدا کی محکومیت اختیار کرنے والے اپنے سرکش جذبات

(شیطان) کے سامنے کبھی سرنگوں نہیں ہوں گے _____ 126
قدرت نے انسان کے جذبات پر تا قیامت کوئی پابندی
نہیں لگائی اس کا اختیار تو انسان کے پاس ہے _____ 126
ایک حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے شیطان کو
مسلمان کر لیا تھا _____ 127
علامہ پرویزؒ کی سوانح عمری کا ایک ورق _____ 127
ہزار برس سے تصوف پر صوفیا کرام کی طرف سے پیش
کردہ لٹریچر کی نوعیت ترکِ خواہشات پر ہی ہے _____ 128
لفظ اسلام، مسلم، اطاعت قرآن حکیم کے عجیب الفاظ ہیں ___ 128
تصوف کی دنیا میں نفس امارہ کو خواہشات کے نام سے
نفس کشی کی اصطلاح میں استعمال کیا جانے لگا _____ 129
لفظ امارہ کے بعد نفس لوامہ کی اصطلاح کی وضاحت _____ 129
انسانی ذات کی نشو ونما کا تعلق مکمل طور پر مکافاتِ عمل
سے وابستہ ہے _____ 129
ضمیر کی آواز کے متعلق پایا جانے والا تصور بنیادی طور
پر ہی غلط ہے _____ 129
خیر وشر کے امتیاز کو واضح کرنے کے لیے ہی تو انبیائے
اکرام کی بعثت ہوئی تھی _____ 130
دراصل انسانوں کی اکثریت غلط تصورات کے الفاظ
میں الجھی ہوئی ہے _____ 130
انسان کے پاس اختیار وارادے کا ملکہ تو ہوتا ہے البتہ
بکری کی طرح فطرت نہیں ہوتی _____ 131
حضرت انسان کو خارج سے وحی کی نعمت سے نوازا گیا اور
یہی خیر وشر کا معیار ہے نہ کہ عقل انسانی _____ 131
انسانی جذبات کی کیفیت _____ 131
بچپن کے عقائد اور تصورات کی پیدا کردہ تاثیر _____ 132
کچھ بچپن سے گزرے ہوئے لمحات کی یادیں _____ 133
یورپ کی سوسائٹی اور سیاست کے میدان کی بے لگام
جمہوریت کا نتیجہ _____ 134
عقل انسانی، زندگی کے کسی شعبہ کے لیے بھی مستقل اقدار
دے ہی نہیں سکتی _____ 134
Conscious انسان کے اپنے اپنے اندر ہی کی آواز
ہوتی ہے جو بعد میں سوسائٹی کا قانون بن جاتی ہے _____ 134
سوسائٹی کا دوسرا نام عام معاشرے کا ضمیر ہوتا ہے جو ماں
کی آغوش میں پرورش پاتا ہے لہٰذا جیسی ماں ویسا معاشرہ ___ 135
امت کی تشکیل کے لیے ماں کی عظمت نشان راہ بنتی ہے ____ 135
نوخیز بچے کے کان میں باہر کی دنیا سے پہلی آواز اللہ اکبر'
اشہدان محمدُ رسول اللہ' دراصل ضمیر کی ہی تشکیل ہے _____ 135
مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں انسان اپنے کیے گئے عمل پر
پردہ پوشی کے لیے سوسائٹی کے قانون کا سہارا اختیار کرتا ہے _ 136
قوتِ ارادہ کے ہوتے ہوئے نفس امارہ ہو، یا نفسِ لوامہ انسان کے
اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو اسے ہمیشہ برائی کی طرف لے جائے 136
بات ساری انسان کی اپنی تربیت کی ہے جیسی تربیت
ویسا اس کا عمل _____ 137
اطمینانِ قلب سے ہمکنار ہونے کا غیر متبدل اصول
اقدارِ خداوندی کو پیش نظر رکھنے میں ہے اور اسی کا نام تو ذکر ہے 137
تصوف کی دنیا میں اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لیے
تصورِ شیخ کو ہر آن سامنے رکھنا ہوتا ہے _____ 138
ایک مومن کی زندگی کے خدوخال کو سامنے لانے کے لیے
قرآن حکیم حضرت یوسف کی مثال پیش کرتا ہے _____ 138
انسانی زندگی کو Balanced کرنے کے لیے اپنی ہر
خواہش کو خدا کے قانون کے سامنے پیش کرنا ہوگا _____ 138

Balanced Personality کی نعمت سے لطف اندوز
ہونے والی زندگی ہی قابل رشک مطمئنہ زندگی ہوگی _____ 139
مطمئنہ زندگی کا حصول اجتماعی معاشرے کا متقاضی ہوتا ہے _ 139
نفسِ مطمئنہ کی زندگی اجتماعیت کے ماحول سے
لطف اندوز ہوگی _____ 140
نفس مطمئنہ کا دوسرا نام ہی تخت جنت ہے _____ 140
چھٹا باب: **سورۃ یوسف** (آیات 54 تا 65)
تجدید یادداشت _____ 141
حضرت یوسفؑ کے کردار کی بلندی اور ذہانت نے انہیں تخت
نشین بنا دیا _____ 142
حضرت یوسفؑ کے لیے بادشاہ کی طرف سے ایک اعلان عظیم 143
حضرت یوسفؑ نے زمین کے خزانے کا شعبہ اپنے ہاتھ
میں لے لیا _____ 143
حضرت یوسفؑ کا فرعون کی حکومت میں شامل ہونے پر اٹھایا
جانے والا ایک سوال اور اس کا جواب _____ 144
قرآن حکیم تو ہمیشہ انسانیت کے حوالے سے بات کرتا ہے ___ 145
انسانیت کے تصور سے ہٹ کر بات کرنا تو بہت بڑا جرم ہے _ 146
فرعون کے دربار میں ایک مرد مومن کی وہ حق گوئی کہ جسے
قرآن حکیم نے قیامت تک کے لیے اپنے ہاں محفوظ کر لیا ___ 146
حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے چار سو سال پہلے حضرت
یوسفؑ کی طرف سے تخت نشینی کے فرائض کی ادائیگی کا ذکر _ 147
رسول کو تو اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کا احساس تو
بدرجہ اتم ہوتا ہے _____ 148
وحی کی روشنی میں حضرت یوسفؑ کے نزدیک قحط سالی کو ختم
کرنے کا علاج زمین کو ذاتی ملکیت کے چنگل سے نکالنا تھا _ 148
مملکتِ پاکستان میں ایک ایک زمیندار تو دس دس ہزار ایکٹر
کا مالک بنا بیٹھا ہے _____ 149
اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کی معاشی بدحالی کا علاج ایک
واحد سٹیٹ پراپرٹی بنانے میں نہیں بلکہ اسے سٹیٹ کے
انتظام میں لانے میں ہے _____ 149
تورات، بائبل، اور تحقیق کی تاریخی حیثیت _____ 150
مصر اور کنعان کی معاشی تباہی کے حل کے سلسلہ میں حضرت یوسفؑ
کی طرف سے طبقات کا خاتمہ اور زمین کی آبادکاری کا پروگرام 151
فرعون اور اس کے لشکر کے سامان کی اجارہ داری کا ذکر ____ 152
حضرت یوسفؑ کی نگاہ بصیرت سے مصر آج تک مستفید
ہو رہا ہے _____ 152
وحی کی راہنمائی کے باوجود ہماری کوتاہ نظری کی کیفیت
اور پھر اس آیت کا حقیقی مفہوم _____ 153
قرآنِ حکیم کے نزدیک حقوق طلبی کو ذمہ داری کے ساتھ
مشروط کیا گیا ہے _____ 154
وحی اپنے ہاں ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے خدوخال
واضح طور پر متعین کرتی ہے _____ 154
تھیوکریسی یا مذہبی پیشوائیت جو اپنے اختیارات کو ہمیشہ
خدا کا حکم کہہ کر منواتی ہے _____ 154
Divine Rights کی بنیاد پر تشکیل پانے والے
معاشرے میں انسانی حقوق متعین ہوتے ہیں _____ 155
قرآنِ حکیم اپنے ہاں اجر اور مستاجر کی بجائے ہر شخص کے
لیے عامل کا لفظ استعمال کرتا ہے نہ کہ کمّی کا _____ 155
مزدوری کرنے والوں کے لیے مزدوری کے تعین کا مسئلہ
ایک بڑا غور طلب معاملہ ہے _____ 156
قرآنِ حکیم کے ہاں WAGE کے مسئلہ کا دوٹوک
اور واضح حل موجود ہے _____ 157

مملکت اسلامیہ کا ہر فرد ایک مجاہد کی حیثیت سے اپنی ڈیوٹی
سرانجام دے گا اور مملکت اس کی اور تمام اہل خانہ کی ہر قسم کی
ضرورت کو پورا کرے۔ _____ 157
عملی زندگی میں پہلے پانی پیو گے تو تب ہی پیاس بجھے گی' بالفاظ
دیگر حق طلبی ہمیشہ ذمہ داری کے ساتھ مشروط ہوتی ہے _____ 158
قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان رکھنے والوں کے لیے جہاں فردا
کی رنگینیاں بدرجہ اتم' خوبصورت اور دل فریب ہوں گی ____ 158
قحط کی بنا پر غلہ کے حصول کے دوران حضرت یوسفؑ کا
اپنے بھائیوں کے ساتھ آمنا سامنا _____ 159
جہیز کی وہ لعنت کہ جس نے گھر میں بیٹھی بیٹیوں کی زندگی کو
خاموش قبروں میں بدل دیا ہے' کے لیے مہر کی ادائیگی کی نوعیت 160
شادی کے موقعہ پر نبی اکرم ﷺ کی طرف سے حضرت
فاطمہ الکبریٰ کو دیا گیا سامان ایک چمٹا اور ایک چکی _____ 161
حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی طرف سے اپنے دوسرے سوتیلے
بھائی بنامین کے ساتھ کیا جانے والے سلوک کی داستانِ غم ___ 161
غلہ دینے کے سلسلہ میں حضرت یوسفؑ نے اپنے دوسرے
بھائی یامین کو ساتھ لانے کی شرط سے مشروط کر دیا _____ 162
باپ کے مقابلے میں شریکانہ حربے کا پروگرام _____ 162
غلے کے لالچ کی خاطر چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جانے
کے لیے حضرت یعقوبؑ کے ساتھ ان کی گفتگو کا انداز اور
پھر آپ کی قوت ایمانی _____ 163
قرآن حکیم کا تو انداز بیان اگر بے مثل ہے تو اس کا انداز
ترتیب بھی لاجواب ہے _____ 164
ساتواں باب: **سورۃ یوسف** (آیات 66 تا 82)
حضرت یعقوبؑ کی کشادہ ظرفی اور بلند نگہی _____ 166
شہر کے اندر داخل ہونے کے لیے باپ کی طرف سے
ایک ضروری ہدایت _____ 167
آنے والے واقعات کے متعلق غیب کا علم صرف
ذاتِ خداوندی کو ہے _____ 168
انسانی علم ہمیشہ قانون خداوندی کے سہارے کا محتاج رہے گا _ 168
غیب کے علم کا دعویٰ نبوت کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے ___ 169
وحی کے علم اور انسانی فراست میں بنیادی فرق ہے _____ 170
کسی چیز پر توکل کرنے سے پہلے قانون خداوندی کا علم
ہونا ضروری ہے _____ 170
وحی خداوندی کسی خلش کو دل و دماغ میں باقی رہنے
ہی نہیں دیتی _____ 171
تعلیمات قرآنی کے دوران جن باتوں کو خدا اپنی طرف
منسوب کرتا ہے' اس سے مراد خدا کا قانون ہوتا ہے _____ 171
دلوں پر مہر لگا دینے والی آیات کو صحیح طور پر سمجھنا ہوگا'
یہ بڑا غور طلب معاملہ ہے _____ 172
جہنم میں جانے والوں کی صورت حال اور اس کی وجہ جواز ___ 173
علامہ پرویزؒ کی کتاب ''کتاب التقدیر'' ان حقائق کو سمجھنے
کے لیے ایک بین کتاب ہے _____ 173
حضرت یعقوب نے اپنی بصیریت کے تابع بیٹوں کو ایک
تدبیر بتائی تھی _____ 173
حضرت یوسف کا اپنے بھائی کو اپنے پاس بلانے کا قصہ
اور دوسرے بھائیوں کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار _____ 173
شاہی کٹورے کی گمشدگی کے بارے ہمارے ہاں ہزار سال
سے بیان کیے جانے والے اس قصے کی نوعیت _____ 174
کس قدر افسوس ہے یہ کہ ہم نے نبیوں کی سیرت و کردار کو بھی
عام انسانی سوچ کے ترازو میں تول رکھا ہے _____ 175
سوائے اس کے کہ اس پر ہم ہزار بار معاذ اللہ معاذ اللہ کہیں

اور کیا کہا جائے _____ 175
سوال یہ ہے کہ آخر ہزار برس سے ہم نے اس قسم کی غلط
سوچ کو کیوں اپنا رکھا ہے _____ 177
یہاں تو نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس کے متعلق بھی ایک غلط روایت
کو سچ سمجھ کر جھوٹ بولنے کی کھلی چھٹی ہی نہیں بلکہ یہ واجب بھی ہے 177
کعب بن اشرف کے قتل کے متعلق روایت پر پرویزؒ کا تبصرہ _ 177
شاہی کٹورے کی تلاش' بھائیوں کی سرشدت وسیرت' چوری کا
سراغ اور سزا کے تعین کا معاملہ _____ 178
کٹورے کی تلاش کے بعد ملکی قانون کے تحت سزا کا تعین
اور قرآن حکیم کی راہنمائی _____ 180
مملکت پاکستان کی بنیاد کا مقصد مذہب کی بجائے دین
کا فروغ تھا _____ 180
اپنی عقل کو حرفِ آخر قرار نہ دے تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا ہے 182
حضرت یوسف کا بچپن اور چوری کرنے کے ثبوت کی کہانی ___ 182
بوڑھے باپ کا سہارا لیتے ہوئے بنیامین کو ساتھ لے
جانے کی اپیل _____ 184
لفظ معاذ اللہ کا مفہوم خدا کے قانون کی پناہ میں آنا _____ 184
کٹورے کی چوری کا قصہ بھائیوں کی چابکدستی باپ کے لیے ذہنی
طور پر ناقابلِ برداشت اذیت ناکی اور حضرت یوسف کی دل گرفتگی 185
آٹھواں باب: **سورۃ یوسف** (آیات 83 تا 93)
حضرت یوسفؑ کی داستانِ جلیلہ مصر سے واپسی پر غم زدہ باپ
کے ساتھ بنیامین کے متعلق بیٹوں کی غلط بیانی اور پھر
حضرت یعقوبؑ کے تاثرات _____ 187
بنیامین پر چوری کا الزام بالکل غلط معلوم ہوتا ہے دل
بیدار باپ کے تاثرات _____ 188
دنیا کے معاملات سے لاتعلق ہو جانا رہبانیت ہے _____ 189
Indifferent رہبانیت سے تصوف اور تصوف سے
مقرب ترین بارگاہ خداوندی تک کا سفر طے کرنے کے نتائج _ 189
کسی چیز کے اچھے یا برے اخلاقی یا بداخلاقی پہلوؤں کو محسوس تک
بھی نہ کرنا انسانی صلاحیتوں کے لیے موت کا باعث ہے ___ 190
فریب نفس کی کیفیت کا نتیجہ _____ 190
انسانی نفسیات کی تیسری کیفیت کہ جب کوئی شے نہ اچھی
لگے اور نہ کوئی بُری تو اس کا نتیجہ قوموں کی موت ہوتا ہے ___ 191
بنیامین کی خبر کے بعد زندہ دل باپ کی کیفیت آپ کے
تاثرات اور شفقت پدری کا اظہار _____ 191
بیٹوں کی یاد میں حضرت یعقوبؑ کی یاد پر ہمارے ہاں کے
مفسرین کا اظہار اور قرآن حکیم کے الفاظ کا مفہوم _____ 192
نبی اکرم ﷺ کے بیٹے کی وفات کے موقعہ پر ان کی
آنکھوں میں آنسو _____ 193
انسانی جذبات کی اہمیت قرآن حکیم کی روشنی میں _____ 193
اندر من کا چور ہو تو ہمدردی کے جذبات پھر پیدا ہی نہیں ہوتے 194
اس قدر غم والم کے باوجود صبرِ جمیل کے پیکر کی طرف سے
اظہار خیال کا بصیرت افروز انداز _____ 195
نبی تو زندگی کے ہر شعبہ میں عظمت کردار کا مالک ہوتا ہے ___ 195
اعلم من اللہ مالاتعلمون کے مفہوم کے متعلق ہمارے مفسرین
کی غلط نگہی کی نشاندہی _____ 196
اپنے بیٹوں کے متعلق حضرت یعقوب کا یہ کہنا کہ تم نہیں جانتے
جب کہ میں جانتا ہوں دیکھیے اس کی وضاحت _____ 197
اگر انسان کے لیے یاد رکھنے کا جذبہ ختم ہی ہو جائے تو پھر تو
ہر قسم کی تگ وتاز ہی ختم ہو جاتی ہے _____ 197
باپ کی طرف سے لڑکوں کو اس مشکل سے نکلنے کے لیے
تلاش کرنے کی تلقین _____ 198

انسان کی ناکامی کی بنیادی وجہ مایوسی ہے اس سلسلہ میں لفظ
یاس اور قنوط میں فرق قابل غور ہے _____ 199
لفظ ''رُوح' رَوح اور ریح کا لغوی مفہوم اور پھر
حضرت یعقوبؑ کی اپنے بیٹوں سے گم شدہ لڑکوں کی
تلاش کے متعلق حرکت کرنے کی تاکید _____ 199
ساکن اور متحرک ہوا میں فرق وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں
جو قوانین خداوندی سے آگاہی حاصل کریں _____ 200
قرآن حکیم نے تو طبعی قوانین سے انکار کرنے والوں یا
انہیں چھپا کر رکھنے والوں کو بھی کافر کہا ہے _____ 200
آخر کار حضرت یعقوبؑ کی طرف سے سال ہا سال کے
صبر و استقامت کے عمل نے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں
کے دلوں میں حرکت و لجاجت پیدا کر ہی دی _____ 201
قرآن حکیم کے مرادفات میں سے الفاظ کے انتخاب پر
علامہ پرویزؒ کی قلبی کیفیت _____ 201
حضرت یوسفؑ کی طرف سے پورا غلہ دینے کے اظہار پر
بنیامین کے متعلق ایک سوال _____ 202
یہ مقام نبوت یہ ہے کہ وہ کسی کو شرم شار کرنا نہیں چاہتی _____ 203
برادران حضرت یوسف پر حقیقت کا انکشاف حیران کن تھا ___ 203
خدا کا فضل و کرم انسان کے اپنے اعمالِ حسنہ اور کردار
کے ساتھ مشروط ہوتا ہے جسے تقویٰ کہا گیا ہے _____ 204
داستانِ حضرت یوسف تو اپنے اندر انسانی زندگی کے
بے شمار پہلو لیے ہوئے ہے _____ 204
جسم خاکی میں نقش حسن و جمال سے آراستہ بااصول زندگی
کی رعنائیوں کی یہ چمک ہم سب کے لیے قابل رشک ہے ___ 205
قرآن حکیم میں دیئے گئے مرادفات کی اہمیت اور انفرادیت _ 205
اثباتِ جرم کے بعد لفظ تثریب ایک قابل غور عمل ہے _____ 206
لفظ لاتثریب کا لغوی قرآنی مفہوم کہ کسی کے جرم کو بار بار
نہیں دہرانہ چاہیے _____ 207
فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں کے متعلق
نبی اکرم ﷺ کی کشادہ ظرفی لیکن ہمارا رویہ _____ 207
نبی اکرم ﷺ کی طرف سے سنت رسول پر عمل کرنے کی تلقین _ 208
ایک انسان دوسرے انسان کو تو معاف کر دیتا ہے لیکن
جرم جو انسان اپنے ساتھ خود کرے اسے کون معاف کرے گا؟ 208
اقدارِ خداوندی سے روگردانی کرنے پر انسانی ذات جو
متاثر ہوئی ہے اس کا علاج کرنا ہوگا _____ 209
برداران یوسفؑ کی واپسی اور اپنے والد سے ملاقات
اور حضرت یوسف کی طرف سے نشان کے طور پر ایک
منصبی کرتے کی فراہمی کا ذکر _____ 209
اس منصبی کُرتے کے متعلق ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات ___ 210
عقل انسانی کے لیے قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ تم قرآنی
آیات پر اندھے اور بہرے بن کر نہ گر پڑا کرو _____ 210
نواں باب: **سورۃ یوسف** (آیات 94 تا 101)
قرآن حکیم میں بیان کردہ واقعات کا ذکر انسانی زندگی
کے لیے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے _____ 212
قدم قدم پر حضرت یوسفؑ کی سیرت انسان کے لیے
مشعل راہ ہے _____ 213
حضرت یوسفؑ کا بھائیوں کی گھر واپسی پر والد محترم کی خدمت
میں اپنی قمیض ارسال کرنے کا مقصد _____ 213
مذکورہ قمیض کے بارے ہمارے ہاں کی تفسیروں میں بیان
کردہ قصے اور پھر قرآن حکیم کی روشنی میں اس کی وضاحت ___ 214
حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ کی خوشبو کا محسوس کرنا ____ 214
لفظ ریح کا مفہوم غلبہ، قوت اور منصب بھی ہوتے ہیں _____ 215

عزیزِ مصر (حضرت یوسف) کی نیک نامی اور کردار کی بلندی کی خوشبو تو یقیناً پھیل چکی تھی ____ 215
خدا تعالیٰ نے اکثر مقامات پر انسانی صلاحیتوں کو اپنی طرف منسوب کیا ہے ____ 216
غور و فکر کرنے سے عقل انسانی کی رفعت پرواز میں مزید تیزی آتی ہے ____ 217
پختہ شعوری کی صفات سے مالا مال شخصیت کا آئینہ ادراک بڑا روشن ہوتا ہے ____ 217
پیغمبر کی حس بڑی لطیف اور بیدار صفات کی حامل ہوتی ہے ____ 218
حضرت یوسفؑ کی گمشدگی کے باعث والد کی داستانِ غم اور ہمارے ہاں کے مفسرین کی سوچ کا جائزہ ____ 218
وحی کی روشنی تو انسانی ذہن میں کسی قسم کا خوف و حزن باقی رہنے ہی نہیں دیتی ____ 219
حضرت یوسف کا کُرتا وصول کرنے کے بعد حضرت یعقوب کے تاثرات ____ 219
یہ بات قابل غور ہے کہ رسول کو ذاتِ خداوندی قدم قدم ہر بات کے متعلق وحی کے ذریعے آگاہ نہیں کرتی تھی ____ 220
نبوت ملنے کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ کی زندگی ایک عظیم شہادت ہے ____ 220
نبوت کے انتخاب کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کا ایک اپنا معیار ہے 221
مکہ کے رہنے والے لوگوں کے مقابلے میں مدینے والے مشرین کی طرف سے مخالفت کہیں زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک تھی 221
نبی اکرم کے اسوۂ حسنہ کا ایک ایک پہلو جو پوری نوع انسانی کے لیے مشعلِ راہ ہے ____ 222
وحی کے مقام کے علاوہ اسلامی مملکت میں مرکزِ ملت کی حدود اور اس کی ذمہ داریوں کی نشاندہی ____ 223
زندگی میں گزرنے والے یا ہونے والے واقعات کی کڑیوں سے حقیقت کا اندازہ کرنا انسان کی بصیرت پر موقوف ہے ____ 223
طویل سفر کے بعد حضرت یعقوبؑ کے لیے خوشخبری یہ ایک عظیم نعمت سے کم نہ تھی اس سلسلہ میں دیکھیے اَلْقٰہُ عَلٰی وَجْھِہٖ کا مفہوم ____ 224
قرآن حکیم کے مفہوم کو سمجھنے کا طریق تصریفِ آیات بھی ہے 224
قرآن حکیم کے باطنی معنی حاصل کرنے کا تصور قرآنی تعلیم کے قطعی خلاف ہے ____ 224
قرآن حکیم کے متعلق یہ کہنا کہ یہ عربی مبین میں نازل ہوا اس کی ایک خاص وجہ ہے ____ 225
قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے علامہ پرویزؒ کی طرف سے لغات القرآن کو پیش کرنے کی سعادت کا ذکر ____ 225
تصریفِ آیات اور محاورہ عرب کو پیش نظر رکھے بغیر قرآن حکیم کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا ____ 226
قصہ آدم کی ساری کہانی آدم کے اعترافِ جرم اور انسان کے اپنے سرکش جذبات کی سرکشی کے گرد ہی گومتی ہے ____ 226
اپنی غلطی کا برملا اعتراف اور پھر اصلاح کی پوری پوری کوشش یہی تو ہے مرضِ کہن کا چارا ____ 227
لفظ استغفار کا لغوی مفہوم اور پھر برادران یوسف کا اپنے والد حضرت یعقوب سے ایک اہم سوال اور اس کا واضح تر دوٹوک جواب ____ 227
قرآنِ حکیم کی بارگاہ میں جرم اور سزا کا فلسفہ بڑا غور طلب ہے اور صرف اسی کے تحت انسان کی بردمندی ہو سکتی ہے ____ 228
خدا تعالیٰ کی صفات رحیم اور کریم کی عملی شکل اور اس کا محسوس نتیجہ ____ 228
قرآنِ حکیم کے الفاظ اس قدر پُر معنیٰ، وسیع و بلیغ ہیں کہ ان کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا ____ 229

علامہ پرویزؒ نے قرآن حکیم کا ترجمہ نہیں بلکہ اپنی اسطاعت
کے مطابق مفہوم بیان کیا ہے _____ 229
جلال الدین کی تفسیر میں بھی وحی زبان کے مرادفات کی
جگہ عربی میں مرادفات نہیں ملتے _____ 230
نیٹشے جوخود کوزرتشت کہلاتا تھا وہ بھی قرآن حکیم کی زبان
کووحی کی زبان کہنے پر مجبور ہوگیا تھا _____ 230
ذاتِ خداوندی نے قرآن حکیم لکھنے کے بعد اپنا قلم ہی توڑ دیا_ 230
حضرت یوسفؑ کی طرف سے اپنے تمام افراد کو اپنے پاس
بلا لینے کی دعوت _____ 231
ہمارے ہاں برادران حضرت یوسفؑ کی طرف سے
حضرت یوسفؑ کی تعظیم کو سجدۂ تعظیمی کی سند میں بدل دیا
جو کہ تذلیل انسانیت ہے _____ 231
کس کو اس کے مقام سے بڑھا چڑھا کر پیش کرنا غلو ہے ___ 232
اس منظر کشی کے پیش نظر حضرت یوسفؑ نے کہا کہ یہ تو
میرے اس خواب کی ہی تعبیر معلوم ہوتی ہے _____ 232
قید و بند کی اذیت ناکیاں آپ کا سیرت کردار، بادشاہ کی طرف
سے رہائی کا حکم نامہ لیکن آپ کی پروقار شخصیت کا انکار اور
پھر خدا نے رحیم کا احسان عظیم اور تخت نشینی کے دل کش مناظر_ 233
عزت و وقار کے ساتھ قید سے رہائی پر فرشتوں کی طرف
سے گل فشانی کا منظر قید بھی باوقار اور اگر.....آزادی ہے
تو وہ بھی باوقار _____ 233
خدا تعالیٰ کی صفت علیم اور حکیم کے سامنے عقلِ انسانی
سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے _____ 234
پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ کی اہمیت _____ 236
قرآن حکیم میں بیان کردہ داستانوں کے متعلق
نبی اکرم ﷺ کی ذات پہلے واقف نہ تھی _____ 237

دسواں باب: **سورة یوسف** (آیات 102 تا 106)
تورات اور انجیل میں بیان کردہ تاریخی واقعات کی
نوعیت قرآن حکیم کے بیان سے مماثلت نہیں رکھتی _____ 237
علم غیب کی اور پیشین گوئی کی نوعیت اور انسان کی اپنی شخصیت 238
عملی دنیا میں اختیار و ارادہ رکھنے والی مخلوق کا کردار اور اس کا نتیجہ 239
حسابی قاعدے سے ہٹ کر کل کو کیا ہوگا کا دعویٰ کرنے والا
شخص وحی ملنے کا دعویٰ کرتا ہے _____ 239
قیاس کو علم و یقین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا _____ 240
رسول کو بھی غیب کا علم خدا کی طرف سے ہی ملتا ہے۔ غیب کا علم جاننے
کے لیے وحی کے علاوہ کوئی حتمی ذریعۂ علم انسان کے پاس نہیں 240
رسولوں کے بعد آج علم غیب کا دعویٰ کرنا دراصل خدا کو چیلنج
کرنے کے مترادف ہے _____ 241
حضرت یوسف کے متعلق یہ تمام واقعات وحی کے ذریعے
ہی بیان کیے گئے تھے _____ 241
لفظ حرص کا لغوی قرآنی مفہوم کسی کی منفعت کے لیے،
شدتِ آرزو کے ہیں _____ 241
فریضہ نبوت دوسروں کو حقائق سے آگاہ کرنا ہے زبردستی
کسی کو اس پر چلانا نہیں ہے _____ 242
ہمارے ہاں چار لفظ پڑھ لینے والوں کی حالت کفر کا فتویٰ
اور پھر قتلِ مرتد کی سزا _____ 242
اسلام قبول کرنے کے سلسلہ میں خاندان نبوت کا ذکر _____ 243
ایمان لانے کے لیے عقل و فکر کو بروئے کار لانا ضروری ہے _ 243
نبی اکرم ﷺ کے ماننے والوں کے لیے قوم کی بجائے
امت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے آخر کیوں؟ _____ 244
کسی کے مخلص ہونے کی دلیل کہ اس میں اپنا لالچ یا
مفاد پوشیدہ نہ ہو _____ 244

خدا کی طرف سے ہر آنے والا رسول یا نبی نہ تو ذاتی لالچ
کا متمنی ہوتا ہے اور نہ ہی ناامیدی کا شکار _____ 245
خدا کا پیغام ذکر للعالمین کی صفات کا حامل ہوتا ہے نہ کہ کسی
خاص قوم یا خاص دور کے لیے بلکہ یہ تو للناس کے لیے ہے ___ 245
قرآن حکیم انسان کی توجہ اس محسوس کائنات کے محیر العقول
سلسلہ کے نظم وضبط کی طرف دلاتا ہے _____ 246
خدا تعالیٰ نے کائنات کے ذرے ذرے کے لیے کائناتی
قوانین بنا رکھے ہیں (یعنی ان کی طرف وحی کر رکھی ہے) ___ 247
کائنات کی اکائی پر غور وفکر کرنے والوں سے ایک سوال
اور اس کا جواب _____ 247
علم الافلاک کے ماہر جیمز جینز کا کائنات کے متعلق بیان ____ 248
ایک ایک پتے کی رگ میں جو Naked Eye سے اوجھل
ہیں، دنیا اس کے اندر رقصاں ہیں _____ 248
مذہب کی دنیا کے بعد اہل تصوف کے ہاں کائنات کے
متعلق پایا جانے والا تصور _____ 248
ہمارے ہاں تسخیر کائنات کو مادہ پرستی اور سرسید کو نیچری کہہ
کر کافر کہنے کی کوشش _____ 248
قرآن حکیم تو نیچر پر ہر ہر قدم پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے ___ 249
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ اصطلاحات کا مفہوم
بدل دینے سے قرآن حکیم کی پوری کی پوری تعلیم ہی نظروں
سے اوجھل ہوگئی _____ 249
قرآن حکیم نے اپنے ہاں مومن کی جو بنیادی تعریف متعین
کی ہے انسانیت کے لیے وہی ایک آخری سہارا ہے _____ 250
قرآن حکیم کی اس قدر واضح اور بیّن آیات کے باوجود
انکار کرنے والوں کا کیا علاج _____ 251
قرآن حکیم کے نزدیک تو متقی وہ ہے جو کائنات کی ان
بکھری آیات پر صبح وشام غور وفکر کرے _____ 251
دنیا بھر کے مذاہب میں کائنات کو نفرت کی نگاہ سے ہی
دیکھا جاتا ہے _____ 252
انسانی افکار کی بنیاد پر دین خداوندی کو مذہب میں بدل
دینے کا نتیجہ _____ 252
تسخیر کائنات کے فریضہ کو نظر انداز کرنے والا انسان خواہ کوئی
بھی ہو وہ دوسروں کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے _____ 252
زمین وآسمان پر مختلف قسم کی پیدا کردہ نعمتوں کا تذکرہ اور
پھر اُن پر غور وفکر کرنے کی دعوت _____ 253
کائنات پر غور کیے بغیر خدا تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت کا
اندازہ ہو ہی نہیں سکتا _____ 254
اجرامِ فلکی کی رفتار میں ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے کا فرق
بھی کائنات کو تباہ کر سکتا ہے _____ 254
سقف محفوظ کے اوپر گردش کی تیز رفتاری کا وہ عمل جو
انسان زندگی کی حفاظت کا ضامن ہے _____ 255
مومن ہونے کے باوجود مشرک ہونے کا کردار _____ 255
ہمارے ہاں کا وہ مروجہ اسلام تو سراپا صدیوں سے
سیکولرازم کا لباس زیب تن کیے ہوئے ہے اور پاکستان کی
تاریخ اس پر گواہ ہے _____ 256
یوم آزادی پر علامہ پرویزؒ کا خصوصی خطاب _____ 256
سیکولر گورنمنٹ کے لوازمات اور بنگلہ دیش کا پہلے روز کا اعلان 256
سیکولرازم کے اندر زندگی کا وہ پہلو جس پر قانون مکافات
عمل پر یقین نہیں ہوتا _____ 257
شرک اور توحید کی بنیادی خصوصیات _____ 258
قرآن حکیم کی روشنی میں شرک کی واضح تر شکل یہ ہے کہ
انسان اپنے سرکش جذبات کو بھی اپنا ہم سفر بناتا ہے _____ 259

علامہ پرویز کے ہاں درس کی اہمیت _____ 259
گیارہواں باب: **سورۃ یوسف** (آیات 107 تا اختتام)
تجدید یادداشت _____ 261
سیکولرنظام کی تعریف (۱) عقائد' عبادات' شخصی قوانین'
شریعت حقا کے تحت اور ملکی قوانین زندگی کے ضوابط
جمہوری طریقے سے _____ 262
شریعت کے علمبرداروں کا کردار بڑا حیران کن ہوتا ہے ____ 262
توحید کی بجائے آج مسلمان حکومتوں نے تو اعلانیہ طور پر
سیکولرنظام کو اپنا رکھا ہے _____ 263
خدا کی کتاب کے ایک حصے کو ماننا اور دوسرے حصے سے
انکار کرنا یہی تو شرک ہے _____ 263
غلط نظام زندگی کے تباہ کن نتائج غیر محسوس طور پر اثر انداز
ہوتے ہیں _____ 263
مذہبی دنیا میں پائے جانے تصورات ہمیشہ فوق الفطرت
چیزوں پر ہوتے ہیں _____ 264
ہر رسول کی دعوت تو شروع سے لے کر آخر تک علی
وجہ بصیرت ہوتی ہے اور یہی سنت رسول ہے _____ 265
معتزلہ یعنی عقل سے کام لینے والے جن کے خون سے
بغداد کی گلیاں رنگین ہو گئیں تھیں _____ 266
شرک سے ماوراعقل وفکر کی بنا پر توحید پر مبنی دعوت الٰہی
جس میں نہ کوئی مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی نہ کوئی شعبدہ بازی
اور نہ کوئی معجزہ _____ 266
رسول کی دعوت تو بغیر کسی مزد ومعاوضہ کے عالم گیر سطح
پر ہوتی ہے _____ 267
اس کائنات کا ذرہ ذرہ جو ایک اکائی کی حیثیت سے قانون واحد
کے تحت سرگرم عمل ہے' انسان کو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے ____ 267
Cause & Effect کی بنیاد پر آج کے سائنسی
انکشافات اور قرآن حکیم کی وضاحت _____ 268
قرآن حکیم کے نزدیک حقائق تک پہنچنے کے لیے تاریخی
شہادتوں کی اہمیت _____ 268
اُمت مسلمہ کے ہاں مروجہ اسلام نے مسلمانوں کو اجتماعی
طور پر ذلیل وخوار کر دیا ہے _____ 268
1958ء میں پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی ممالک کے جید
علمائے کرام کے اجتماع میں علامہ پرویزؒ کی شرکت _____ 269
لفظ عاقبۃ کا لغوی' قرآنی مفہوم وہ نتیجہ وہ ذنب ہے جو
جانور کی دم کے ساتھ پیچھے چمٹی رہتی ہے _____ 270
زندگی کے دوران Future یعنی مستقبل اور حال کی
قدر و قیمت کو پیش نظر رکھنا بڑا اہم ہے _____ 270
وقت کی قدر ومنزلت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا
فرمان اور ہماری پس ماندگی کی وجہ جواز _____ 271
فیوچر کی قدر ومنزلت کو سمجھنے والی قوموں کا تابناک حال ____ 271
زندگی کے بعد آنے والے دور یعنی جہاں فردا کی زندگی
کے خدوخال کا ادراک یہاں نہیں کیا جا سکتا _____ 272
رسول کا کام صرف پیغام پہنچانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے
مطابق ایک معاشرے کی تشکیل کرنا بھی ہوتا ہے _____ 272
خدا کے نبی کو جماعت کی تشکیل کے لیے گروہ کے اندر سے
بہترین انسانوں کا چناؤ کرنا ہوتا ہے _____ 273
خدا کا نبی تو کسی شکل میں مایوس نہیں ہوتا لیکن ہمارے ہاں
کی تفسیریں تو اور ہی کچھ کہتیں ہیں (معاذ اللہ) _____ 273
اختلاف قرأت کے سلسلہ میں کی گئی سازش نے تو پوری
قرآنی تعلیم کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے _____ 274
کیا قرآن حکیم حضرت عثمان نے جمع کیا تھا؟ یا

نبی اکرم ﷺ نے _____ 274
قراءت میں اختلافت پر ایک دل خراش کہانی کی تفصیل ____ 274
آج بھی ہمارے ہاں قرآن حکیم کی تفسیروں کی
یہی صورت ہے _____ 275
پاؤں کے مسح کرنے اور پاؤں کے دھونے کا عمل یہ دونوں قراءتیں
مستند ہیں اور متواتر چلی آ رہی ہیں (سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا فتویٰ) _ 276
قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی
اختلافی بات نہیں _____ 277
سوال یہ ہے کہ اگر ایک پہلی شکل معقول ہے تو پھر
دوسری کیا ہے؟ _____ 277
خدا تعالیٰ کی یہ نازل کردہ کتاب تو یقینی طور پر ہر قسم کے تضاد سے
پاک اور غیر متبدل عالم گیر اصولوں پر مبنی ہے _____ 278
قرآن حکیم کے کسی ایک لفظ کی تبدیلی سے پوری عمارت
زمین بوس ہو جاتی ہے _____ 278
قراءتوں کی کتاب المصاحف پر تھامس جعفری کا تبصرہ ____ 278
اس قسم کی عجمی سازشوں نے تو مسلمانوں کی قرآنی تعلیم
کے روشن چہرے کو داغ دار کر دیا ہے _____ 279
ہمارے ہاں تو یہ عقیدہ بھی ہے کہ اس کی پانچ سو آیات
منسوخ ہو چکی ہیں _____ 279
ان پانچ سو منسوخ آیات کے متعلق شاہ ولی اللہ کا ردِ عمل
اور پھر مولانا سندھی کا مومنانہ کردار _____ 279
قرآنی آیات تو منسوخ ہیں لیکن ان کے پڑھنے سے
دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے یا اللہ خیر! _____ 280
قرآن حکیم میں آیات تو نہیں ہیں لیکن حکم ان کے
مطابق ہو رہا ہے _____ 280
قرآن حکیم کو جمع کرنے کے سلسلہ میں پیدا ہونے
والی مشکلات کا تذکرہ _____ 280
آخری حج کے موقعہ پر ایک لاکھ صحابہ کی موجودگی ہے لیکن آیات
کی گواہی کے لیے دوسری طرف دو شہادتوں کی تلاش ہے ___ 281
دو قرآنی آیات بکری کھا گئی اور اور ارشاد خداوندی یہ ہے
کہ ہم نے اسے مکمل کر دیا _____ 282
رسول ﷺ کے مایوس ہونے کا تصور کہاں تک صحیح ہے؟
آپ ﷺ کس معاملے میں مایوس ہوئے اور آخر آپ ﷺ کو
ہجرت کیوں کرنا پڑی _____ 283
عقل کا اگلا درجہ الباب یعنی جو آیاتِ قرآنی کے حقائق تک
پہنچنے کا ایک ذریعہ ہیں _____ 284
لفظ تصدیق یعنی کسی بات کو سچ کر دیکھانا کہ اس کا کیا معیار ہے 285
انسانوں کے ہاتھ سے حاصل کردہ روٹی کو عزت کے ترازو
میں نہیں تولنا چاہیے _____ 285
عربی کے الفاظ کو اردو کے الفاظ میں نہیں سمویا جا سکتا _____ 286

پہلا باب: **سورۃ یوسف** (آیات 1 تا 14)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1974ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یوسف سے ہو رہا ہے جو 12 ویں سورۃ ہے۔

سورۃ یوسف شخصی کریکٹر اور سیرت کی مضبوطی کی داستان اپنے اندر لے ہوئے ہے

اس سے پہلے سورۃ ھود گذر چکی ہے اس میں بھی آپ نے دیکھا ہوگا اور قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں بھی بالعموم صورت یہ نظر آتی ہے کہ ایک قوم' ایک معاشرہ' ایک نظام خراب ہوتا ہے اس کی خرابیاں انتہا تک پہنچ رہی ہوتی ہیں تو اس میں ایک آسمانی انقلاب برپا جو ایک رسول کرتا ہے' وہ اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے' اس کی مخالفت ہوتی ہے' مخالفین سے تصامات ہوتے ہیں' وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے یہ رسول اور اس کے ساتھی اس تباہی سے محفوظ رہتے ہیں۔ گویا یہ جتنی داستانیں بیان ہوئیں وہ اجتماعی انداز کی تھیں' وہ غلط نظام کے

علمبرداروں کے ساتھ تصادم تھا۔ گویا ایک نظام کی جنگ دوسرے نظام کے ساتھ تھی لیکن اس کے فوری بعد یہ سورۃ یوسف جو آتی ہے اس کا انداز ان سے بالکل منفرد ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک فرد کا اپنا ذاتی، شخصی کریکٹر وہ کیا نتائج پیدا کرتا ہے۔

یورپ میں جنسی بدنہادی کے مہلک اثرات کے نتائج

قرآنِ کریم میں چند ایک شخصیتیں ایسی ہیں جن کا انفرادی طور پر قرآنِ کریم نے ذکر کیا ہے ان میں سرِ فہرست حضرتِ یوسفؑ اور حضرت مریمؑ آتی ہیں۔ ان کی سیرت و کردار میں چیزیں تو اور بھی بہت سی ہیں لیکن نمایاں طور پہ قرآن نے جو بیان کیا ہے وہ ان کی عصمت کا معاملہ ہے۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر کئی بار عرض کر چکا ہوں، قرآنِ کریم نے عصمت پر بڑا زور دیا ہے۔ یہ بڑی بنیادی قدر ہے۔ اور ہمارے اس دور میں دونوں چیزیں انتہا تک پہنچ چکی ہیں ایک تو یورپ کی جنسی بیبا کی وہ حیوانی درجے تک پہنچ چکی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔ دوسری طرف وہیں کے محققین اور مفکرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ افراد کی سیرت نہیں بلکہ قوموں کے عروج و زوال کا بڑا بنیادی تعلق اس قوم کے جنسیات کے متعلق ضوابط سے ہے۔ جو قوم جنسیات پر پابندیاں عائد کرتی ہے انہیں ضابطوں کے تابع رکھتی ہے، اُنون کے الفاظ میں کہ جس قوم میں شادی سے پہلے عصمت پر زور دیا جاتا ہے، وہ قوم عروج پر ہوتی ہے، بلندیوں کی طرف جاتی ہے اور جو قوم اس باب میں ان پابندیوں سے گریز کرتی ہے، بیبا کیاں دے دیتی ہے تو اس کی تحقیق کے مطابق وہ کہتا ہے زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک وہ قوم باقی رہ سکتی ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک عصمت کی قدر و قیمت اور پھر مربوط شکل میں داستانِ حضرت یوسفؑ کا تفصیلی ذکر

دوسری طرف یہ چیز بھی سامنے آ گئی کہ یہ عصمت کی پابندی جو ہے اس پہ جو زور دینا ہے اس سے صرف ایک فرد کے ذاتی کردار ہی کا تعلق نہیں ہے بلکہ قوموں کی اجتماعی زندگی کا بھی اس کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اور قوموں کے عروج و زوال میں اس کو بڑا دخل ہے۔ تو قرآنِ کریم نے عصمت پر بڑا زور دیا اور انفرادی طور پر جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے، دو شخصیتیں ایسی ہیں جن کی عصمت کی داستان کو قرآن نے نہایت مربوط انداز میں بیان کیا ہے۔ سورۃ یوسف کی ایک خصوصیت اور ہے اور وہ یہ کہ باقی انبیائے کرامؑ کی جتنی داستانیں اور قصص آئے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک ٹکڑا یہاں ہے دوسرا ٹکڑا کسی دوسری جگہ ہے اس میں اضافہ کہیں اور ہوا ہے استثنا کسی اور مقام پہ ہے تو ہمیں ان کی داستان کو مربوط شکل میں دیکھنے کے لئے ان تمام مقامات کو سامنے لانا ہوتا ہے اور ان میں ایک ربط پیدا کرنا ہوتا ہے لیکن یہ حضرتِ یوسفؑ کی داستان ایسی ہے کہ جو ایک ہی سورۃ کے اندر مربوط شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے حتیٰ کہ دیگر مقامات میں ایک دو جگہ صرف حضرتِ یوسفؑ کا وہ بھی نام آیا ہے کوئی اور تذکرہ نہیں آیا اور وہ اس لئے کہ یہ تذکرہ ایک ہی جگہ اتنی مکمل مربوط شکل میں

ہے کہ اس کے کسی دوسرے ٹکڑے کے کسی دوسری جگہ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ اشارات اس میں بھی ملتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو بھی جتنے مرحلے درپیش ہونے تھے مکی زندگی میں اس کے بعد پھر ہجرت کے بعد مدنی زندگی کی طرف جانے میں' اگر اصولی طور پر کچھ دیکھا جائے تو اس داستان میں اس کی طرف بھی اشارے ہیں۔

پورے معاشرے میں ایک فرد کی ثابت قدمی اور استقامت بھی بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا بنیادی طور پر اس داستان میں یہی بتایا گیا ہے کہ ایک فرد کا ذاتی کریکٹر اگر وہ استقامت سے اس کے اوپر جم کر کھڑا رہے تو کیا خوشگوار اور حسین نتائج پیدا کرتا ہے۔ بالعموم ایک فرد غلط معاشرے کے اندر مایوس ہو جاتا ہے۔ اپنے اصولوں کو چھوڑ دیتا ہے اور اگر چھوڑتا نہیں تو کم از کم وہ INDIFFERENT ہو جاتا ہے جیسا میں نے کہا تھا' لاتعلق ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ میرے ہی ذمہ ہے سارے معاشرے کی اصلاح' میرے ہی ذمے ہیں یہ تمام چیزیں یا یہ کہ صاحب ! جیسے باقی کر رہے ہیں اسی طرح سے مجھے بھی کرنا چاہئے۔ لیکن اگر ایک فرد اپنے کریکٹر کو اہمیت دیتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ دنیا خواہ کچھ بھی کر رہی ہے' مجھے اپنے اصولوں کی پابندی کرنی چاہئے تو قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس کا نتیجہ بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔ یہ ہے بنیادی سبق جو ہمیں حضرتِ یوسفؑ کی اس داستان سے ملتا ہے جو اس سورۃ میں مربوط شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صفات کے لحاظ سے قرآن حکیم ہر قسم کے تضادات سے پاک' روشن' فصیح' آسان' سہل' دوٹوک' واضح اور بے مثل ہے

الٓرٰ اللہ علیم ورحیم کا یہ بیان ہے کہ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ (12:1) یہ ایک ایسی کتاب کی آیات ہیں کہ جو اپنی بات کو بڑی وضاحت سے بیان کرتی ہے۔ قرآنِ عظیم کے متعلق متعدد مقام میں یہ چیز آئی ہے کہ یہ اپنی بات کو بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے' نہایت واضح ہے اسے روشنی کہہ کے پکارا ہے۔ اور روشنی تو اپنی ہستی کی دلیل کے لئے کسی اور خارجی شہادت کی محتاج نہیں ہوتی وہ جو آفتاب آمد دلیلِ آفتاب کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کے سمجھنے کے لئے قرآن کی زبان اور قرآن نے جو کہا ہے انسانی علم' بصیرت' مطالعۂ فطرت کا تاریخ کا یہ چیزیں اگر ساتھ ہوں تو قرآن اپنے معنی نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے اس میں کوئی الجھاؤ نہیں' کوئی اجمال نہیں' کوئی التباس نہیں بڑی واضح' روشن' خود واضح کتاب اور مضامین کو واضح کرنے والی کتاب ہے اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ (12:1)۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (12:2) یہ معنی تو ہوئے کہ ہم نے قرآنِ عربی نازل کیا ہے تو یہ عربیًا جو

یہاں ہے تو وہ معنی اس کے ہو سکتے ہیں کہ عربی زبان میں قرآن اور اس لئے بھی کہ دوسرے مقام میں ہے کہ اسے ہم نے لسانِ عربیِ مبین میں نازل کیا ہے۔ تو ''عربی زبان میں'' بھی اس کے معنی اور خود عرب یا عرب کی نسبت سے جو عربی ہے' خود اس کے معنی ہی ہیں واضح اور فصیح۔ یعنی عربوں نے اپنا نام عرب رکھا اس زبان کی نسبت سے کہ ہماری زبان بڑی فصیح زبان ہے اور ان کو اپنی اس زبان کی فصاحت اور وضاحت پر اتنا ناز اور زعم تھا کہ یہ باقی دنیا کو عجمی یعنی گونگا کہتے تھے۔ اور اس میں شبہ نہیں جیسا کہ اب آپ احباب کچھ نہ کچھ تو ان لفظوں سے دیکھ چکے ہیں کہ اس زبان کی جامعیت اتنی ہے کہ بہر حال دنیا کی زندہ زبانوں میں تو کوئی زبان بھی اس کا مقابلہ نہیں کرتی اس کے مقابل میں آ نہیں سکتی۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کرے

یہ اتنی وسیع' فصیح' واضح' بین' جامع زبان کوئی دوسری زبان ایسی نہیں ہو سکتی۔ تو اس لئے یہ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا (12:2) کے معنی ہوگا کہ ایک واضح کتاب جس کا بیان نہایت واضح ہے یا عربی زبان کا قرآن لیکن یہ جو دوسرے معنی میں کر رہا ہوں کہ یہاں عَرَبِیًّا کے معنی نہایت واضح ہیں وہی کتابِ مبین جو پہلی آیت میں کہا ہے یہ اسی کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ اس لئے میں کہہ رہا ہوں کہ لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (12:2) تا کہ تم عقل و فکر سے کام لو اور اس کو سمجھ سکو۔ یعنی کتاب کا واضح ہونا اس غرض کے لئے ہے کہ تم اسے سمجھ سکو۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اس کا کہ اتنی واضح کتاب ہے کہ اس کو اگر غور و تدبر سے کام لیا جائے' تو یہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔

ہمارے ہاں کے دارالعلوموں میں قرآن حکیم کے متعلق پایا جانے والا تصور اور پھر ارباب شریعت کی سوچ کا ذکر

اب اس کے بعد جب قرآن سے دوری ہوئی' اس قوم کو یا ہٹایا گیا قرآن سے تو پھر جناب یہ چیز آئی کہ صاحب! جب تک اٹھارہ علوم نہ پڑھے جائیں اور علوم وہ جو ان کے مکتبوں میں اور ان دارالعلوموں میں پڑھائے جاتے ہیں کہ جن علوم میں سے کسی کو اب علم کہا ہی نہیں جا سکتا تو وہ جب تک نہ پڑھے جائیں' قرآن کی آیت سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اس پہ بھی یہ صرف ان کا یہ دعویٰ ہے' آگے چلئے تو کہا جاتا ہے کہ قرآن بڑا مجمل ہے صاحب! واضح نہیں ہے' غیر مربوط ہے' اس کے اندر ربط نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے ہاں کے اربابِ شریعت تھے اور آگے چلے تو وہ جو حضراتِ طریقت آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ الفاظ کے اندر اس کے رکھا ہی کچھ نہیں ہے اس کے معنی تو باطن میں ہیں' الفاظ کے معنی سے قرآن سمجھ میں نہیں آتا' ان کے اندر باطن میں اور معنی ہیں اور وہ باطن کے معنی کسی علم کے تابع نہیں آتے' وہ تو سینہ بہ سینہ آتے ہیں' رازِ دروں ہے وہ براہِ راست خدا سے ملتے ہیں اور مرشد کے مرید کی طرف سینہ بہ سینہ آگے چلتے ہیں۔

کہیں نہ لکھے جاتے ہیں نہ علم کا ان سے تعلق ہے۔اس قرآن کے متعلق یہ ساری چیزیں آپ کے ہاں ہیں اور زیادہ رجحان لوگوں کا وہ سینہ بہ سینہ علم والے جتنے بھی ہیں۔

قرآنی حقائق کو سمجھنے کے لیے قرآنی اصطلاحات کے صحیح مفہوم کو ان کی اپنی وضاحت کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے

قرآن میں آپ دیکھئے کہ وہ قدم قدم پہ تاکید کرتا ہے کہ اس میں تدبر کرو' تفکر کرو' غور کرو' فکر کرو' بصیرت سے ہم نے نازل کیا' بصیرت سے رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا ہے اور بصیرت سے یہ سمجھ میں آئے گا' علم سے سمجھ میں آئے گا **لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ**(12:2) ہم نے اسے واضح قرآن بنایا ہی اس لئے ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔تو یاد رکھئے! قرآنِ کریم ایک تو پہلی بنیادی چیز ہے کہ جس زبان میں یہ قرآن ہے اس زبان کا جاننا تو ضروری ہے۔اس میں تو کسی قسم کی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ جس زبان میں کوئی کتاب ہے بہرحال اس زبان کا جاننا تو ضروری ہوتا ہے۔اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں جس انداز سے عربی زبان یا قرآن کے الفاظ سمجھے جاتے ہیں اگر وہ سمجھ لئے جائیں تو قرآن کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔تاکہ تم اسے سمجھ سکو' واضح کتاب ہے۔

علم حاصل کرنے کے دو طریق ہیں

اب آگے بات آئی **نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ** (12:3) وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صاحبِ وحی کو' جس پر وحی نازل ہوتی ہے وہ چیزیں بتاتا ہے جو اس کے علم میں نہیں ہوتیں۔میں نے آپ کو بتایا ہے کہ علم حاصل کرنے کا ایک تو انسانی طریقہ ہے کہ علم کو مشاہدے سے' مطالعہ سے' تجربے سے' درس و تدریس سے اس انداز سے علم سیکھا جاتا ہے جیسا کہ ہم سیکھتے ہیں لیکن ایک علم وہ تھا کہ جو صرف حضرات انبیائے کرامؑ تک مخصوص تھا ان کے علاوہ کسی اور کو وہ علم نہیں دیا جاتا تھا اور اسے وحی کہا جاتا تھا۔

قرآن حکیم میں نہ تو کسی کشف کا ذکر ہے اور نہ ہی کسی الہام کا

وحی خدا کی طرف سے براہِ راست انبیائے کرامؑ کو علم ملنے کا نام ہے۔وہ وحی کہلاتا ہے اس کے علاوہ جو باقی آپ کے ہاں تصورات ہیں کہ یہ کشف ہوتا ہے اور الہام ہوتا ہے اور مبشرات ہوتے ہیں اور رؤیائے صادقہ ہوتے ہیں' یہ ساری عجم کی بنائی ہوئی سازشیں ہیں۔ یاد رکھئے! خدا کی طرف سے علم ملنے کا نام صرف وحی تھا وہ انبیائے کرامؑ تک محدود اور مخصوص تھا۔آخری وحی رسولِ اکرم ﷺ کو مل گئی' نبوت ختم ہوگئی۔نبوت ختم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ علم کا طریقہ ختم ہوگیا۔اور اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ ہاں صاحب! وحی تو ختم ہوگئی لیکن

کشف کے ذریعے سے خدا سے وہ علم ملتا ہے وہ آپ نے نام اس کا اور رکھ دیا ہے ''الہام کے ذریعے سے ملتا ہے'' آپ نے نام اور رکھ دیا ہے یہ تو بہت بڑا دھوکہ دینے والی بات ہے۔قرآن نے تو کہیں یہ نہیں کہا کہ ہم الہام کے ذریعے سے بھی یہ علم دیتے ہیں' ہم کشف کے ذریعے سے بھی علم دیتے ہیں۔عزیزانِ من! قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا' اس نے کہا ہے صرف وحی کے ذریعے سے علم ملتا ہے اور وحی نبی اکرم ﷺ کی ذات پر ختم ہوگئی۔اسی کا نام ختمِ نبوت ہے اس میں کوئی بحث نہیں کوئی جھگڑا نہیں۔

70 یا 80 برس سے علمائے کرام اور احمدی حضرات کے مابین مناظرے جاری رہنے کی وجہ وحی کی ماہیت کو نظر انداز کرنا ہے

یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ستر اسی برس سے یہ احمدی حضرات کے ساتھ آپ کے علمائے کرام کے مباحثے اور مناظرے اور یہ چلا آ رہا ہے' سر پھٹول ہو رہی ہے یہ کیا بات ہے؟ عام طور پہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ صاحب! یہ اتنا لمبا جھگڑا کیوں ہے؟ وہ لمبا جھگڑا اس لئے ہے کہ یہ کشف اور الہام اور یہ بشارات' یہ آپ کے ہاں کے علمائے کرام سب مانتے ہیں کہ یہ ہوتا ہے تو جب یہ مانتے ہیں کہ یہ بھی ذریعۂ علم ہے تو بات تو آسان ہوگئی۔وہ کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے انہیں یہ کچھ ملتا تھا۔اب اس کے بعد اس قسم کی وہ روایتیں اور احادیث بھی لے آتے ہیں کہ صاحب! اس کا نام بھی وحی رکھا گیا ہے کہ وحی کی بڑی قسمیں ہوتی ہیں ان میں یہ قسمیں بھی ہوتی ہیں وحی کی۔وہ یہ چیز ہے جہاں یہ مار کھاتے ہیں اور یہ بات آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔جب تک آپ یہ مانتے رہیں گے آپ کے ہاں کا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔وحی ایک خصوصی ذریعۂ علم تھا خدا کی طرف سے انسانوں کو براہِ راست علم ملنے کا' صرف انبیائے کرامؑ تک محدود تھا۔آخری وحی آخری رسول ﷺ کو وہ مل گئی جب وہ آخری وحی مل گئی تو خدا کی طرف سے علم دئے جانے کا یہ ذریعہ ختم ہوگیا' باقی بات ختم ہوگئی۔یہ بات کیجئے اور کہئے کہ کہیں کشف اور الہام اور مبشرات کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے ہم نہیں اسے مانتے' مسئلہ حل ہو جاتا ہے پانچ منٹ میں یہ ختمِ نبوت کا مسئلہ طے ہو جاتا ہے۔لیکن سارا کچھ تو یہ خود مانتے چلے آ رہے ہیں۔

لفظ احسن القصص کا مفہوم اس کی اہمیت

بہرحال بات میں یہ کہہ رہا تھا قرآن نے یہ کہا ہے کہ اے رسول! ہم تمہیں ایک داستان سناتے ہیں۔ایک بات سناتے ہیں **نَقُصُّ عَلَيْكَ**(12:3) بیان کرتے ہیں تمہاری طرف **اَحْسَنَ الْقَصَصِ** (12:3) عام طور پہ ترجمہ اس کا کیا جاتا ہے کہ بہترین قصہ ہے۔نہیں! یہ قَصص ہے یہ قصہ کی جمع عربی زبان میں آئے گی تو قِصص آئے گی ق کے زیر کے ساتھ' داستانیں جسے آپ کہتے ہیں۔جسے آپ کہیں گے احسن القِصص کے معنی ہوگا کہ بہترین داستان' داستانوں میں سے بہترین۔یہ قَصص کے معنی بیان کرنا ہے صرف۔بہترین

طریق سے ہم بیان کرتے ہیں تمہارے سامنے ایک داستان۔ یہ ہوا اس کا ترجمہ۔ بِمَآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡکَ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ (12:3) وحی کے ذریعے سے یہ تمہیں بیان کرتے ہیں۔

وحی کا علم نازل ہونے سے پہلے کوئی بھی نبی اُن حقائق سے باخبر نہیں ہوتا تھا

وحی کے ساتھ ہی بتادیا وَ اِنۡ کُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِیۡنَ (12:3) اس سے پہلے تمہیں اس کا علم نہیں تھا۔ یعنی بات صاف ہوگئی کہ خود نبی کو اس سے پیشتر اس کا علم نہیں تھا اور نبی پھر یہ علم کہیں سے حاصل نہیں کرتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ کہیں اساتذہ کے پاس جاتا ہے' کوئی کتابیں لیتا ہے' لوگوں کے پاس پہنچتا ہے' لوگ آ کے اسے بتاتے ہیں' انسانی ذرائع کی بات نہیں ہے بِمَآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡکَ (12:3)' اَوۡحَیۡنَآ (12:3) نے بات واضح کردی وَ اِنۡ کُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِیۡنَ (12:3) اس سے پیشتر تمہیں اس کا علم نہیں تھا ہم تمہیں وحی کے ذریعے اس کا علم دیتے ہیں۔ تو وحی کے معنیٰ مفہوم خود واضح ہوگیا کہ خود نبی کو بھی اس بات کا اس سے پہلے علم نہیں ہوتا تھا اور یہ وحی کے ذریعے ملتا تھا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص آج یہ کہتا ہے کہ یہ بات' اس کا علم مجھے اس سے پہلے نہیں تھا اور مجھے خدا نے براہِ راست یہ چیز بتائی ہے تو یہی تو وحی ہوتی ہے اور جسے بتائی جاتی ہے اسے نبی کہا جاتا ہے۔ جب وہ اس بات کو آگے بتاتا ہے تو یہ رسالت کہلاتی ہے۔ یہ تو ساری چیزیں لازم وملزوم ہیں۔ کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ بات مجھے براہِ راست خدا کی طرف سے ملی ہے کچھ بھی نام رکھ لیجئے' یہ دعویٰ نبوت ہے۔ یہ وحی کا دعویٰ ہے۔ اس میں کوئی جھگڑا نہیں' التباس نہیں' بحث نہیں ہے بِمَآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡکَ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ وَ اِنۡ کُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِیۡنَ (12:3) اب وہ دیکھئے وہ داستان جو بہترین طریق سے قرآن نے بیان کی ہے رسول اللہ ﷺ سے اور جس سے رسول اللہ ﷺ بھی خود واقف نہیں تھے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ قرآن بتاتا ہے کہ وحی سے پیشتر حضور ﷺ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ یاد رکھئے! نبوت سے پہلے قرآن نے کہا ہے نبوت کے بعد کی بات نہیں ہے۔ وہ ذاتِ گرامی ﷺ جن کے متعلق یہ کہا جائے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ علم کو طلب کرو' تلاش کرو خواہ چین تک بھی کیوں نہ جانا پڑے' تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ وہ دوسروں سے تو یہ کہے کہ علم کو تلاش کرو خواہ تمہیں چین تک بھی کیوں نہ جانا پڑے اور پھر خود باقی ساری عمر اسی طرح سے ان پڑھ کا ان پڑھ رہے' سوال ہی نہیں ہے۔ تو قرآن نے خود بتایا ہے کہ اس سے پیشتر یہ صورت تھی۔ تو ''اس سے پیشتر'' جو کہا قرآن نے تو اس میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ باتیں کہیں پڑھی نہیں تھیں آپ ﷺ تو لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہیں تھے۔ یہ باتیں اس سے پیشتر یہ بات سامنے بہرحال تورات میں انجیل میں تو یہ موجود تھیں تورات اور انجیل ان علاقوں میں موجود تھی کہ خود مکے اور مدینے میں یہ یہودی اور عیسائی موجود تھے۔

قرآن حکیم کے نازل ہونے سے پہلے تورات اور انجیل میں تحریف ہو چکی تھی

اب اگلی بات یہ آئی ہے کہ ٹھیک ہے خود نہیں پڑھی تھیں وہ لوگ بیان تو کرتے تھے اور یہاں سے اگلی بات آ گئی کہ جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اور جو کچھ ان کتابوں کے اندر بیان ہوا ہوا موجود ہے' ان دونوں میں اختلاف ہے۔ اور آپ اس کے بعد حیران ہوں گے یہ دیکھ کر کہ اس سے پہلے تو ان چیزوں میں تحقیق ہی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے ہاں بھی بڑے بڑے متشدد قسم کے ملا بیٹھے ہوئے تھے' تحقیق کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس دور میں جب مذہب کی گرفت کچھ ڈھیلی ہوئی ہے تو وہاں ریسرچ شروع ہوئی ہے۔ یہ جو ان کے ہاں تورات یا انجیل کی کتابیں ہیں ان کے اوپر اب انہی لوگوں نے ریسرچ شروع کی ہے اور آپ حیران ہوں گے کہ جن مقامات کے متعلق انہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ چیز واقعہ کے مطابق نہیں ہے جو تورات یا انجیل میں آئی ہے' واقعہ یہ ہے اور جس طرح انہوں نے کہا ہے کہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا واقعہ یوں ہے' قرآن نے اس طرح بیان کیا ہوا ہے۔

موجودہ ریسرچ کی روشنی میں حاصل ہونے والا اعتراف

یہ چیز جو تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے وہاں کے جو تورات اور انجیل کے جاننے والے لوگ تھے' علما تھے ان کی صحبت میں بیٹھ کے یہ باتیں سن رکھی تھیں اور اس کے بعد اپنے ہاں بیان کیا۔ تو جو سن رکھی تھیں ان سے تو مختلف ہے بیان جو یہاں آتا ہے۔ اور اس کے بعد اگلی چیز جو میں نے ابھی کی ہے۔ جو بڑی ریسرچ ہو رہی ہے آج کل ان کتابوں پہ' اس میں جتنے اختلافی مقامات میں اس وقت تک ریسرچ ہوئی ہے' ان کی تو تردید ہوئی ہے اور قرآن کی بالواسطہ تائید ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تو یہ نظر آیا کہ یہ آپ ﷺ نے ان علما سے سن کے باتیں نہیں لکھی تھیں' سن کے لکھی ہوتیں تو یہ باتیں کہاں سے آ جاتیں جو قرآن میں ان چیزوں میں آئیں۔ ٹھیک ہے بہت سے حصے جو ہیں دونوں میں مشترک بھی ہیں اس لئے کہ وہ کتابیں بالآخر وحی کے ذریعے سے انبیائے کرامؑ کو ملی تھیں ان میں بعد میں تحریف ہو گئی' انسانوں نے اپنے خیالات ملا دئے۔ اس میں غلط حصہ وہ ہے جو انسانوں نے ملایا تھا۔ قرآن صرف خدا کی طرف سے وحی ہے' اس لئے اس میں جتنا کچھ ہے وہ سارے کا سارا خدا کی طرف سے ہے۔ انسانی تحریف کا اس میں دخل نہیں ہوا۔ لہٰذا جہاں بھی قرآن میں اور ان کتابوں کے کسی بیان میں اختلاف ہو' کام تو یہ ہمارا تھا کہ ہم ریسرچ کر کے انہیں یہ بتاتے کہ تمہارے ہاں جو بیانات آئے ہیں تحقیق کی رو سے وہ اس کسوٹی پہ پورے نہیں اترتے۔ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ ہے جو تحقیق کی رو سے صحیح ثابت ہوتا ہے۔

آج ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات تو انہیں غلط روایات پر ہی مبنی ہیں

ہم نے تو یہ نہ کیا یہی نہیں کہ یہ نہیں کیا' ہم نے اپنی تفسیروں کے اندر وہ تمام باتیں داخل کر دیں کہ جو اسرائیلیات کے نام سے مشہور

ہیں' جو غلط باتیں ان کے ہاں موجود تھیں۔ اب وہ لوگ ہم پہ اعتراض کرتے ہیں کہ تحقیق کے بعد جب وہ باتیں نکلتی ہیں ایسی کہ غلط تھیں اور وہ آپ نے اپنے ہاں داخل کی ہوئی ہیں تو وہ آپ پہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ کے قرآن میں بھی تو یہ لکھا ہے' اب انہیں یہ کہنا کہ نہیں صاحب! ہمارے قرآن میں نہیں لکھا قرآن کی تفسیروں میں یہ لکھا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں تو یہ قرآن ہی کی تو تفسیریں ہیں۔ اب اگر کوئی یہ بات یہ کہہ دے کہ نہیں صاحب! ان لوگوں نے اپنی طرف سے یہ خیالات اپنے اس میں داخل کئے ہیں' آپ کے ہاں کے علمائے کرام اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ سلفِ صالحین کے مسلک کے خلاف جاتا ہے۔ یعنی قرآن پہ طعن پڑتا ہے تو پڑتا رہے' علم کی دنیا کے اندر آپ اگر معدوم ہوتے ہیں' تو ہوتے رہیں لیکن جنہیں انہوں نے سلفِ صالحین کہا ہے' ان کی غلط بات کو غلط بات نہیں کہا جا سکتا۔ بات شروع ہوتی ہے یہاں سے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ داستان مسلسل سی چلتی ہے۔ قرآن نے کہا ہوا ہے کہ جب قرآن تم پڑھتے ہو تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ **الغَو افیہ** (41:26) اسے کہتے ہیں عربی زبان میں چیں چیں کرنا یعنی اس کے معنی کچھ نہ ہوں ''تے رولا ایناں پا دیو کے تہاڈی گل سنی نہ جائے''۔

قرآن حکیم نے داستانِ حضرت یوسف کو احسن القصص کے حسین انداز میں بیان کیا ہے

اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡہِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ رَاَیۡتُہُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ(12:4) آپ دیکھیں گے کہ یہ داستان بھی بڑی حسین ہے ''نور و نکہت کی داستانِ'' اسے میں نے لکھا ہے' انداز بیان بھی قرآن نے کہا ہے احسن القصص ایک تو خود قرآن کا عام بیان ہی بڑا حسین ہوتا ہے جسے پھر اپنے بیان میں سے وہ احسن القصص کہے' بڑا حسین انداز ہے اس داستان کا۔ یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ یا ابا! میں نے دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور چاند اور سورج میرے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ یہاں رَاَیۡتُ (12:4) ہے ''دیکھا ہے'' جسے کہتے ہیں لیکن اگلی ہی آیت میں جب انہوں نے کہا ہے **رُءۡیَاکَ** (12:5) ''خواب'' تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنا خواب بیان کیا ہے کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے۔

سائیکولوجی کی دنیا میں خواب کا شعبہ بڑی اہمیت کا حامل ہے

خواب کی بات ذرا آگے چل کے سامنے آئے گی۔ اس سے پیشتر ان چیزوں پہ تحقیق نہیں ہوئی تھی ہمارے دور میں انسانی تحقیق اور علم نے جو وسعتیں اختیار کی ہیں تو ان میں سائیکولوجی بھی ایک نئی چیز آئی ہے اور یہ انسانی علوم میں بہت بڑا اضافہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اگرچہ ابھی ابتدا ہے اگر صحیح لائنز کے اوپر یہ لوگ چلتے رہے تو انسانی مائنڈ کے' جس کے لیے انہوں نے اپنی ٹرم PSYCHE وضع کی ہے کیونکہ مائنڈ بھی وہ بات پیدا نہیں کر سکتا تھا' جو اس نئی اصطلاح میں ہے۔ تو PSYCHE کے متعلق جو کچھ ان کے ہاں کی

تحقیق سامنے آئے گی' وہ بڑے عجیب وغریب انکشافات ہوں گے انسان کی مضمر صلاحیتوں کے متعلق کہ انسان کے اندر POTENTIALITIES کیا کیا دی گئی ہیں۔

سائیکولوجی دراصل دو حصوں میں تقسیم ہے ایک شعوری اور دوسری غیر شعوری شکل جو بڑی طاقت کی حامل ہے

کچھ تو وہ چیزیں ہیں جو حیوانی سطح کے اوپر از خود انسان کے اندر آتی ہیں' یہ کھانا پینا لیکن یہ کہ اس کے اندر صلاحیتیں کتنی ہیں' یہ ہے وہ میدان جس میں اب یہ سائیکولوجی نے قدم رکھا ہے۔ اور پہلی چیز جس پہ وہ متفق طور پہ پہنچے ہوئے ہیں وہ یہ کہ ایک تو انسان کا یہ INTELLECT ہے یہ شعوری ذہن جس کی رو سے یہ سب کچھ ہم یہ سمجھتے' سوچتے' کرتے ہیں لیکن اس کے علاوہ ایک UNCONSCIOUS MIND (غیر شعوری یا نیم شعوری) ہے وہ انسان کے اندر ہے اور اس کی قوتیں بہت بڑی ہیں لیکن وہ UNDEVELOPED قوتیں رہ جاتی ہیں۔ اس کی قوتوں کو اگر انسان DEVELOP کرنا شروع کرے تو عجیب وغریب چیزیں اس کے اندر سے نکلتی ہیں۔ یاد رکھئے! ان کا تعلق کسی خاص روحانیت سے نہیں ہے' کسی خاص مذہب سے نہیں ہے' وہ دین نہیں ہے۔ انسان کے اندر کی صلاحیتیں ہیں اس میں کافر اور مومن کی بھی تمیز نہیں ہے۔ تو جیسا کہ میں نے لکھا ہے جس طرح سے انسانی MUSCLES DEVELOP کرتے ہیں پہلوانی سے' خاص طریقے سے کسرت کی جاتی ہے' ورزش کی جاتی ہے اس کے خاص طریقے ہیں انسان کی جسم کی طاقت اتنی DEVELOP کر جاتی ہے کہ عام انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ ایک انسان یہ کچھ کر سکتا ہے۔ وہ پہلوان کسی زمانے میں آیا کرتے تھے' وہ موٹر چل رہی ہے' اس کو دانتوں سے پکڑ کے روک رہے ہیں' اتنا اتنا وزن اٹھا رہے ہیں۔ عام انسان محوِ حیرت رہ جاتا تھا۔ وہ صرف جسمِ انسانی کی قوت جو ہے اس کو DEVELOP کرنے کا نام تھا۔ اس DEVELOPMENT کے اندر تو یہ ''میدا پہلوان تے گنڈا سنگھ پہلوان ایناں دو آں اچ کوئی فرق ای نئیں ہے'' یعنی وہ تو انسان کے جسم کی ایک چیز ہے جس طریقے سے جو بھی DEVELOP کر لے اس کی DEVELOPMENT ہو جائے گی' اس کا تعلق دین سے نہیں ہے۔ اسی طرح سے یہ جو صلاحیتیں انسان کے اندر کی ہیں مثلاً دماغی صلاحیتیں اس میں بھی مسلم اور غیر مسلم کی تمیز نہیں ہے۔ سائنس کا علم حاصل کرنا چاہے وہ مسلمان حاصل کرے یا ایک ہندو یا انگریز حاصل کرے' جو بھی اس میں اس طریقے سے محنت کرے گا' آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اسی طرح سے یہ جو انسان کے اندر ابھی چھپی ہوئی طاقتیں ہیں جن کو اس کے مضمرات یا POTENTIALITIES یا UNCONSCIOUS MIND کی دنیا وہ کہتے ہیں اس میں بھی مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں ہے۔ یعنی ان کا تو ہمارے زمانے میں انکشاف ہی غیر مسلموں نے کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں کی ان چیزوں کو ہمارے ہاں چھوا

ہے جب مسلمان بھی علم کی دنیا میں آگے تھے تو ان کے ہاں کی بھی نفسیات کے متعلق کچھ چیزیں ملتی ہیں لیکن اس دور میں ایک سائنس کی حیثیت سے جو اس کو DEVELOP کیا ہے وہ تو غیر مسلموں نے کیا ہے۔ مثلاً یہ فرائڈ اور ینگ جو ہیں امام نظر آتے ہیں اس فن کے تو وہ مسلمان نہیں ہیں۔

سائنس ہمیں یہ تو بتا سکتی ہے کہ یہ کیا ہے لیکن اسے استعمال کیسے کرنا ہے یہ نہیں بتا سکتی' یہ بتانا صرف وحی کا کمال ہے

جو علم کی دنیا ہے اس میں یہ سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن نے **عَلَّمَ الانسان** کہا ہے۔ انسان کو ہم نے یہ علم دیا ہوا ہے۔ یہ ساری چیزیں ایک انسان حاصل کر سکتا ہے۔ دین آگے چل کر آتا ہے۔ دین آتا ہے کہ یہ آپ اپنی جو قوتیں یا صلاحیتیں DEVELOP کرتے ہیں نشو ونما کرتے ہیں اس کے بعد ان کو صرف کس طرح سے کیا جاتا ہے۔ یہاں دین آتا ہے۔ جیسے ایک پہلوان یا شمشیر زن یا SOLDIER فن حرب کا' WAR کا' جنگ کا سیکھ لیتا ہے' ماہر ہو جاتا ہے یہاں تک مسلم اور غیر مسلم میں فرق نہیں ہے' دونوں سیکھ سکتے ہیں' دونوں کمال حاصل کر سکتے ہیں ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم آگے بڑھا ہوا ہو۔ لیکن یہ کہ تلوار کا استعمال کہاں کیا جائے گا' یہ چیز ہے جہاں دین آتا ہے۔ مومن اسے خدا کے احکام کے تابع استعمال کرے گا' غیر مسلم اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے گا۔ بس یہ ہے جہاں یہ دین آتا ہے۔ لہٰذا یہ جو نفسیات کی دنیا کے اندر کی یہ قوتیں اب یہ بیدار ہو رہی ہیں ان میں بھی مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا یہ ہے کہ انسان کے یہ UNCONSCIOUS MIND جسے کہا گیا ہے بہت سے خیالات' بہت سی اس کی ایسی تمنائیں اور آرزوئیں جو نا کام رہ جاتی ہیں' بہت سے ایسے خیالات جو خیالات کی دنیا تک ہی رہتے ہیں آگے نہیں بڑھتے' وہ بتاتے یہ ہیں کہ یہ ساری چیزیں جو ہیں کہیں گم نہیں ہو جاتیں یہ جسے آپ UNCONSCIOUS MIND کہتے ہیں' اس کے سٹور ہاوس میں یہ جمع رہتی ہیں بچپن سے۔

پہلے پہل بچے کا بات کرنے کا طریق

بات یہ دوسری طرف چلی جائے گی یہ تو ایک SUBJECT ہی الگ ہے کہ اس کو تو درس کی طرح میں پڑھا سکتا ہوں کیونکہ میں نے اس کو پڑھا ہے۔ لیکن بہر حال وہ کہتے یہ ہیں کہ جب بچہ ''میں'' کہنا پہلے سیکھتا ہے' آپ نے دیکھا ہے بچہ جو پہلے بیان کرتا ہے یہ دو برس کا بچہ بولنا تو سیکھ لیتا ہے لیکن وہ کہتا یہ ہے'' کا کا آیا ہے' کا کا جائے گا'' وہ اپنے آپ کو کہہ رہا ہوتا ہے ابھی وہ میں نہیں کہتا'' میں نے یہ کیا ہے'' پہلے وہ بچہ یہ جو تھرڈ پرسن جسے کہتے ہیں اس میں گفتگو کرتا ہے صیغۂ غائب میں گفتگو کرتا ہے'' کا کا گیا تھا' کا کے کو لے لیجئے'

کا کا مانگتا ہے'' تھرڈ پرسن ہوتا ہے' فرسٹ پرسن آتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ ''میں نے یہ لینا ہے'' جب میں کہتا ہے تو وہ "I" آتا ہے اور یہ "I" ہے جو یہ کہتے ہیں PSYCHE اپنے آپ کو "I" سے متعارف کراتا ہے۔

Unconscoious mind اور Intellect (شعور) میں فرق

یہاں سے وہ شروع ہوتے ہیں اور جتنے خیالات اس عمر کے بھی جتنے خیالات' اس میں ناکام آرزوئیں' بجھی ہوئی حسرتیں یہ ساری کی ساری' اس UNCONSCIOUS MIND کے سٹور ہاوس میں گودام میں جمع ہوتی چلی جاتی ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ جو حصہ آپ کے اس INTELLECT (شعور) کے اندر آتا ہے اس میں ربط ہوتا ہے۔

غیر شعوری طور پر دل و دماغ میں گذرنے والے تصورات سے مربوط سوچ کی عکاسی تک پہنچنے کا طریق

آپ دیکھتے ہیں جتنی باتیں ہم کرتے ہیں' مربوط ہوتی ہیں۔ سٹور ہاوس کے اندر جو چیزیں جمع ہوتی ہیں' اس کی مثال وہ دیتے ہیں جیسے کہ ایک سینما کی فلم' اس کو قینچی سے کاٹ دیا جائے' فلم آپ دیکھتے ہیں اتنے اتنے ٹکڑے کے اندر ہوتی ہے وہ تصویر' اس کو جب چڑھاتے ہیں تو وہ CONTINUITY جو ہے ان ٹکڑوں کی اس سے وہ پوری مربوط فلم سامنے آتی ہے ورنہ ہر ٹکڑا الگ الگ ہوتا ہے' وہ مثال دیتے ہیں کہ اگر فلم کو ان ٹکڑوں میں کاٹ دیا جائے اور اس کو ایک ڈبے میں ملا لیا جائے تو آپ سوچتے ہیں کہ وہ کہانی تو وہاں پوری ہوتی ہے لیکن اگر آپ ایک ٹکڑا اب یوں اٹھائیں تو اس میں آپ دیکھیں گے کہ انسان جو ہے چلا جا رہا ہے' دوسرا اٹھائیں تو نظر آتا ہے کہ ایک گھوڑا چلا آ رہا ہے۔ گویا یہ غیر مربوط کہانیاں جو ہیں یہ اس سٹور ہاوس کے اندر ہوتی ہیں۔ جب یہ شعوری نفس کام کرنا چھوڑ دیتا ہے' خواہ وہ شراب کے نشے میں ہو یا وہ نیند کی حالت میں ہو تو CONSCIOUS MIND کا سوئچ آف ہو جاتا ہے اور UNCONSCIOUS MIND جو ہے لاشعور پھر وہ اپنے سٹور ہاوس کے یہ جو ٹکڑے ہیں' ان کو اچھالتا ہے' اوپر لاتا ہے۔ یہ پولیس کی تفتیش میں ایک طریق یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شراب پلا کے مجرم کو خوب دھت کرتے ہیں' اس کو نشے میں یا اس کو مرغن اتنا کھلاتے ہیں کہ وہ دھت سو جاتا ہے تو سونے میں جو باتیں کرے یا ایک نشے کے عالم میں' جو وہ باتیں کرتا ہے' وہ وہ ہوتی ہیں جو شعوری طور پہ وہ بیان نہیں کرنا چاہتا کہ جرم کا اقرار ہو جائے گا غیر شعوری طور پہ جو باتیں اندر ہوتی ہیں' وہ اوپر آتی ہیں آتی' غیر مربوط شکل میں' ہیں اب ان ٹکڑوں کو لے کر جو اس طرح سے آئے ہیں۔ ایک آدمی ہے' پھر موٹر آ گئی' پھر گھوڑا آ گیا' پھر وہ سمندر آ گیا' پھر وہ آسمان آ گیا اب ان کو جو جوڑتے ہیں تو اس سے کچھ کہانی کے ٹکڑے جو ہیں' مربوط ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے یہ جو سائیکولوجسٹ آپ کے ہاں یا PSYCHO ANALYSIS جو کرتے ہیں اپنے کلینک کے اندر وہ اس طرح سے آپ کے یہ ٹکڑے لیتے ہیں یہ جو طریقہ ہے اس

طریقے سے وہ یہ سارا کچھ اب SCIENTIFICALLY کرتے ہیں۔

علامہ پرویزؒ کی طرف سے دورِ تصوف کی کچھ نظریاتی تعلیم کا ذکر

یہ جتنے اعصابی مریض ہوتے ہیں MENTAL DISEASES والے ان کے متعلق انہوں نے بتایا یہ ہے کہ ان کا UNCONSCIOUS MIND جو ہے وہ CONSCIOUS MIND کو DISTURB کرتا رہتا ہے تو وہ ان کے ہاں کا جو طریقہ ہے اس سے وہ اس مریض پہ یا اس شخص پہ وہ نیم بیہوشی کا سا عالم اس پہ طاری کیا جاتا ہے۔ یہ ساری چیزیں میری کی ہوئی ہیں جو میں یہ عرض کر رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کی اس لئے تھیں کہ ابتدائی دور تو میرا تصوف میں گذرا تھا کرامات تک کا دور بھی گذرا تھا۔ تو جب تحقیق کا زمانہ آیا تھا تو اس میں یہ سارا کچھ میں کرتا تھا کہ پھر یہ ہوتا کیا ہے تو اس کا آخری قدم یہ تھا یہی چیز کہ یہ پھر اس طریق سے ہوتا کیسے ہے؟ تو اس میں اسے ذرا سا نیم بیہوش کر دیا جاتا ہے اس میں وہ UNCONSCIOUS MIND کے اندر کی اس کی باتیں ہوتی ہیں اسے وہ بیان کرتا ہے وہ ہوتی غیر مربوط سی ہیں فلم کے کٹے ہوئے ٹکڑے ہوتے ہیں ان میں کچھ ربط پیدا کرنا ہوتا ہے۔ خوابوں میں اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے اور یہ یاد رکھئے! وہ جو خواب بظاہر ہمیں نظر آتا ہے کہ شاید ساری رات خواب آتا رہا اتنا لمبا ہوتا ہے وہ سیکنڈ چند سیکنڈ بھی نہیں ہوتا سیکنڈ کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے وہ اتنے میں ہی وہ بہت سے ٹکڑے اچھال دیتا ہے۔ تو یہ ہپناٹزم کے ذریعے سے اب یہ انہوں نے کرنا شروع کیا ہے اور جو انہوں نے استعمال اس کا اب کیا ہے وہ بڑا ہی منفعت بخش ہے انسانوں کے لئے۔

ڈاکٹری علاج میں ہپناٹزم کا استعمال

ڈاکٹروں کو بچوں کے علاج آپریشن میں بڑی دقت پیش آتی تھی ان کو اگر یہ کلوروفارم وغیرہ سنگھاتے تھے تو اس کے عواقب بڑے خراب نکلتے تھے بچے کے اوپر اس کا اثر بڑا شدید ہوتا ہے اور بعض آپریشن تو ایسے ہیں کہ اس کے بغیر کئے ہی نہیں جا سکتے تھے بڑی پرابلم تھی۔ آپ حیران ہونگے کہ ہپناٹزم کے ذریعے سے اس طرح سے آپ حیران ہونگے کہ وہ بیہوش نہیں ہوتا وہ ادھر سے اس کی توجہ اس طرف ہٹا دی جاتی ہے مرکوز کر دی جاتی ہے کہ اس کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ مجھے درد ہو رہا ہے۔ چھ چھ گھنٹے کا آپریشن بعض اوقات ایک ایک ہفتہ اس کے بعد تک بھی یہ کیفیت طاری رکھتے ہیں۔

ہمارے ہاں ہپناٹزم کی جگہ کرامات نے لے رکھی ہے

باقاعدہ ایک سائنس کی حیثیت سے اسے حاصل کیا جا رہا ہے۔ امریکہ کے HOSPITALS کے اندر یہ اب ایک شعبہ ہے

ہپناٹزم کے ذریعے سے یہ چیزیں کرانا۔ ہمارے ہاں کرامات ہوتی کیا تھیں؟ آج سر درد ہو رہا ہے حضرت صاحب کے سامنے آئے حضرت صاحب نے یوں دیکھا اور درد دور ہو گیا اللہ اکبر' بس سمجھ لیا کہ براہِ راست اللہ میاں کے ہاں دائیں طرف کرسی پہ یہ بیٹھے رہتے ہیں حضرت صاحب مقربِ بارگاہِ الٰہی۔ یہ سارا کچھ کیا تھا؟ یہ بندہ یہ خود کرتا رہا ہے جو اس کو پتہ ہے یہ کیا تھا' آج پتہ ہے' اس زمانے میں تو ہم بھی روحانیت سمجھتے تھے۔

امریکہ میں ہپناٹزم کی بنیاد پر چھ چھ گھنٹے کا آپریشن

میں نے عرض کیا ہے یہ سر درد اور ٹانگ کے درد اور یہ یہاں تک ہی یہ قصہ صرف ہوتا ہے۔ وہاں یہ کیفیت ہے' چھ چھ گھنٹے کے آپریشن کر رہے ہیں' مریض کو ہوش نہیں ہے' باقی سب چیزوں کے اندر اس کو ہوش ہے درد کا احساس نہیں ہو رہا۔ انسان کے اندر کی دنیا کی' POTENTIALITY کی عجیب چیزیں آ رہی ہیں ۔ یہاں کہنے سے مطلب یہ تھا کہ خواب کا تعلق بھی اسی سے ہے UNCONSCIOUS MIND کے اندر کی بات ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس قسم کی گم گشتہ آرزوئیں' بہت سے شدت سے آنے والے خیالات جو شعور میں نہ آئیں اور دب کے رہ جائیں۔

حضرت یوسفؑ کا شجرۂ نسب اور آپ کے خواب کی تعبیر اور 10 بھائیوں کا سلوک

یہ تو بیان کرنا میں بھول گیا کہ حضرتِ یوسفؑ کا خاندانی تعارف کیا ہے؟ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام وہ یہ جتنے انبیائے کرامؑ، ان کے ہیں مورثِ اعلیٰ نظر آتے ہیں وہ اپنے ہاں سے بابل و نینوا سے ہجرت کر کے تو فلسطین میں آ کے بس گئے تھے۔ اپنا ایک بیٹا حضرتِ اسماعیلؑ جو تھے انہوں نے اسے بہت بڑی قربانی کے لئے وادیٔ غیر ذی زرع (مکے) میں بسا دیا تھا جہاں کچھ نہیں ہوتا' وہاں مرکز بنایا تھا توحید پرستوں کا' اس کی تولیت ان کے ذمے تھی۔ تو وہ یہ جو اسماعیلؑ کی یہ جو شاخ ہے وہ تو عرب کے اندر ہے' یہ جتنے وہاں عربی بنتے ہیں یہ اسماعیلیؑ' ابراہیمؑ کی اولاد سے ہیں۔ دوسرا بیٹا ان کا اسحاقؑ تھا انہیں فلسطین میں بسایا تھا۔ فلسطین کا علاقہ آپ جانتے ہیں شام کا علاقہ' فلسطین کا علاقہ بڑا سرسبز علاقہ تھا تو وہاں کی سرداری ان کے حصے میں آئی۔ تو حضرتِ اسحاقؑ وہاں تھے' ان کے بیٹے تھے حضرتِ یعقوبؑ اور حضرتِ یعقوبؑ کے یہ بیٹے حضرتِ یوسفؑ ہیں۔ تورات میں بھی ہے اور یہاں بھی یہ چیز ہے کہ یہ بارہ بیٹے تھے' آگے چل کے بات بیان ہوگی کہ حضرتِ یوسفؑ اور ایک دوسرے بھائی یہ ایک والدہ کے بطن سے تھے یہ دس بیٹے یا تو دوسری ایک والدہ سے تھے یا مختلف والداؤں سے تھے' بہرحال یہ آپس میں سوتیلے تھے۔ تو حضرتِ یوسفؑ کے گیارہ بھائی ایک ماں اور ایک باپ اور یہ نظر آتا ہے کہ ہونہار بچے کے کتنے کتنے خواب' شروع سے ہی یہ حضرتِ یعقوبؑ کی باقی اولاد میں سے بڑے ہی ہونہار' بہت تیز چلنے والے' بہت آگے

جانے والے یہ بچہ تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا خیالات تھے جو دل کے اندر آئے اور پھر وہ خواب بن کر ان کے تحت الشعور سے ابھرے۔ بیان انہوں نے یہ کیا کہ میں نے دیکھا یہ ہے کہ گیارہ ستارے ایک چاند اور ایک سورج یہ میرے سامنے جھک رہے ہیں۔ یہ جو یہاں خواب بیان ہوا ہے' آگے قصے کے آخر میں جا کے آپ دیکھیں گے کہ حضرتِ یوسفؑ اقتدار کی مسند پر جلوہ افروز ہیں مصر کا پورا اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ جوان کے والد اور یہ جو بھائی وغیرہ جو تھے یہاں قحط پڑا تھا ان کی حالت اچھی نہیں رہی تھی انہوں نے ان کو وہاں بلا لیا تھا۔ جو یہ اب وہاں پہنچے ہیں تو ان کی کیفیت بیٹے کی آپ سمجھ لیجئے کہ مصر کا ایک گورنر ہی کہہ لیجئے کتنی بڑی شان و شوکت تھی۔ یہ ماں باپ اور یہ گیارہ کے گیارہ بھائی جو تھے یہ وہاں گئے حضرتِ یوسفؑ نے تو ماں باپ کی تعظیم کرنی ہی تھی انہوں نے بھی ان کی تعظیم کی اور وہاں یہ بات کہی گئی کہ یہ ہے تعبیر تمہارے اس خواب کی جو تم نے اس زمانے میں دیکھا تھا۔ تو گویا خود قرآن نے یہ واضح کر دی ہے بات کہ گیارہ کونسے تھے اور یہ سورج اور چاند کونسا تھا۔ خیالات کے تحت الشعور کے اندر سے جو ابھرے ہیں تو یوں خواب آیا ہے ان کو۔ قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاکَ عَلٰٓی اِخْوَتِکَ فَیَکِیْدُوْا لَکَ کَیْدًا (12:5) کہا کہ بیٹا! یہ خواب یہ اپنے ان بھائیوں کو نہ بیان کر دینا۔ وہ نظر آ رہا ہے کہ یہ سوتیلے بھائی جو تھے انہیں پہلے ہی حسد تھا یہ ان کے ساتھ' اس لئے کہ باپ انہیں زیادہ مقرب رکھتا تھا۔ اور ہوتا ہی یہ ہے اولاد میں سے جو بیٹا زیادہ قابل' صلاحیت مند' صالح' وہ باپ اس وجہ سے اس کو زیادہ قریب رکھتا ہے۔ یہ نالائق بیٹے بجائے اس کے کہ یہ دیکھیں کہ ہم نالائق ہیں' اس لئے ہمیں دور رکھا جاتا ہے' وہ قابل ہے اس لئے اسے قریب کیا جاتا ہے تو یہ اس سے حسد کرنے لگ جاتے ہیں کہ باپ اس سے زیادہ پیار کرتا ہے ہمیں NEGLECT کر رہا ہے۔ یعنی وہ اگر چاہیں تو وہ بھی اس جیسے بن جائیں تو باپ کے زیادہ قریب ہو جائیں' یہ نہیں وہ چاہتے' وہ حسد کرنے لگ جاتے ہیں۔

قرآن حکیم نے انسان کے سرکش جذبات حسد' انتقام' نفرت' سازش' عداوت کو ہی شیطان کہا ہے

یہاں یہ صورت ہو گئی تھی کہ یہ جو یہ سوتیلے بھائی تھے' یہ حسد کرتے تھے۔ تو حضرتِ یعقوبؑ نے بیٹے سے کہا کہ یہ بات اپنے بھائیوں سے نہ کہنا کہ پہلے ہی تمہارے متعلق ان کے ذہن کے اندر یہ حسد ہے اور انتقام ہے۔ اب ان سے یہ چیز بھی کہی تو وہ لے اڑیں گے کہ لیجئے صاحب! اب ہمیں اور ماں باپ کو بھی اپنے سامنے سجدہ کرا رہے ہیں ملاحظہ فرمائیے اس کی کیفیت یہ ہے۔ فَیَکِیْدُوْا لَکَ کَیْدًا ط (12:5) اس سے یہ جل بھن جائیں گے اور تمہارے خلاف کوئی سازش کریں گے۔ یہاں قرآن نے کہا یہ ہے فَیَکِیْدُوْا لَکَ کَیْدًا ط (12:5) یہ بھائی تمہارے خلاف سازش کریں گے۔ اور اگلے الفاظ ہیں اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (12:5) شیطان انسان کے خلاف بہت کھلا ہوا دشمن ہے۔ تو نظر آیا کہ شیطان کیا ہے یعنی ایک ہی سانس میں قرآن بیان کر گیا ہے کہ یہ بھائی تیرے

خلاف سازش کریں گے' شیطان انسان کے خلاف کھلا ہوا دشمن ہے تو گویا شیطان جو ہے کوئی الگ مخلوق نہیں ہے۔ یہی اس قسم کے یہ جو جذباتِ حسد اور انتقام اور نفرت اور سازش اور دشمنی اور عداوت کے پیدا ہوتے ہیں انسان کے اپنے دل میں اس قسم کے خیالات دوسرے کے خلاف پیدا ہوں تو یہ اس کا شیطان ہے۔

انسان کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ جو چاہے سو آپ کرے' لعنت کرے شیطان پر

دوسروں کے دلوں میں یہ خیالات اس کے خلاف پیدا ہوں تو وہ ان کا شیطان جو اس کے خلاف یہ کچھ کرتا ہے۔ تو یہ باہر نہیں کہیں ہوتا' ہمارے اندر ہی ہوتا ہے لیکن وہ تو کوئی ذمہ داری لیتا نہیں ہے' انسان کی کیفیت یہ ہے کہ کارِ بد تو خود کرے اور لعنت کرے شیطان پر۔ بات جب سمجھ آ جائے تو انسان اپنے آپ پہ لعنت کرتا ہے۔ اپنے آپ پہ لعنت کرے تو پھر اس کے بعد اصلاح ہو جاتی ہے لیکن ہم نے ایک بنا رکھا ہے اپنے سے الگ کہ جو بھی برا کام ہم سے یہ ہوتا ہے تو اس کے بعد کہتے ہیں کہ صاحب! شیطان نے یہ ہم سے کرا دیا اور پھر شیطانِ لعین ہوتا ہے اور وہ ملعون ہوتا ہے یعنی ہم اپنے کسی غلط کام کے اوپر' کسی تھرڈ پرسن کے اوپر لعنتیں بھیجتے ہیں اور اسی لئے اصلاح نہیں ہوتی۔ اور جب پھر وہ طومار اکٹھا ہو جاتا ہے گناہوں کا تو اس کو لے جاتے ہیں وہاں مکے میں' اس کو زم زم کے پانی میں دھوتے ہیں اور یہ جس نے کرایا ہوا ہوتا ہے اس کو جا کے پھر پتھر مارتے ہیں'' ہے تیرے کی! یہ کچھ کرایا تم نے ہم سے''۔ آپ کو معلوم ہے اس قوم کی اصلاح کیوں نہیں ہو رہی؟ اس نے شیطان کو اپنے سے باہر سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے خلاف سازش کریں گے اس لئے کہ شیطان تو انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ(12:6) کہا کہ بیٹا! میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے اندر جو علامات' جو نشانیاں ہیں ابھی سے میں دیکھ رہا ہوں کہ خدا تمہیں کسی بہت بڑے کام کے لئے منتخب کر رہا ہے بہت بڑا کام تم سے کوئی لینا چاہتا ہے۔ بڑی بلندی کی سعادت مندانہ نشانیاں ہیں تمہارے اندر۔ تورات کے بیان کے مطابق حضرتِ یوسفؑ کی عمر (قرآن نے نہیں عمر بیان کی) ان کے بیان کے مطابق سولہ سترہ سال تھی اس زمانے میں۔

خوابوں کی تعبیر بیان کرنے کی بنیاد علم النفس پر استوار ہوتی

سولہ سترہ سال کے بچے کے متعلق باپ صحیح اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کس نوعیت کا ہے' خاص طور پہ جب اس کی تعلیم و تربیت اتنی قریب رکھ کے کی ہو۔ اسی سے بات آتی ہے کہ باپ نے اتنا قریب کر رکھا تھا اور باقی بھائیوں کے دل میں حسد کے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔

ان کی خاص تعلیم وتربیت ہوتی ہوگی اس لئے انہوں نے کہا کہ بیٹا! میں دیکھ رہا ہوں کہ خدا نے تم سے کچھ کام لینا ہے تمہیں بہت بڑا وہ علم دے گا۔علم کے متعلق اس نے کہا ہے تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ(12:6) ہمارے ہاں تو اس کے متعلق وہ کہا گیا کہ یہ صاحب! خوابوں کی تعبیر بتانے والا علم ہے۔خوابوں کی تعبیر بتانے کا علم تو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ وہ علم النفس کے مطابق یہ کچھ کرنا ابھی حال میں یہ شروع ہوا ہے لیکن یہ تعبیر جو تھی ہمارے ہاں پرانی چلی آتی تھی اور وہ تعبیر نامے بھی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔تو اس میں یہ بتایا ہوا ہے کہ اگر مسجد دیکھو تو اس کے معنی یہ سمجھو اور اگر کدو دیکھو تو اس کا مطلب یہ سمجھو' اس کے اندر یہ لکھا ہوا ہوتا ہے۔وہ یونہی قیاسات ہیں' یہ سوال ہی نہیں ہے۔اب وہ جو دنیا نفسیات کی آ رہی ہے اس میں وہ جو طریقہ انہوں نے بتایا ہے وہ بڑا سائنٹفک طریقہ ہے کہ اس میں شبہ نہیں یہ SYMBOLS ہی ہوتے ہیں' علامات ہی ہوتی ہیں لیکن علامات کا مفہوم اس طرح نہیں ہوتا کہ ایک دفعہ بس' مسجد کے معنی ہر دفعہ یہ لو' وہ تو اس CONTEXT میں رکھ کے اس کے متعلق کچھ معنی متعین کرتے ہیں۔بہرحال ہمارے ہاں یہ تاویل الاحادیث کے متعلق تفسیروں میں یہی کہا گیا کہ وہ خوابوں کی تعبیر بتانے کا یہ علم تھا۔

لفظ تاویل کے لغوی معنی کسی بات کے انجام کا سامنے رکھنا ہوتا ہے نہ کہ کوئی تعبیر بتانا

ٹھیک ہے ایک علم تو یہ ہے لیکن ایک خدا کا برگزیدہ رسولؑ وہ اس لئے تو نہیں آتا کہ لوگوں کے خوابوں کی وہ تعبیریں بتاتا پھرے۔ تاویل الاحادیث کے معنی اس سے بڑے دور کے ہیں' بڑے گہرے معنی اس کے ہیں۔تاویل کے معنی ہوتا ہے کسی بات کے مآل یا انجام کو سامنے رکھنا' احادیث کے معنی واقعات یا باتیں جو سامنے آئیں۔روزمرہ کے واقعات ہم میں سے ہر ایک کے سامنے آتے ہیں ایک شخص ان کو یوں دیکھتا ہے اور دیکھ کر آگے چلا جاتا ہے۔دوسرا دیکھتا ہے تو اس کو اس واقعہ تک محدود رکھتا ہے۔ایک اور ہے جس کی نگاہ بڑی گہری ہے' وہ سوچتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ نہیں! یہ بات اتنی نہیں ہے' یہ تو بڑی دور تک پہنچتی ہے اور میری نگاہ یہ بتا رہی ہے کہ یہ چیز کسی دن اس طرح سے ہوگی یاد رکھنا! مجھے تو اس کے عزائم یہ نظر آتے ہیں۔یہ تو ابتدا ہے ابھی اس چیز کی۔ذہنی طور پر وہ یہ کڑیاں ملاتا ہے اور کڑیاں ملانے کے بعد بات کے انجام تک پہنچتا ہے' اسے کہتے ہیں تاویل الاحادیث' ''بات سے اس کے انجام تک پہنچنا''۔اقبالؒ نے یہ کہا ہے کہ

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت

ایک محفل میں دوسو دانشور' انہوں نے بات کی

سخن نازک تر از برگِ سمن گفت

نہایت نرم ونازک باتیں' بڑی لطیف باتیں' بڑی حقائق کی باتیں

ولے بامن آں دیدہ ور کیست

لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ وہ دیدہ ور کونسا ہے کہ

خارے دید و احوالِ چمن گفت

کہ کانٹے کو دیکھا اور بات کی بات ساری وہ کر دی۔

وجدانی طور پہ کسی بات کا ذہن میں آنا کوئی غیبی یا باطنی شے نہیں ہوتی بلکہ یہ عقل انسانی کی ہی ایک لطیف شکل ہوتی ہے

اسے کہتے ہیں تاویل الاحادیث کہ خارے دید واحوالِ چمن گفت۔ یہ بصیرت کی انتہا ہوتی ہے' بڑا FINE INTELLECT ہوتا ہے۔ یہ جسے INTUITION کہتے ہیں۔ وجدانی طور پہ کہتے ہیں۔ ایک بات میرے ذہن میں آ گئی وہ بھی اس طرح سے کشف الہام والی بات نہیں ہے۔ یہ INTIUTION کا ہمارے ہاں برگسان جو فرانس کا فلاسفر ہے وہ INTUITION کا بہت بڑا عالم اور فلسفہ دان ہے اس کا فلسفہ INTUITION پہ ہے۔ اس نے INTUITION کی DEFINITION لکھی ہے "THE HIGHER FORM OF INTELLECT" وہ کہتا ہے یہ کوئی غیبی یا باطنی چیز نہیں ہوتی یہ جو INTELLECT ہے انسان کا یہی عقلِ انسانی جو ہے' اس کی ایک لطیف ترین شکل ہوتی ہے یہ جس کو وجدان یا INTUITION آپ کہہ دیتے ہیں کہ INTUITIONALLY مجھے پتہ چلا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے ہمارے ہاں کہ صاحب! مجھے معلوم تو نہیں کیسے میں نے کہا ہے لیکن کچھ ایسا میرے ذہن میں آیا اور میں نے کہا اور وہ واقعی ایسا ہو گیا' یہ وہ چیز ہوتی ہے۔ کسی فن کے اندر' کسی علم کے اندر اتنا جذب ہو جائے انسان کہ ہر وقت اسی کا خیال رہے اس میں یہ INTUITIONAL چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ذہن کی صلاحیت ہے HIGHER FORM OF INTELLECT ہے۔ ایک MATHEMATICIAN گذرا ہے گاف اس کا نام ہے۔ تو بہت بڑا کوئی پرابلم MATHEMATIC کا اس کے سامنے آتا تو وہ یہ کہتا کہ

I KNOW THE ANSWER BUT YET DO NOT KNOW HOW TO ARRIVE AT IT.

''اس کا جواب تو مجھے پتہ ہے کہ کیا ہے لیکن ابھی مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ کس طرح سے اس جواب تک پہنچا جائے' اس کا عمل کیسے کیا جائے وہاں پہنچ جایا جائے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں تاویل الاحادیث کی وضاحت جسے انگریزی میں Intuition اور اُردو میں وجدان کہا جاتا ہے

یہ چیزیں تاویل الاحادیث کہلاتی ہیں اور یہ انسانی بصیرت جو ہے اس کی کیفیت ہے وہ نہایت نازک ہوجاتی ہے۔لطیف ہوجاتی ہے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ جو بظاہر ہم کڑیاں ملا کے کسی نتیجے پہ پہنچتے ہیں' یہ تو شعور کا کام ہوتا ہے UNCONSCIOUSLY ہم وہ کڑیاں ملا رہے ہوتے ہیں لیکن ہمارے نفسِ شعوری کو پتہ نہیں ہوتا کہ کڑیاں مل کس طرح سے رہی ہیں' UNCONSCIOUS MIND کڑیاں ملاتا ہے CONSCIOUS MIND ایک نتیجے کے اوپر پہنچ جاتا ہے اسے INTUITION یا وجدان کہتے ہیں۔ یہ تاویل الاحادیث کہلاتا ہے۔اور سیاست کی دنیا کے اندر تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ سیاست دان بڑے بڑے جو اس فن کے اندر جذب ہوجاتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک واقعہ ہمارے سامنے بھی آتا ہے وہی واقعہ ان کے سامنے بھی آتا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے اندازہ یہ نظر آتا ہے کہ صاحب! روس کی اور چین کی جنگ ہونے والی ہے یعنی بظاہر اس کا تعلق اس سے کچھ نہیں ہوتا لیکن ان کے سامنے وہ کڑیاں ہوتی ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ قرآن نے جو تاویل الاحادیث جو کہا ہے' وہی یہ چیز ہے جسے کہا جاتا ہے' خوابوں کی تعبیر بیان کرنا نہیں۔اور یہ بڑی چیز ہے جسے یہ ملکہ یہ صلاحیت حاصل ہوجائے کہ خارے دیدوا حوالِ چمن گفت اور قوموں کے اندر اگر اس قسم کے دانشور پیدا ہوں اور وہ نیک نیت ہوں تو وہ قوموں کو بڑے بڑے خطرات سے بچا لیتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ ہوں تو پھر تو قوم اس خطرے کے اندر کود جاتی ہے تو پھر ہی پتہ چلتا ہے کہ اوہو! یہ تو خطرہ یہ تھا۔

Politician اور Statesman میں فرق

سیاست دان اور STATESMAN میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جب POLITICIAN کے سامنے واقع آتا ہے تو اس واقعہ کے متعلق کچھ فیصلہ کرتا ہے STATESMAN وہ ہوتا ہے کہ جو ہونے والے واقعات ہوتے ہیں وہ ان کے متعلق کچھ اندازہ لگاتا ہے۔اقبالؒ ہی نے کہا ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

یہ کوئی روحانیت نہیں ہے، یہ کوئی کشف نہیں ہے اور وہ اس لئے نہیں ہے کہ اقبالؒ کے الفاظ بڑے غور طلب ہوتے ہیں، یہ شخص جانتا تھا کہ اسے.....

اقبال نے یہاں تاویل الاحادیث کے مفہوم کو آئینہ ادراک کے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے پیری مریدی کی جڑ کاٹ دی ہے

یعنی وہ کہتا ہے کہ ابھی جو واقعہ پردہ افلاک میں ہوتا ہے' جو باہر آیا ہوا نہیں ہوتا' اس زمین کے اوپر کہیں شہود میں نہیں ہوتا' اس کا عکس میرے ہاں آجاتا ہے میرے پیالے میں۔ تو یہ تو اس سے بڑی پیری مریدی اور کیا ہوگی یہ تو حضرت صاحب بنے پڑے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے اس نے کہا کیا ہے ''عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے'' ادراک کے معنی INTELLECT ہوتا ہے' شعور ہوتا ہے' فہم ہوتا ہے عقل ہوتی ہے کہ یہ اپنی بات ہے ساری جو میں یہ کہہ رہا ہوں' یہ کوئی روحانیت والی بات نہیں ہے' کشف و کرامات کی بات نہیں ہے۔ یہ بڑا عجیب شخص تھا۔ تو آئینۂ ادراک اتنا مصفا ہو جاتا ہے کہ ایک واقعہ جو آتا ہے تو اس سے وہ کڑیاں ملاتا چلا جاتا ہے اور ملاتا چلا جاتا ہے اور کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے بالعموم وہ نتیجہ صحیح نکل آتا ہے۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ جس قوم میں STATESMAN ہوں اور وہ ہوں نیک نیت قوم کے لیے' وہ قوموں کو آنے والے خطرات سے بڑے محفوظ کر دیتے ہیں۔ POLITICIAN جو حادثات ہوتے ہیں وہ ان کی کچھ تدبیریں بتاتے ہیں یہ بھی اگر نیک نیت ہوں تو بہر حال کچھ نہ کچھ نقصانات کے بعد ہی سہی' بچا لیتے ہیں لیکن اگر صورت یہ ہو کہ قوم میں یہ ہوں ہی نہ' اگر ہوں تو وہ نیک نیت نہ ہوں تو پھر اس کے بعد جو قوموں کا حشر ہوتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ تاویل الاحادیث۔

حضرت یوسف کے اپنے آئینہ ادراک کا ذکر

یہ وہ شخص ہیں حضرتِ یوسفؑ جنہوں نے کل کو مصر کے بگڑے ہوئے حالات کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ قحط پڑنے کے بعد مصر کی اقتصادی حالت ایسی ہو چکی تھی۔ آئینۂ ادراک کہا ہے اور یہ ادراک کا آئینہ ہی ہوتا ہے جس میں یہ اتنی لطافت پیدا ہو جاتی ہے جسے INTUITION آپ کہتے ہیں' وہ یہی چیزیں ہوتی ہیں کہ واقعات کو دیکھ کے انسان گہرائی میں پہنچ کے تو ان کو دیکھتا ہے کہ یہ کڑیاں کدھر مل رہی ہیں اور یہ کہاں چلا جائے گا آخر میں جا کے' اسے کہتے ہیں تاویل الاحادیث۔ اور میں کہہ رہا تھا کہ حضرتِ یوسفؑ سے آگے جا کر جو بہت بڑا معرکہ خیز کارنامہ سرزد ہوا ہے' مصر کی اقتصادی حالت بے حد بگڑ چکی تھی' مسلسل قحط وہاں پڑ گیا تھا' کوئی شکل اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ یہ سدھرے گی سنبھلے گی کس طرح سے۔ اب یہ دیکھئے کہ یہ ان کے گھرانے میں فلسطین کے اندر بادشاہت تو یہ تھی نہیں' یہ وہاں گئے ہیں غلام کی حیثیت سے بکے ہیں۔ اس کے بعد قید خانے میں رہے ہیں' قید خانے کے اندر۔

مصر کے قید خانے سے مصر کی بدحالی کو سنبھالا دینے کی خواہش کا اظہار

جب یہ بات پہنچتی ہے کہ حالت ایسی ہوگئی ہے بادشاہ بھی' وہ فرعون بھی معذور ہوگیا ہے۔اس کے مشیر بھی معذور ہوگئے ہیں۔وہ کہتے ہیں ہم کچھ نہیں بتا سکتے کہ اس کے متعلق کیا ہے۔یہ وہاں سے قید خانے سے پیغام اس کو بھیجتے ہیں کہ میں اس کے متعلق بتا سکتا ہوں کیا کرنا چاہئے' کوئی بات نہیں ہے حالت سدھر جائے گی' بگڑے ہوئے معاملے نہیں ہیں۔اور یہ وہاں جاتے ہیں اور اس کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں' خزائن الارض انہوں نے کہا تھا کہ اسے میرے ہاتھ میں دیدو۔خزائن الارض کے ہی غلط استعمال سے حالات بگڑتے ہیں اور انہی کو سنبھال لیا جائے' حالات سنبھل جاتے ہیں۔تو انہوں نے خزائن الارض کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کے بعد وہ مصر کی حالت پوچھو نہیں کہاں سے کہاں چلی گئی۔یہ ہے تاویل الاحادیث کہ واقعات جو ہو رہے ہیں' یہ جیل خانے میں بیٹھے ہوئے' ان کا مطالعہ کر رہے ہیں اور نوجوان ہیں ابھی یہ اور دیکھ رہے ہیں کہ وہ کس طرف ہے' کیوں بگڑ رہی ہے یہ حالت۔پہلے ان چیزوں کو روکنا ہوگا جن سے بگڑ رہی ہے پھر کس طرح سنور سکتی ہے ان چیزوں پہ غور کرنا ہوگا۔اور اس کے بعد یہ گئے اور انہوں نے اپنے ہاتھ میں لیا اور بگڑا ہوا نقشہ اس کا صحیح کر کے رکھ دیا' یہ ہے تاویل الاحادیث۔

خوابوں کی تعبیریں بیان کرنے کے قصے کی ماہیت اور تورات کا بیان

یہ ہے وہ بات نہ یہ کہ لوگوں کے خوابوں کی تعبیریں بیان کرنا۔خوابوں کی تعبیریں ویسے قیاس سے بھی بیان کی جاسکتی ہیں۔تو خدا تو تاویل الاحادیث کا تمہیں علم دے گا' میں دیکھ رہا ہوں تمہاری بصیرت ابھی سے ایسی ہے کہ ایک بات میں کہتا ہوں وہاں تک تم سوچتے ہو اس چیز کو اور پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ نعمت کہ جو آلِ یعقوبؑ کے اوپر خدا نے وہ کی تھی وہ اتمام ہوگا تمہارے ہاتھوں سے جس طرح تمہارے باپ ابراہیمؑ' اسحاقؑ کے ہاتھوں یہ ہوا تھا اور خدا کی ہر بات علم پر اور حکمت پر مبنی ہے۔یہ بات باپ نے بیٹے سے کہی ہے خواب سن کے' یہاں آپ دیکھئے کہ یہ خواب کے بعد یہ ان سے یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا تجھے برگزیدہ کرے گا' چنے گا' ایک بلند منصب پہ فائز کرے گا' بہت بڑا کام اس نے تم سے لینا ہے۔یہ بات کہہ رہے ہیں یہ نہ بتانا اور تم تو پتہ نہیں کیا بننے والے ہو۔تورات میں ہے کہ انہوں نے یہ بات بیان کی تو انہوں نے ڈانٹا کیا بکتے ہو تم یہ' کس قسم کا یہ خواب تم کہہ رہے ہو کہ تمہارے بھائی بھی اور تمہارا ماں باپ بھی تمہارے سامنے سجدہ کرے گا' بہت بڑا بنا پھرتا ہے تورات میں یہ ہے۔

حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں حضرت یعقوبؑ کی نگاہ بصیرت

قرآن میں یہ ہے۔تو آپ دیکھ لیجئے کہ اگر یہ شخص ان سے ہی سن کے بات بیان کرتے تو یہ ٹھیک ہے عام بات تو یہی کہتا جو کچھ وہ

تورات والا کہہ رہا ہے ''بھراتے اک پاسے رہئے' ماں پیؤ نوں نئیں سمجھدا کجھ ' خدا بنی پھردا ہے'' تورات میں یہ بات نظر آتا ہے کہ عام انسان یہ بات کرے گا۔ یہاں وہ شخص ہے ایک نبی (حضرت یعقوبؑ) ہے بلند مرتبے کے اوپر' وحی کے ذریعے نہ سہی' سیرتِ نبویؐ کا یہ تقاضا ہے کہ یہ باتیں انہوں نے ایک تو بیٹے کا مطالعہ کر رکھا ہے کہ کس انداز کا بیٹا ہے' ان کا مستقبل بیٹے کا سامنے ہے' یہ بات سامنے آئی ہے تو اس سے انہوںؑ نے اندازہ لگایا ہے کہ اس کے اندر اس کے غیر شعوری طور پر جو نفس ہے اس کے اندر کیا چیزیں چلی آ رہی ہیں اور اس سے کہا کہ بیٹا! ٹھیک ہے نظر آتا ہے مجھے' تجھ سے خدا بہت بڑا کام لینے والا ہے' تجھے یہ کچھ اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں بخشی ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ چیز کس انداز میں تمہارے سامنے آئے' بھائیوں سے نہ کہنا وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کر دیں گے۔ پہلے ہی بہت زیادہ حسد کرتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کے بارے میں آپ کے بھائیوں کی طرف سے کیا جانے والا سلوک اور پھر اس کی وجہ

آپ نے دیکھا دونوں بیانوں میں کیا فرق نظر آتا ہے۔ لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (12:7) کہا کہ لیجئے یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کے قصے میں ان لوگوں کے لئے کہ جو اس بات کے محتاج رہتے ہیں کہ صحیح چیزیں سامنے آئیں' کہا بہت بڑی نشانیاں اس قصے میں تمہیں ملیں گی' یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کے باہمی تعلقات کے اندر بہت بڑی نشانیاں ملیں گی۔ پہلی نشانی تو خود نبی اکرم ﷺ کی تھی' یہ قریش خاص طور پہ خود بنی ہاشم یہ سارے خود اپنے ہی دادا کی اولاد' یہ ابولہب وغیرہ۔ یہ بھائی تھے رسول اللہ ﷺ کے' حقیقی بھائی نہ سہی یہ بھی تو جس طرح سوتیلے بھائی تھے قریب اس قسم کے یہ سارے بھائی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے ان بھائیوں نے وہی کچھ یوسفؑ کے ساتھ اس کے بھائیوں نے کیا تھا۔ حتیٰ کہ پھر اپنے وطن کو چھوڑ کے جانا پڑا' بھائیوں نے یہاں یوسفؑ کو اس طرح سے نکالا تھا' مکے سے انہی بھائیوں نے رسول اللہ ﷺ کو بھی تو اسی طرح سے نکالا تھا۔ وہؑ اس اندھے کنویں کے اندر گئے تھے ﷺ اس غار کے اندر چھپے تھے' وہاں سے جانے کے بعد انؐ کی کیفیت کہ مصر کے اقتدارات ان کے ہاتھ میں آئے' نبی اکرم ﷺ جو اس سے نکل کے گئے ہیں ان کی کیفیت یہ کہ وہ ایک مملکت کے سربراہ بنے ہیں۔ پھر وہ بھائی جو تھے حضرتِ یوسفؑ کے ایک دن وہی بھائی پا بجولاں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور آپؑ ان سے یہ کہتے ہیں لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط (12:92) جاؤ اب میں کچھ نہیں کہتا تم سے' معاف کیا میں نے۔ بعینہٖ یہی چیز مکہ کی فتح کے بعد' یہ سارے بھائی جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے جنگ کے قیدی بن کر آئے ہیں تو حضور ﷺ نے یہی الفاظ کہے تھے وہاں کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط (12:92) ۔

اہل فکر کے لیے داستانِ حضرت یوسفؑ میں بہت بڑی نشانیاں ہیں

تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یوں بھی اگر دیکھیں تو خود رسول اللہ ﷺ کی آنے والی زندگی کے اندر بھی مماثل نظر آتے ہیں ان چیزوں کے بعض حصوں سے جو ہمارے سامنے آتی ہیں۔ تو قرآن نے کہا ہے کہ یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کی اس داستان میں ان لوگوں کے لئے جو حقائق کو معلوم کرنے کے محتاج رہتے ہیں بڑی نشانیاں ہیں۔ اِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓی اَبِیْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ (12:8)۔

حضرت یوسفؑ کے خلاف دوسرے بھائیوں کی طرف سے سوءِ سلوک کی وجہ جواز

اب بات شروع ہوگئی۔ بھائیوں نے آپس میں کہا کہ یوسفؑ اور اس کا بھائی (اب یہاں سے نظر آ گیا کہ یہ یوسفؑ اور اس کا ایک بھائی یہ حقیقی بھائی تھے کیونکہ انہوں نے کہا ہے یوسفؑ اور اس کا بھائی اور یہ بھی تو اس کے بھائی ہیں' آگے چل کے بیان ہوتا ہے کہ یہ باپ کی طرف سے بھائی تھے) وہ ہمارے باپ کے نزدیک ہم سے بہت زیادہ پیارے ہیں' بہت زیادہ ان کو وہ عزیز رکھتے ہیں۔ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ (12:8) حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ جتھہ ہمارا بڑا مضبوط ہے۔ اس زمانے میں تو قبیلہ اور جتھہ جو تھا یہی طاقت کا مظہر ہوتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ عام حالات کے مطابق تو انہیں ہمیں زیادہ عزیز رکھنا چاہئے کہ ہم بہت زیادہ بڑے جتھے والے لوگ ہیں لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ یوسفؑ کو اور اس کے بھائی کو زیادہ عزیز رکھتا ہے اور یوسفؑ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ عُصْبَةٌ (12:8) : یہ اعصاب' عصب NERVE کو کہتے ہیں اس کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کو اکٹھا کر دینا۔

عصبیتِ جاہلیہ کی بنا پر انسانوں میں وجہ جامعیت' غلط معیار کی جگہ فکر و نظر کی ہم آہنگی کی اہمیت

یہ عُصْبَةٌ اس زمانے میں یہ جو قبیلے ہوتے تھے' یہ خون کے رشتے سے قبیلہ بنتا تھا۔ اس لئے یہ جسے آپ برادری کہتے ہیں اس کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔ یہ عصبیتِ جاہلیہ جو آپ کہتے ہیں یہ کیا چیز تھی؟ بات بڑی اہم آ گئی ہے۔ دین اگر نہ ہو تو وجہ جامعیت انسانوں کے اندر خون کے رشتے بنتے ہیں' قبائلی زندگی یہی تھی جو ایک قوم بناتی تھی' ایک برادری بناتی تھی۔ ان کے اندر باہمی عصبیت ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کو کھینچ کے اپنے ساتھ رکھنے کی کیفیت ہوتی تھی۔ دین آیا تو اس نے کہا کہ یہ تو بڑی غلط وجہ جامعیت ہے۔ یہ خون کا رشتہ شے کیا ہوتی ہے۔ اصل رشتہ تو ہم آہنگیٔ فکر و نظر ہے' جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ ہم مشرب' ہم مسلک' ہم نظریہ انسان وہ ایک جماعت بننے چاہئیں خواہ ان کا خون کا رشتہ آپس میں ہو یا نہ ہو۔ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ عصبیتوں کے رشتے سارے توڑ کے' دین کی اجتماعیت کی بنا پہ ایک امت قائم کی تھی اور اس کے بعد اس میں شدت اتنی تھی اس معیارِ قومیت کو توڑنے کی کہ اس کا نام عصبیتِ جاہلیہ پڑ

گیا تھا۔ یہ ٹرم آپ نے سنی ہوگی۔ یعنی خون کے رشتے کی بنا پہ آپس میں ایک دوسرے کی برادری بننا' دین کے رشتے کو چھوڑ کے یہ چیز اتنی معیوب تھی اس زمانے میں' دین کے خلاف تھی یہ کہ اس کا نام بھی عصبیتِ جاہلیہ پڑ گیا (جاہلیہ کے معنی ہوتا ہے زمانۂ قبل از اسلام) یعنی زمانۂ قبل از اسلام کی وجۂ جامعیت' یہ خون کا رشتہ جسے آپ کہتے ہیں عصبیتِ جاہلیہ تھی۔

حدیث نبوی ﷺ عصبیت کے نام پر ایک دوسرے کو بلانے والا ہم میں سے نہیں

نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں کسی جنگ میں دو سپاہی مسلمانوں کے آپس میں جھگڑ پڑے تو انہوں نے اپنے پرانے انداز کے مطابق ایک نے اپنے قبیلے کا نام لے کے آواز دی کہ میری مدد کو آؤ' دوسرے نے اپنے قبیلے کا نام لے کے آواز دی میری مدد کو آؤ' غیر شعوری طور پہ ایسے وقت میں ہو جاتا ہے۔ انہوں نے آواز دی نبی اکرم ﷺ کیمپ میں تھے۔ کان میں آواز پڑی' حضور ﷺ باہر آئے اور ان کو سختی سے ڈانٹا اور یہ حدیث کے الفاظ ہیں **لیس منّا من دعا الٰی عصبیت** کہ جو اب بھی عصبیت کا نام لے کے آپس میں بلاتا ہے ایک دوسرے کو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

مملکتِ پاکستان کی بنیاد وطن' خون رنگ' نسل زبان پر نہ تھی

برادرانِ عزیز! آج مسلمان فخر سے ان ذاتوں اور برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ آج آپ کے ہاں فخر سے چار قومیتیں گنائی جا رہی ہیں مسلمانوں کے اندر۔ پہلے تو یہ امت جو بنی تھی دین کی وجۂ جامعیت کی بنا کے اوپر' وطن' خون' رنگ' نسل' زبان کے سارے رشتے توڑ کر۔ پوچھئے ان سے کہ اگر یہ وجۂ جامعیت ہو سکتی تھی' نبی اکرم ﷺ کا حقیقی چچا ابولہب اسی مکے میں رہنے والے' عصبیت کے اعتبار سے اتنا قریبی رشتہ' والد تو حضور ﷺ کے فوت ہو چکے ہوئے تھے یہی تھے حقیقی' رنگ' نسل' زبان' وطن' یہ سارے ہی مشترک ہیں۔ کیا یہ دونوں ایک قوم کے فرد تھے؟ بدترین مخالف تھے ابولہب۔ قرآن نے ایک ہی شخص کا نام لیا ہے' نام لے کے اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ وجۂ جامعیت ہو سکتی ہے مسلمان کے اندر!! حبش کا بلالؓ اور فارس کا سلمانؓ اور وہ روم کا صہیبؓ اور مکے کا عمرؓ یہ تو ایک قوم کے ایک امت کے افراد تھے اور رسول اللہ ﷺ اور ان کے اپنے چچا ابولہب اور حضرت عباسؓ یہ دوسری قوم کے فرد تھے جب تک عباسؓ ایمان نہیں لے آئے۔ یہ عصبیت اس کا نام ہے۔

قبیلوں کا لفظ تو دورِ اولیٰ میں یہ صرف ایک تعارفی نشان تھا

یہ جو آج آپ کے ہاں یہ ذاتیں اور گوتیں اور برادریاں اور قومیتیں چار بن رہی ہیں۔ اسلام کی نقیض ہے یہ تصور یاد رکھئے گا جامعیت کا' قطعاً مسلمان نہیں رہتا انسان اگر وجۂ جامعیت دین کی بجائے ان میں سے کوئی چیز ہو جائے۔ تعارف کے لئے قرآن نے

کہا تھا قبیلوں کے متعلق کہ وہ زندگی ایسی تھی NOMADIC TRIBES کی صحرائی زندگی یہاں ایک قبیلہ کہیں اور قبیلہ اور وہاں ایک قبیلہ' ایک قبیلے کا کوئی بچہ اگر راستہ گم کر جائے وہ کیا بتائے صاحب! اس زمانے میں کہ مجھے کہاں جانا ہے میں کن میں سے ہوں' یہ تعارف تھا اس زمانے کا' وجۂ تعارف تھی اس زمانے کی' صحرائی زندگی میں تعارف کا یہی طریقہ ہوسکتا ہے' نہ کوئی شہر نہ گلی نہ محلّہ نہ کوئی ان کے ہاں۔ یہ بھی نہیں کہ میں چیف سیکرٹری کا بھتیجا ہوں چلو اسی سے پہچان لیا جائے' یہی کہ صاحب! گلبرگ ٹو 25-B کچھ نہیں صحرا کے اندر سوال ہی نہیں۔ وہ صحرا خود جو آج ہوتا ہے شام کو ایسا جھکڑ چلے تو وہ سارے کا سارا بدل جاتا ہے۔ وہاں وجۂ تعارف تھا یہ قبیلہ' امت نہیں بنتی تھی اس سے۔ یہ عصبیت تھی۔

قبائلی زندگی کا تصور عصبیت کی بنیاد مہیا کرنا ہے امتِ واحدہ کا نہیں

بات عُصْبَةٌ(12:8) کی آئی انہوں نے کہا کہ ہم عصبیت کی بنا پر ہم ایک جتھہ ہیں اور یہ ان کو اپنے چہیتے بیٹوں کو لایا ہے۔ کیا بات ہے! اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (12:8) معاف رکھئے گا! یہ عام بات یہی ہے کہ ''دیکھو جی بڈھے دی مت ماری ہوئی'' بالکل لفظی ترجمہ ہے اس کا کہ نظر آتا ہے کہ بوڑھا بالکل ہی گیا گذرا ہو گیا ہے۔ دنیا کے ہر معیار کے مطابق اسے چاہئے تھا کہ ہمارے ساتھ بنا کے رکھتا اس کی کیفیت یہ ہے کہ ہمیں دور پھینکتا ہے اور وہ انہیں ساتھ رکھا ہے اور ان میں سے بھی یوسفؑ کو ساتھ رکھتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کو بھائیوں کے ہاتھوں قتل کرنے کا پروگرام

اقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ (12:9) آؤ! یوسفؑ کو قتل کر دیں یا اس کو کہیں دور جا پھینک دیں' ایسی جگہ اس کو پھینک دیجئے پتہ نشان نہ اس کا چلے تا کہ اس کے بعد یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ(12:9) تمہارے باپ کی توجہات ساری تم تک مخصوص ہو جائیں۔ یعنی اس لئے اس کو بیچ میں سے نکالتے تھے' کوئی اور بات یوسفؑ کے خلاف نہیں ہے' تا کہ باپ کی ساری توجہات مخصوص ہو جائیں ہمارے اوپر' یہ درمیان میں جو کانٹا ہے اس کو نکال دیا جائے۔

صالحین کے لفظ کا بنیادی مفہوم

وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ (12:9) یہاں ایک لفظ یہ آتا ہے' پھر اس کے بعد ہم صالحین ہو جائیں گے۔ تو ہمارے ہاں تو آپ کو معلوم ہے کہ صالح اور صالحین کے عام معنی کیا ہیں' قرآن میں بھی ان معنوں میں ہیں کہ جس میں بہت زیادہ اصلاحی چیز ہو لیکن یہ چیز تو کسی بات کا سنور جانا جو ہے۔ اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ جو لفظ استعمال ہوتا ہے' جہاں ہمواری پیدا ہوتی ہے وہاں یہ لفظ آتے ہیں۔ کہا اس کے بعد ہمارے حالات سنور جائیں گے اور ہمواری پیدا ہو جائے گی۔ یہ جو اس وقت اونچ نیچ ہے کہ وہ بڑے

اونچے مقام پہ ہیں۔ہمیں پوچھتے کوئی نہیں ہیں۔یہ اونچ نیچ مٹ جائے گی بیچ میں سے اس کو نکال دیجئے' سیدھی سی بات ہے۔یہ اونچ نیچ میں ہمواری پیدا کرنے کے تو دو طریقے ہوتے ہیں ایک تو یہ ہے کہ جو نیچے ہے اس کو اوپر لے آؤ ایک یہ طریقہ ہوتا ہے ہمواری کا۔یہ ہے جو قرآن کا عملِ صالح ہے کہ جو نیچے ہے اس کو اوپر لاؤ۔اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جو اوپر ہے اس کی ٹانگ کھینچ کے نیچے لے آؤ' ہمواری تو اس سے بھی پیدا ہوگئی تو سب ایک جیسے تو ہو گئے۔ایک جیسے ہونے میں فرق ہوتا ہے۔یہ جو غلط معاشرے کے اندر رہتا ہے' تنگ آ کے شریف آدمی' دیانتدار آدمی تنگ آ کر پھر یہ ہمواری پیدا کرتا ہے کہ یہ بھی انہی میں سے ہو جاتا ہے۔صحیح معاشرے میں ہمواری پیدا ہوتی ہے کہ یہ جو اوپر کے دیانتدار شرفا ہوتے ہیں' یہ ان کو کھینچ کے اپنے ہاں ملاتے ہیں۔تو انہوں نے یہ کہا کہ بیچ میں یہ پہلو کا کانٹا ہے نکالو اور اس کے بعد وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ (12:9) بالکل ہمواری پیدا ہو جائے گی اونچ نیچ مٹ جائے گی' ہمارے حالات سنور جائیں گے۔

عربی زبان میں مرادفات کا صحیح مفہوم اور ان کا استعمال اور حضرت یوسفؑ کے ساتھ ہونے والے سلوک کی روئداد

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (12:10) ان میں سے ایک نے یہ کہا کہ قتل نہ کرو بھئی' اس کے سینے میں ابھی قلب کے اندر کوئی نرم گوشہ ہوگا۔اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (12:10) اگر تم اس بات سے باز نہیں آتے' ضرور ہی اس کو تم نے یہ کچھ DISPOSE-OFF کرنا ہے تو پھر اس کو جنگل میں لے جا کر کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔یہ جب یعنی میں نے عرض کیا کہ یہ زبان ہی عجیب وغریب سی ہے' جب بھی کنواں ہوتا ہے اور بِئْر بھی ان کے ہاں کنواں ہوتا ہے۔یاد رکھئے! عربی زبان میں مرادفات نہیں ہوتے مرادف ہونا تو زبان کا نقص ہے یعنی ایک معنی کے لئے دو لفظ' دو لفظ کیوں۔عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لئے پانچ پانچ' چھ چھ سو لفظ ہیں لیکن دونوں کے معنی میں کچھ نہ کچھ شیڈ کا فرق ہوتا ہے۔یہ ہے یہ بلا کی زبان صاحب۔بہرحال جُبّ کہتے ہیں اس کنویں کو جس کے اوپر منڈیر نہ بنائی ہوئی ہو۔اب ظاہر ہے کہ یہ ویران کنواں ہوگا' کبھی کوئی کنواں بنا' ویران ہو گیا۔اس کے پاس آبادی بھی نہ رہی اب وہ چل نہیں رہا اندھا بھی ہو جاتا ہے۔پانی بھی پھر اس کے اندر نہیں رہتا۔اور خشک علاقوں میں' ریگستانوں میں تو کنوؤں کے پانی بڑی جلدی خشک ہو جاتے ہیں۔بِئْرٌ کہتے ہیں اس کنویں کو کہ جس کے اندر منڈیر بنی ہوئی ہو۔کیا بات ہے قرآن کی! یہ جو قومیں تباہ ہوئی ہیں جو اپنے زمانے میں بڑی فارغ البال تھیں خوشحال تھیں ان کو کہا ہے ان کے مکانوں کے کھنڈرات کو دیکھو فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (22:45) اور ان کے کنوؤں کو دیکھو کہ کس طرح سے خالی پڑے ہیں لفظ

بِـــئْـــرٌ آیا ہے وہاں کہ منڈیریں بنی ہوئی ہیں یہ کنویں ایک دن پانی دے رہے تھے۔ یہاں آبادی تھی ایک لفظ میں بات کہاں سے کہاں پہنچا تا ہے لیکن آج وہ ویران ہو رہے ہیں۔ ایک بِئْر ویران ہوتا ہے اور جبّ وہ ہوتا ہے کہ جس کے اوپر اب منڈیریں بھی نہ رہیں اس میں پانی بھی نہ رہے بس وہ ایک اندھا سا کنواں بن جائے۔ تو کہا کہ وہاں یہ کسی اندھے کنویں میں اس کو ڈال دو ادھر سے کوئی قافلہ آئے گا' کنواں دیکھ کے وہ آئے گا کہ پانی وغیرہ بھرے وہاں اس کو یہ بچہ نظر آ جائے گا وہ اس کو لے جائے گا جہاں قافلے والے نے جانا ہے۔ جان اس کی بچ جائے گی' دور بھی چلا جائے گا DISPOSE-OFF بھی ہو جائے گا' اس کو قتل نہ کیجئے۔ **قَالُوْا یٰٓاَبَانَا** (12:11) انہوں نے بات مان لی کہ ٹھیک ہے بس ایسا ہی کرنا چاہئے۔ **قَالُوْا یٰٓاَبَانَا مَالَکَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ وَ اِنَّا لَہٗ لَنٰصِحُوْنَ** (12:11) یہ کیا بات ہے کہ تم یوسفؑ کے معاملے میں ہم پہ ذرا بھی اعتماد نہیں کرتے' ہر وقت تم اپنے ساتھ لگا کے رکھتے ہو اور ہم اس کے بڑے خیر خواہ ہیں' ہم کوئی دشمن ہیں ہم بھائی ہیں اس کے' تو اس کے معاملے میں آپ ہم پر اعتماد کیوں نہیں کرتے۔ **اَرْسِلْہُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَ یَلْعَبْ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ** (12:12) اور ہم چاہتے ہیں سب ہم نے جانا ہے صبح شکار کے لئے باہر' کھیلیں گے کودیں گے ' کھائیں گے' پئیں گے' پکنک منائیں گے' شکار کریں گے اور اس کو بھی ساتھ جانے دو یہ بھی کھیلے کودے گا' یہاں بٹھا رکھا ہے آپ نے' اور آگے زندگی یہ بسر کیسے کرے گا اگر ان چیزوں میں نہیں آئے گا' ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ **قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ** (12:13) عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ حزن اور خوف دو لفظ ہیں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وحی کے اتباع سے وہ ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کو نہ خوف ہوگا نہ حزن ہوگا۔ **لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ** (2:38) حزن ہوتا ہے دل گرفتگی' جی کا بیٹھے چلے جانا' بظاہر معلوم نہ ہو کہ یہ کیوں ایسا ہوتا ہے۔ وہ جو میں اس کے لئے ایک شعر کہا کرتا ہوں کہ

ہے کوئی بات آج ہونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

یہ کیفیت ہوتی ہے انسان کی' معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کیوں ہے مگر جی ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے۔ یہ کیفیت جو ہوتی ہے' یہ حزن کہلاتی ہے' دل بیٹھا جاتا ہے۔ یہ UNCONSCIOUS MIND جو ہے یہ اس کا کارنامہ ہوتا ہے' شعور میں بات نہیں آ رہی ہوتی کہ کیوں ہو رہا ہے اُس میں یہ چیز ہوتی ہے۔ اور خوف ہوتا ہے جب وہ چیز جو ہے ACTUALLY محسوس شکل میں سامنے آ جاتی ہے' پھر وہ خوف ہوتا ہے۔ وحی کے اتباع سے قرآن نے کہا ہے کہ **لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ** (2:38) بیرونی خطرات سے بھی وہ قوم محفوظ ہو جاتی ہے اور دلوں کے حزن بھی اس میں نہیں ہوتے۔ بڑی چیز ہے۔ کہا یہ کہ دیکھو! بات اصل میں یہ ہے کہ ایک تو بات یہ ہے کہ پتہ نہیں کیوں جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس کو بھیج دوں تمہارے ساتھ' کچھ میرے دل میں چیز آتی ہے کہ دل یونہی بیٹھ جاتا ہے اور اگلی

بات یہ ہے کہ یہ کبھی آج تک باہر نہیں گیا اس طرح کی زندگی میں' ہوسکتا ہے کہ تم وہاں جاؤ اور یہ جو صحرائی زندگیاں اور جنگلوں کی زندگیاں ان لوگوں کی ہیں' وہ تو چار گھر ایک جگہ ہوتے ہیں باہر تو سارے درندے پرندے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہتے ہیں' خطرہ یہ ہے کہ تم ذرا اس سے اوجھل ہو اور کوئی بھیڑیا یونہی آئے' اس میں تو اتنی ابھی قوت نہیں ہے کہ یہ اپنی حفاظت کر لے' تم لوگ تو عام طور پہ جاتے رہتے ہو' یہ چیزیں جانتے بھی ہو' کچھ ایسا ہو جائے اور متاع یہ بڑی قیمتی ہے میں اس لئے نہیں بھیجتا ورنہ یہ بات نہیں ہے کہ تم پہ اعتماد نہیں ہے مجھے۔ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (12:14) کہا ابا جان! کیا بات آپ بھی کمال کرتے ہیں ہم نو دس گبھرو جوان' وہ ساتھ اس کو لے کے جائیں اور ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑیا آ کے ان کو کھا جائے پھر تو فٹے منہ' ہمارا ہونا نہ ہونا برابر ہے پھر تو ہم کہیں کے نہ رہے' بس ختم ہو گئے۔ یہ جو انداز ہے کہ کیا کہہ رہے ہیں آپ اس بات کو۔ یہیں تک آج رہتے ہیں' داستان جو ہے دلچسپ ہوتی جاتی ہے پھر آگے ہم چلیں گے۔ سورۃ یوسف کی آیت 14 تک ہم آ گئے' 15 آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:12)

❀.....❀.....❀

دوسرا باب: **سورۃ یوسف** (آیات 15 تا 24)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1974ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یوسف کی پندرہویں آیت سے ہو رہا ہے (12:15)۔

حضرت یوسفؑ کی داستانِ مسلسل

اس سورۃ میں تو حضرتِ یوسفؑ کی داستانِ نور و نکہت مسلسل چلی آ رہی ہے۔ سابقہ درس میں اس کی کڑی یہاں تک پہنچی تھی کہ حضرتِ یوسفؑ کے بھائیوں نے باپ سے کہا کہ انہیں ہمارے ساتھ باہر کھیلنے' کودنے' پکنک کرنے' شکار کھیلنے کے لئے بھیجا کریں۔ تو انہوںؑ نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ تم باہر جاؤ اور ذرا بھی اس کی طرف سے غافل ہو جاؤ' جنگل کا معاملہ ہے' یہ عام طور پر باہر جاتا نہیں' یونہی کوئی درندہ کوئی بھیڑیا لپک پڑے' یہ اچھا نہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ تو آپ کا وہم ہے' ہم اتنا بڑا جتھہ ہے ہمارے ہوتے ہوئے اگر اسے

بھیڑیا جھپٹ کے لے جائے تو پھر تو ہم کہیں کے نہ رہے' بالکل ناکارہ ہو گئے تو یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دیجئے۔ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ(12:15) یہ آپ کو پتہ ہے کہ پہلے انہوں نے آپس میں صلاح کر لی تھی کہ یوسفؑ کو الگ کر دیا جائے' کچھ کہتے تھے کہ مار ہی دیا جائے' طے یہ پایا تھا کہ نہیں! جنگل میں لے جایئے' وہاں کسی اندھے کنویں میں اسے پھینک دیجئے تا کہ باپ کی پوری توجہ ہماری طرف رہے۔ یہ درمیان میں ایک کانٹا ہے پہلو کا' یہ نکل جائے۔ تو وہ اسے لے گئے اپنے ساتھ اور انہوں نے اس بات پہ اتفاق کر لیا کہ اسے اندھے کنویں میں ڈال دیا جائے گا۔ انہوں نے چنانچہ اندھے کنویں میں ڈال دیا۔ یاد رکھئے! قرآنِ کریم داستان بھی بیان کرتا ہے تو ایک انداز ہوتا ہے SUGGESTIVENESS کا' یہ بڑا عجیب انداز ہوتا ہے کہ درمیان کی ایسی کڑی کو چھوڑ جانا کہ جس کے لئے یہ مشکل نہ ہو کہ سننے والا جو ہے وہ خود اس کڑی کو پوری کر لے GAP کو FILL-UP کر لے۔ تو اس سے ہوتا یہ ہے اس انداز سے کہ وہ سننے والا بور نہیں ہوتا اسے خود توجہ دینی پڑتی ہے کہ درمیان میں یہ بات جو نہیں کہی گئی' یہ کیا بات تھی تو اس کا اپنا ذہن بھی ساتھ کام کرتا رہتا ہے۔ شاعری میں یہ چیز ایمائیت کہلاتی ہے کہ SUGGESTION سے ایک چیز کہہ جانا اور الفاظ اس کے لئے نہ دینا لیکن اگر وہ GAP ایسا ہے کہ وہ کوئی دوسرا FILL ہی نہیں کر سکتا' یہ عیب ہو جاتا ہے پھر تحریر کا' لیکن اگر وہ اس انداز سے درمیان میں GAP دئے جائیں کہ سننے والا اسے خود FILL-UP کرتا چلا جائے تو یہ بڑا حسین انداز ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم داستان بھی اگر کہیں مسلسل بیان کرتا ہے تو کچھ یہ انداز اس کا ہوتا ہے۔ انہوں نے ڈال دیا کنویں میں۔ آپ دیکھیں گے درمیان میں یہ چیزیں آتی جائیں گی۔ تو کہا یہ کہ بہر حال ایک شخص کو جنگل میں اندھے کنویں میں اور وہ بھی بھائی ہیں جو اس کو ساتھ لائے ہیں کھیلنے کھلانے کے لئے' انہیں بالکل اس چیز کا وہم تک نہیں ہو سکتا (اب تو ہمارے ہاں محاورہ ہو گیا برادرانِ یوسفؑ) کہ میرے بھائی یہ کچھ کریں گے۔ تو کنویں میں ڈال دیا۔ خطرہ ہے حزن بھی ہے تو فوراً وہاں قرآن نے کہا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (12:15) کہا گھبرانے کی بات نہیں ہے۔

اندھے کنویں سے مصر کی تحت نشینی اور ان بھائیوں کو غلے کی فراہمی کی سبق آموز داستانِ ایمانیت کا ذکر

اب یہاں یہ دیکھئے! یہ نہیں کہا کہ یوسفؑ کو سارا بتا دیا کہ تم یہاں حفاظت سے نکال لئے جاؤ گے اور اس کے بعد پھر تم کہاں پہنچو گے' مصر کا تمکن تمہیں حاصل ہو گا اور وہاں بہت بڑا مرتبہ ہو گا' بھائی تمہارے پاس بھیک مانگنے کے لئے آئیں گے' تم دو گے۔ وہاں پھر ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ تم اس مقام پہ پہنچے ہوئے ہو اور وہاں پھر اچانک جو یہ بات ان کے سامنے آئے گی تو تم دیکھو کیا کیفیت ہو گی۔ یہ یوں نہیں ساری بات بتائی' کہا یہ کہ یہاں کسی قسم کے خوف کی بات نہیں ہے' غم و ملول کی کوئی بات نہیں ہے۔ وقت آئے

گا کہ آپ ان بھائیوں کو بتائیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا اور وہ ہے کہ وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (12:15) اس حیثیت میں کہ ان کے شعور میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ یہ یوسفؑ ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ یعنی وہیں یہ بات جو تھی' درمیان کی ساری کڑیاں قرآن چھوڑ گیا ہے اور کہا یہ ہے کہ ایک وقت آئے گا' انہی بھائیوں کو بتائیں گے کہ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا اور انہیں اس کا شعور بھی نہ ہوگا۔ میں یہیں یہ بتاؤں کہ کس انداز سے یہ بات سامنے آئی تھی۔ داستانِ یوسفؑ تو ہم سب کو معلوم ہی ہے اس لئے ان کڑیوں کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ آخر میں جا کے جب یہ صورت تھی کہ وہ دو تین مرتبہ بھائی آئے بھی' غلہ بھی لے گئے' معاملہ بھی انؑ سے ہوا انہیں بالکل وہم و گمان میں بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ جسے ہم نے اس طرح سے کنویں میں ڈال دیا تھا وہ مصر کے تخت کے اوپر یا اتنی مسندِ اقتدار کے اوپر فائز ہے اور اس کے یہ اختیارات ہیں اور اس سے ہم یہ غلہ لے کے جا رہے ہیں وہ ہمارے ساتھ یہ کچھ کر رہا ہے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

داستانِ یوسف کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا اندازِ بیان اور بھائیوں کی حیران کن تتلاتی زبان

تو آخر میں قرآن میں یہ ہے کہ جب اچانک یوسفؑ نے انہیں یہ کہا کہ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ تم نے وہ یوسفؑ جس کے متعلق (وہ بڑی باتیں بناتے تھے' یا مین کے متعلق جب یہ بات تھی کہ اس نے چوری کی ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ نئی بات نہیں ہے یہ تو ایسے ہی لوگ ہیں اس کے بھائی نے بھی یہ کچھ کیا تھا کسی زمانے میں) تو وہاں اس مقام پر حضرتِ یوسفؑ نے اپنے آپ کو بے نقاب کیا' تعارف کرایا۔ قرآن کے انداز ملاحظہ فرمائیے کہ اچانک یہ چیز کسی کے سامنے آجائے' یہاں اگر تھوڑی سی بھی عربی آپ جانتے ہوں تو اس کو APPRECIATE کریں گے کہ کیا انداز ہے کہ وہ سامنے کھڑے تھے کہ مصر کا ایک عزیز ہے' ایک گورنر ہے' ایک صاحبِ اقتدار وزیر ہے جس کے ساتھ یہ بات ہو رہی ہے اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ تمہیں معلوم ہے کہ اس کے بھائی کے ساتھ تم نے کیا کیا تو وہ یونہی ذہن میں یہ آیا تو اس نے کہا کہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے کہ جس میں تعجب کی بات یہ ہو' میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ (12:90) ارے! تم یوسفؑ ہو' جانتے ہیں جاننے والے کہ یہ کیا انداز ہے یہ بات کہنے کا' بعینہٖ یہ چیز ہے جیسے بالکل ''پنجابی اچ اینوں پچھتری کیندے ہیگے نیں'' کہ اچانک ایک چیز غیر متوقع طور پہ سامنے آئے تو اس کے لئے الفاظ ایسے ہیں کہ یہ جیسے تتلاتے ہوئے منہ سے نکل رہے ہیں قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ (12:90) ارے! تو یوسفؑ ہے تو۔ تو وہاں قرآن نے جو کہا تھا کہ ہم انہیں بتائیں گے ایک وقت میں کہ تو کہاں پہنچا اور کس مقام پہ آ کر سرفراز ہوا اور وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (12:15) انہیں شعور تک اس بات کا نہ ہوگا کہ تو وہاں پہنچ سکتا ہے۔ تو یہ ہے وہ مقام جو آگے آئے گا۔ یہ میں نے کہا ہے کہ وَ هُمْ لَا

یَشۡعُرُوۡنَ جو ہے وہ کس انداز سے قرآن نے وہاں بتایا ہے کہ ان کو اس کا وہم وگمان تک نہیں تھا کہ یہ سامنے یوسفؑ ہوسکتا ہے۔ بہرحال یوسفؑ کو ہم نے اطمینان دلا دیا کہ وہاں کسی غم وحزن کی کوئی بات نہیں ہے' پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

باپ کے سامنے حضرت یوسفؑ کے متعلق بھائیوں کی غلط بیانی کا انداز

وَ جَآءُوۡۤ اَبَاهُمۡ عِشَآءً یَّبۡکُوۡنَ (12:16) (داستان آگے چلتی ہے) اور وہ بھائی پھر رات کو روتے ہوئے باپ کے پاس آ گئے۔ قَالُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَ تَرَکۡنَا یُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَکَلَهُ الذِّئۡبُ ۚ (12:17) کہا کہ ابا جان! کیا بتائیں آپ کو کیا بیتی ہمارے ساتھ' یوسفؑ کو ہم نے بٹھایا تھا سامان کے ساتھ اور ہم کھیل کود میں نکل گئے اور ہم دوڑنے لگ گئے۔ نَسۡتَبِقُ (12:17) یہ ہے کہ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا ایسی دوڑ جس میں ریس کی سی شکل ہو کہ کون آگے نکلتا ہے۔ تو گویا اس طرح سے ہم اس میں محو ہو گئے' یوسفؑ کو پیچھے چھوڑا ہم نے سامان کے پاس اور واقعی جو آ کے ہم دیکھتے ہیں تو وہ یوسفؑ کو تو ایک بھیڑیا کھا گیا۔ اور آگے ہے وہ بات۔ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَ لَوۡ کُنَّا صٰدِقِیۡنَ (12:17) کہا کہ مشکل ہماری یہ ہے کہ آپ تو ہمیں عام حالات میں بھی سچا نہیں سمجھا کرتے' ہمارے متعلق تو آپ نے پہلے سے ہی یہ PREJUDICE MIND کر رکھا ہے کہ ہم تو ہر قسم کا مکر کرتے ہیں' فریب کرتے ہیں' جھوٹ بولتے ہیں' سچ بولتے ہی نہیں ہیں اور یہ واقعہ ایسا ہے اگر ایسا نہ بھی ہوتا' اگر ہمیں آپ عام حالات میں سچا بھی سمجھتے تو یہ بات تو ایسی تھی کہ یہ شاید آپ پھر بھی باور نہ کرتے ہماری بات۔ یعنی وہ جھوٹ ایسا ہے کہ وہ اپنے من کا چور اور کیا انداز ہے بات کہنے کا کہ آپ تو بہرحال بات مانیں گے نہیں۔ آپ تو عام حالات میں کہا کرتے ہیں کہ تم لوگ سچ بولتے ہی نہیں ہو۔ اور پھر یہ واقعہ اس قسم کا غیر متوقع واقعہ ہے جو ہم بات کہنے کے لئے آتے ہیں کہ اگر عام حالات میں آپ ہمیں سچا بھی سمجھا کرتے' تو اس واقعہ میں تو آپ ہمیں کبھی سچا سمجھتے ہی نہیں' اب بتائیے ہم کیا کریں۔ وَجَآءُوۡ عَلٰی قَمِیۡصِهٖ بِدَمٍ کَذِبٍ ؕ (12:18) وہ یوسفؑ کا کرتہ ساتھ لے آئے تھے اور اس پر جھوٹا لہو لگا رکھا تھا جھوٹ موٹ کا لہو اس کے اوپر لگا رکھا تھا اور وہ بھی انہوں نے پیش کر دیا۔

والد کی طرف سے صبرِ جمیل اور خدائے علیم وخبیر سے اظہار تمنا

قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَکُمۡ اَنۡفُسُکُمۡ اَمۡرًا ؕ فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ (12:18) انہوں نے کہا کہ حالات ایسے ہی تم نے پیدا کر دئے ہیں کہ اس میں' میں کر کیا سکتا ہوں سوائے اس کے کہ برداشت کروں اس کو حوصلے۔ اور صبر بھی صبر جمیل آپ دیکھتے ہیں یہ اونچی طبع کے جو لوگ ہیں ان کا صبر بھی ایسا نہیں ہوتا کہ جس میں عام حالات میں جیسے لوگ صبر کرتے ہیں کہ بظاہر صبر کہے جاتے ہیں اور واویلا مچایا جاتا ہے' غم وحزن ہوتا ہے' فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ بہتر چیز یہاں جو ہے وہ برداشت کر لینا ہی ہے۔ جو کچھ تم کہتے

ہواس کے متعلق اب تم سے میں بحث کیا کروں' ایسی صورت تو ہو نہیں سکتی کہ میں تمہارے ساتھ جا کے وہاں کہوں کہ دکھاؤ مجھے لاش کہاں ہے' تم تو کہتے ہو بھیڑیا لے ہی گیا ہے اس کو' تو میں سوائے اس کے کہ خدا سے مدد کا خواہاں ہوں کہ وہ اپنی طرف سے کوئی میری مدد کرے' جو کچھ تم کہتے ہو اس قصے اور کہانی کے اوپر میں اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں۔

قافلے والوں کو کنویں سے ایک غلام کے ملنے کی خوشی کا ذکر

یہاں باپ کی بات بیٹوں کے ساتھ ختم کی قرآن نے' پھر اُدھر چلا گیا۔ وَ جَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ (12:19) اُدھر سے ایک قافلہ گذرا۔ یہ علاقے وہ وہیں جہاں پانی کی بڑی کمی ہوتی ہے اور جہاں کہیں پانی ہو وہاں قافلے وہیں کیمپ کرتے ہیں' وہیں اپنی منزل لگاتے ہیں وہیں پڑاؤ کرتے ہیں پانی کے قریب۔ وہ دور سے انہوں نے دیکھا ہوگا کہ کنواں وہاں ہے تو وہاں وہ ٹھہرے۔ تو وہ جو ایک پیش رَو ہوتا ہے قافلے میں تو تقسیمِ کار کی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح سے قافلے چلتے ہیں تو وہ جو پیش رَو ہوتا ہے وہ آگے جا کے پہلے جائزہ لیتا ہے جگہ کا' دیکھتا ہے کہاں کیا چیز ملے گی' منزل کس قسم کی ہے' کہاں ٹھہرنا چاہئے۔ تو وہ پانی کے لئے وہ آگے گیا کہ سب سے پہلی چیز تو پانی لانے کی ہے رسی اور ڈول لے کر گیا' وہاں جب گیا ہے تو اس نے وہ کنویں میں ڈول لٹکایا۔ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ (12:19) اس نے وہیں دہائی دی او! خوشخبری ہو' خوشخبری ہو یہ ایک غلام مل گیا ہم کو یہاں۔ اس زمانے میں یہ بردہ فروشی تو عام ہوتی تھی۔ اِدھر اُدھر سے لوگ لے جاتے تھے غلاموں کو' بچوں کو' لونڈیوں کو' دوسری جگہ لے جا کے بیچ دیتے تھے۔ اب غلامی کی خرید و فروخت میں ایک تو یہ ہوتا ہے کہ ایک جگہ سے' کہیں سے خریدا انہوں نے تھوڑے بھاؤ پر' تھوڑی قیمت پر اور آگے چل کے زیادہ قیمت پر بیچا' اس میں بھی منافع ہوتا تھا لیکن اگر غلام مفت میں مل جائے۔

حضرت یوسفؑ کو اب انسانوں کی برادری سے نکال کر غلاموں کی کیٹا گری میں شامل کر دیا

یہ جو انداز ہے قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ (12:19) یہ بتا رہا ہے کہ اسے کتنی خوشی ہوئی وہ آپے سے باہر ہو گیا کہ ایسا ایک پلا پلایا ہوا جوان لڑکا مل رہا ہے اور مفت مل رہا ہے اور اس کا غلام ہونا تو ظاہر ہی ہے کہ جو اس طرح سے نکالیں گے اور وہ عام انداز اس زمانے میں ہوتا تھا' انہوں نے اسے غلام بنایا۔ وَ اَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً (12:19) اور اپنا مالِ تجارت انہوں نے سمجھ کے کہ جیسا اور مالِ تجارت تھا اسے بھی تجارت کا مال سمجھ کے چھپا لیا۔ تو یہ جو اس طرح سے بردہ فروش ہوتے ہیں وہ تو چھپا کے ہی لے جاتے ہیں۔ اس کو چھپا لیا' مالِ تجارت قرار دے کے یعنی اب وہ انسان نہ رہا ایک کموڈیٹی ہو گیا۔ اور کیا بات قرآن کی ہے کہ انسان سے بِضَاعَةً (12:19) بن گیا' اب وہ مالِ تجارت ہو گیا' وہ انسان کا بچہ نہ رہا۔ غلامی میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ پھر انسان مالِ تجارت ہو جاتا ہے' کمرشل کموڈیٹی ہو جاتی ہے۔

وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ (12:19) وہ یہ کچھ کر رہے تھے اور خدا یہ جانتا تھا کہ آگے اس داستان کی اگلی کڑی کیا ہونے والی ہے۔ چھپایا وہ لے گئے۔ وَ شَرَوۡہُ بِثَمَنٍۭ بَخۡسٍ دَرَاهِمَ مَعۡدُوۡدَةٍ ۚ (12:20) کیا بات ہے قرآن کی! ہمارے ہاں جو قصۂ حضرتِ یوسفؑ یا زلیخا کا جو قصہ مشہور ہے اس میں یہ مشہور ہے کہ پہلے وہ بھائی پہنچ گئے تھے اور ان قافلے والوں نے بھائیوں سے خریدا تھا۔ یہ تورات کا واقعہ ہے' تورات میں ایسا ہی ہے کہ انہوں نے ان کے بھائیوں سے خریدا بھائیوں نے بھی کہا کہ مصیبت پھر گلے پڑ گئی جلدی سے بیچو' تھوڑے سے پیسے لے کے اس کو بیچ دیا اور پھر یہ اس کو لے گئے اور پھر مصر کے بازار میں جا کے زلیخا کے ہاتھ بیچا۔ یہ ہمارے ہاں بھی یہ قصہ ہے حتیٰ کہ مولوی غلام رسول کی یوسفؑ' زلیخا جو ہے وہ بہر حال مولوی غلام رسول ہیں' وہ بہت پائے کے مستند عالم سمجھے جاتے ہیں' یعنی ان کی کیفیت صرف وہ وارث شاہ کی ہیر جیسی نہیں گنی جاتی' مولوی غلام رسول کی یوسفؑ' زلیخا تو بڑی معتبر سمجھی جاتی ہے لیکن وہ تو بہر حال قصے تو قصے ہی ہیں وہ تو پھر بھی شاعری ہے ان کے ہاں داستاں گوئی ہے۔

حضرت یوسفؑ کی ذات کو خرید و فروخت کی نذر کرنے کا ماجرا

تفاسیر جو آپ کے ہاں ہیں ان میں بھی یہی کچھ لکھا ہوا ہے۔ اور یہ ساری چیزیں اسرائیلیات سے لیتے ہیں' تورات سے لی ہوئی ساری بات کہ پہلے بھائیوں نے بیچا قافلے والوں کے ہاتھ اور ''جنوں کیندے نیں ایویں سِٹ پایا'' بالکل یہ چیز ہوئی کہ لاؤ میاں کیا دیتے ہو۔ لیکن یہ CIRCUMSTANCIAL , EVIDENCE جو بتاتی ہے' قرائن جو بتاتے ہیں' وہ خود اس کو جھٹلاتے ہیں کہ بھائی تو وہ کچھ کر کے چلے گئے تھے۔ پھر وہ آ کے کہیں وہ کنویں کے اوپر بیٹھ گئے تھے چوکیداری کرنے کے لئے کہ قافلہ آئے گا اسے نکالے گا تو پھر اس سے ہم کہیں گے کہ لاؤ صاحب! ہم بیچتے ہیں' بیچتے ہیں کیا پہلے تو ان کے قبضے میں تھی وہ متاع جو تھی جسے قرآن نے کہا ہے کموڈیٹی پھر تو بیچتے بھی' وہ تو کنویں کے اندر تھی وہاں یہ اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ یعنی قرائن یہ بتاتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے' بات یہی تھی کہ وہ پھینک کے چلے گئے انہوں نے نکالا اور لے کے چلے گئے اور وہاں جا کے مصر میں پھر انہوں نے قافلے والوں نے بیچا تھا۔ تو یہ دو دفعہ بکنے کی بات نہیں ہے ورنہ ہمارے ہاں یہی ہے کہ پہلی قیمت جو ہے وہ ایسی ہی ہے جیسے یونہی کسی نے اپنے گلے سے اتارنی ہو کوئی چیز کہ میاں لاؤ جتنے پیسے دیتے ہو دو اور پھر آگے جا کے جو بیچا ہے زلیخا کے پاس تو وہ پھر کھرے داموں انہوں نے بیچا تھا۔ اسی لئے یہ دو قیمتیں جو ہیں وہ غالب بھی جو اپنے متعلق کہتا ہے کہ

من یوسفِؑ بہ قیمتِ اول خریدہ ام

شاعر تو خوب ہوتے ہیں صاحب! ان پہ تو ادب یونہی مضامین آفرینی ہوتا ہے لیکن جب یہ چیز تورات کی رو سے آپ کی تفاسیر

میں موجود ہے تو یہ لوگ شاعری میں کیوں نہ لائیں۔ بڑی حسین چیز ہے یوسفؑ بہ قیمتِ اول خریدہ ام ہوں۔ عجیب شخص ہے ''مَن عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ام'' یہ ہے یہ بلا کا شخص' کیا باتیں کہتا چلا جا رہا ہے۔ اپنے مقام کا اندازہ لگائیے' اس باغ کے عندلیب جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا لیکن اپنے دور کے اندر جو بے قدری ہو رہی ہے' اس بے قدری کے متعلق اپنے آپ کو یہ کچھ کہنا ''من یوسفؑ بہ قیمتِ اول خریدہ ام'' میں یوسفؑ ہوں بکا ہوا ہوں اس قیمت پر جو پہلے اس کی تھی۔ دوسری قیمت بھی نہیں ہے دوسری میں تو پھر بھی وہ تو داستان ہی سہی' عشق و محبت کی رو سے ایک محبوب تو وہ خریدنے کے لئے آئی تھی لیکن ''یوسفِ بہ قیمتِ اول'' میرے بھائیوں نے مجھے بیچا ہوا ہے اور ایک جنسِ کاسد سمجھ کے لٹیروں کے ہاتھوں میں مجھے دیا ہوا ہے' ہوں میں یوسفؑ۔

قرآن حکیم کے بیان کے مطابق حضرت یوسفؑ کو قافلے والوں نے ہی بیچا تھا اور نہایت ہی سستے داموں بیچا

بہر حال بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں یہ مشہور ہے کہ پہلے بھائیوں نے بیچا پھر یہ آگے لے گئے۔ قرآن یہ نہیں کہتا۔ قرآن کہتا ہے کہ قافلے والوں نے اسے بیچا۔ اب یہ دیکھئے قرآن کا انداز' ثمن تو ہے قیمت **بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ** ۚ (12:20) یونہی چند ٹکوں کے عوض اور **بخس** کا لفظ جو ہے لوٹ کا مال ''چوراں دے مال تے ڈانگاں دے گز'' یہ ہے **بَخْسٍ**(12:20) کا ترجمہ کہ وہ مال جو لوٹ سے آیا ہوا ہو' اس مال کو جس طرح بیچا کرتے ہیں' یوں بیچا انہوں نے **بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ** ؕ(12:20) ۔ اور پھر یہ بھی بات جو ہے وہ ہماری داستان ہی ہے کہ وہ زلیخا جو تھی وہ آئی تھی خریدنے کے لئے' خواب میں اس نے دیکھا تھا اس کے عشق میں وہ بالکل مجنون ہو رہی تھی' اس نے دیکھا کہ پھر ایک دن وہ بازار میں گئی ہے تو وہ غلام وہاں سامنے کھڑا بک رہا ہے اور یہ وہی تھا جو خواب میں دیکھا تھا اور وہاں پھر اس نے وہ خریدا۔

چند سکوں کے عوض ایک جان کا سودا - مولانا غلام رسول کا ایک روح پرور شعر

آپ کو یاد ہے اس مقام پہ مجھے وہ اکثر یاد آیا کرتا ہے وہاں آ کے مولانا غلام رسول نے بھی بڑے ہی دل گداز انداز میں وہ بات بیان کی ہے اور بڑا حسین انداز ہے کہ ایک محبوب ہو جس کی مدت سے اس کو آرزو ہو' تلاش ہو' پتہ نہ ہو کہ وہ کون ہے' کہاں ہے۔ خواب میں صرف آیا ہوا ہو اور دل باختگی کا یہ عالم ہے کہ وہ دیوانہ وار پھر رہی ہے' اچانک ایک دن بازار میں جا رہی ہے' وہ دیکھ رہی ہے نفاس کے اندر جہاں غلام بکا کرتے تھے کہ وہاں سامنے ایک غلام بک رہا ہے اور یہ وہی ہے کہ جس کے عشق میں وہ دیوانہ اور فریفتہ پھر رہی ہے۔ وہاں وہ بولی ہو رہی ہے۔ اور وہاں یہ مولانا غلام رسول اپنے انداز میں لکھتے ہیں' خوب انداز ہے کہ

جس نوں یار وکیندا لبھے تے قیمت ہووس پلے

یہ مقام اللہ اکبر! یعنی کہا کہ سنئے تو سہی کہ

جس نوں یار وکیندا لبھے تے قیمت ہووس پلّے

اس دے جیڈا نہ طالعہ کوئی اس دے بھاگ سَوَلّے

''ایہدے نالوں زیادہ قسمت والا ہور کون ہوسکدا اے'' اس سے زیادہ خوش بخت کون ہوسکتا ہے کہ محبوب جس کی تلاش اتنی تھی وہ بک رہا ہے اور قیمت اس کے پاس ہے۔تو بہرحال یہ شاعری ہے جو کی گئی۔

لفظ زہد کا حقیقی مفہوم لاپرواہو جانے کا ہوتا ہے

قرآن نے یہی کہا ہے کہ وہاں انہوں نے بیچا اسے' چوری کا مال تھا''ڈانگاں دے گز جو کسے نے دتا''۔نظر آتا ہے کہ وہاں غلامی کا کاروبار اگرچہ ہوتا تھا بردہ فروشی کا لیکن بایں ہمہ چرائے ہوئے جو یہ غلام یا بچے ہوتے تھے ان کا کچھ ڈر ہوتا تھا' ایسا نظر آتا ہے ورنہ یہ چیز وہ یوں نہ کہتا قرآن کہ یوں نہ وہ پھینک دیتے اس جنسِ کاسد کو' ایسے انہوں نے بیچ دیا جلدی سے یہ کچھ کیا۔وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ (12:20) وہ کہتا ہے کچھ زیادہ دلچسپی اس میں نہیں لے رہے تھے' اپنے مال میں تو دلچسپی وہ لے رہے تھے کہ کہیں سے خریدا تھا' کہیں بیچنا تھا' حساب کرنا تھا کہ صاحب! کیا منافع اس سے ہوا' محنت بھی ہماری آئی یا نہیں' پیسے بھی چار بچے یا نہیں' اس میں تو وہ قرآن کہتا ہے کہ وہ واقعی سوچ بچار سے انسان کام لیتا ہے لیکن جو مال اس طرح سے مفت حاصل ہوا ہو اس میں ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اس کی طرف سے بالکل ہی لاپرواہ تھے' کچھ رغبت نہیں تھی۔یاد رکھئے! یہ زاھد لفظ یہاں قرآن میں آیا ہے' ہمارے ہاں تو زہد اور تقویٰ بڑی چیز ہوتی ہے' اصل میں زہد ہوتا ہے لاتعلق ہو جانا' لاپرواہ ہو جانا یہ جو دنیا اور اس کی جتنی بھی کششیں اور جاذبیتیں ہیں ان کی طرف سے جو لاپرواہ ہو جاتا ہے' بے نیاز ہو جاتا ہے' چھوڑ دیتا ہے' ترکِ آلائش کر دیتا ہے اسے زہد کہتے ہیں۔تو یہی لفظ ہے کہ وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ (12:20) کہ چونکہ اس طرح سے یہ مال ملا ہوا تھا' پیسے بھی چار اس پہ خرچ نہیں ہوئے تھے انہوں نے پھینکنا تھا اس لئے وہ اس کی طرف اتنی بھی رغبت نہیں رکھتے تھے جتنی اپنی تجارت کے مال کے مطابق رغبت رکھتے تھے۔

قرآن حکیم میں اُن تمام نفسیاتی بیماریوں کا علاج مضمر ہے کہ جس کا انسان شکار ہوسکتا ہے

دیکھئے یہ قرآن کس انداز سے گناتا چلا جاتا ہے کہ انسان کی کیفیت پھر کیا ہو جاتی ہے؟ پہلی چیز تو اس نے یہ کہی کہ غلامی میں آیا تو انسان سے وہ بِضَاعَةً (12:20) بن گیا ایک کموڈیٹی بن گیا پھر کموڈیٹی بھی ایسی بنا کہ جس کے متعلق ان کو کچھ زیادہ نہ پرواہ تھی' نہ کوئی

تعلق تھا' نہ کوئی اس کی حیثیت سمجھتے تھے۔ گلے سے اتارنے کی کوشش انہوں نے کی کہ جتنے پیسے کسی نے دئے وہ لے لئے یعنی اب اس کا یہ مقام ہوگیا جو یعقوبؑ کا اتنا چہیتا بیٹا تھا۔اس مقام سے پھر اب قرآن اٹھا رہا ہے آگے۔وَ قَالَ الَّذِی اشۡتَرٰہُ مِنۡ مِّصۡرَ لِامۡرَاَتِہٖۤ (12:21)

لفظ عزیز کے معنی احترام کے نہیں ہوتے بلکہ مقام بلند یا اقتدار کے ہوتے ہیں

اب یہاں پھر یہ اگلی بات آ گئی کہ یہ وہ عزیز مصر کی بیوی خریدنے نہیں آئی تھی یہ شاعری ہے' وہ کہا یہی ہے کہ اس شخص نے جو اس کو خریدا تو وہ اس نے جا کے اپنی بیوی سے کہا۔تو خریدنے والا خود یہ عزیز مصر تھا۔عزیز کے معنی صاحبِ مرتبہ' وزیر ہو' کوئی اتھارٹی رکھنے والا ہو' اس کے لئے یہ لفظ اس زمانے میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ عزیز جو لفظ ہے ہمارے ہاں دیکھئے گا الفاظ جو ہیں ان کے معنی' وہ چلتے چلتے راستے میں کیا سے کیا بنتے چلے جاتے ہیں۔پہلی چیز تو ہمارے ہاں عزت جو ہے وہ RESPECT کو کہتے ہیں' احترام کو کہتے ہیں۔اس کے عربی میں یہ بنیادی معنی نہیں ہیں۔ یہ ذلت کے مقابلے میں ہے' وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ (3:26) آپ دیکھتے ہیں اس کے معنی ہوتا ہے' مقامِ بلند' قوت اس کے معنی ہوتا ہے اقتدار اس کے معنی ہوتا ہے اللہ کی صفت ہے هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (3:18) تو اس کے معنی اقتدار کے ہوتے ہیں' عزت کے بنیادی معنی ہی اقتدار کے ہوتے ہیں۔اور پھر اس کے بعد عزت ہمارے ہاں یہ لفظ آیا تو اس پہلے معنی سے بالکل الگ ہوگیا یہاں صرف RESPECT رہ گیا' اقتدار نہ رہا۔اس کے بعد اگلی بات عزیز ہوئی وہ عزیز میں عزت والی بات بھی چلی گئی' یہ رشتے داروں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی اور معنی بدلے ہیں اور عزیز بھی وہ جو چھوٹا رشتہ دار جو ہوتا ہے' اسے عزیزی کہتے ہیں بزرگ کو نہیں کہتے۔یعنی جس کے بنیادی معنی اقتدار اور صاحبِ مقتدر اور قوتوں والا اور جو خدا کی ایک صفتِ عزیز ہے' وہ سمٹ سمٹا کے ''آ چھوٹا جیا' بھرا جیا بھانجا جیا' بن گیا''۔اب بھی جس کو ہم نے خاص توجہ نہ دینی ہو اسے کہتے ہیں عزیزِ من بیٹھ جاؤ'' ٹھیک ہے ایویں ای کل دا منڈا جمیا ہویا' جھنڈ دے وال تیرے ہجے گلے نیں بہہ جا''۔کہاں سے وہ عزیز چلا' ان منزلوں سے گذرتا ہوا' ہمارے ہاں کہاں آ گیا۔اب سوچئے تو اب ترجمے سے جو قرآن پڑھیں گے تو اللہ تعالیٰ کے متعلق جو عزیز آئے گا تو وہ عزیزِ من تو یہ سب میں نے اس لئے کہا ہے کہ عزیزانِ من! (پھر میں نے بھی کہا عزیزانِ من! یا اللہ میری توبہ) دیکھتے ہیں کس طرح سے یہ الفاظ غیر شعوری طور پر زبان پہ چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم میں استعمال کیے گئے حروف کی بناوٹ ان کو بنانے کا طریق اور اس لفظ کی گہرائی کی وضاحت

میں نے عرض کیا ہے کہ ترجموں سے قرآن سامنے نہیں آ سکتا یعنی عزیز آئے گا تو آپ کے ذہن میں کبھی آ ہی نہیں سکتا کہ یہ صاحبِ مقتدرت اور صاحبِ قوت اور صاحبِ غلبہ اور صاحبِ اقتدار کو کہا جاتا ہے۔تو میں نے عرض کیا قرآن سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ

کے ROOT MEANINGS جو ہیں وہاں جایئے ۔اور یہی کمال ہے عربی زبان کا صاحب! عجیب زبان ہے ROOT MEANINGS کے اندر سب کچھ اس کے پنہاں ہوتا ہے اور پھر اوپر آیئے تو یہ یونہی افراتفری میں الفاظ نہیں یونہی بن جاتے' وہ ان کا ایک سائنٹفک قاعدہ ہے' اس قاعدے کی رو سے' یہ الفاظ جو ہیں ان میں تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں' جس کو وہ باب کہتے ہیں۔اس باب کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔اس باب میں جب کوئی لفظ آتا ہے تو اس خصوصیت کے تابع بنیادی معنی ہو جاتے ہیں یعنی بنیادی معنی اس خصوصیت کے تابع ۔اندازہ لگایئے! اور پھر یہ زبان جناب! مادے میں جایئے تین حرف ہوتے ہیں اس زبان کے اندر یہ چیزیں قاعدے کی رو سے اصول کی رو سے' موجود ہیں کہ مادے میں مثلاً 'ب' اور 'د' جس مادے میں اکٹھا آئے گا اس کے معنی ابتدا کے ہو جائیں گے' پہل ہو جائے گی 'ج' اور 'س' آئے گا تو اس کے معنی یہ ہو جائیں گے۔ہزاروں کی تعداد میں یہ الفاظ آئیں گے جن میں کہیں 'ج' اور 'س' اکٹھا ہے کوئی بھی یہ لفظ لے لیجئے گا ان ہزاروں کے اندر' اس مادے میں جو انہوں نے کہا ہے کہ جہاں یہ دو حرف اکٹھے ہوں گے اس میں یہ معنی ضرور ہونگے وہ معنی ضرور ہونگے اس میں۔پھر اس کو اوپر لاتے چلے جایئے ابواب کے اندر' اس باب میں یہ معنی ہونگے' اُس باب میں یہ معنی ہونگے اس کے فعال میں یہ ہوگا فعیل میں یہ ہوگا فعول میں یہ ہوگا۔

قرآنی الفاظ کا ہماری زبان میں ترجمہ الفاظ کا حلیہ بگاڑنے کا باعث بنتا ہے

عجیب زبان ہے۔تو جس زبان کی یہ کیفیت ہو اس زبان کا ترجمہ ہمارے ہاں کی زبان میں' میں نے کہا ہے اس لفظ کا تو حلیہ بگڑ جاتا ہے ہمارے ہاں آ کر۔عزیز کے معنی یہ جو یہاں ہے کہ عزیز مصر تھا تو اس کے معنی ہیں کہ ایک صاحبِ اقتدار تھا' اس کے پاس کوئی اتھارٹی تھی' مملکت کی طرف سے بااختیار INPOWER اس نے خریدا تھا' زلیخا نے نہیں خریدا تھا' زلیخا کا تو نام ہی نہیں ہے اس بیچاری کا اس میں۔تو وہ صاحبِ اقتدار تھا جس نے وہ آ کے خریدا اور خریدنے کے بعد اس نے جا کے پھر اپنی بیوی سے کہا اَکْـرِمِـیْ (12:21) ایک لفظ ہے! غلام خرید کے لائے۔

غلامی میں حضرت یوسفؑ کو تکریم آدمیت کے ساتھ تمکن کا میسر آ جانا ایک نعمت سے کم نہ تھا

ہمارے ہاں اب حالانکہ وہ غلامی کی بات نہیں ہے لیکن گھر کے نوکر جن کو ہم کہتے ہیں' ملازم ہم کہتے ہیں' کبھی یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ان کی تکریم ہمارے دل کے اندر آ جائے چہ جائیکہ ایک غلام کی حیثیت سے خریدا ہوا غلام' وہ لے کے آ رہا ہے تو یہ معلوم تھا کہ گھر میں یہ جب میں لا رہا ہوں اور غلام ہے تو اس کی کیا درگت یہاں بنے گی' کس حیثیت سے اس کو رکھا جائے گا۔لیکن اس نے بیوی سے کہا کہ اَکْرِمِیْ مَثْوٰہُ (12:21) اس کو گھر میں عزت کا مقام دینا۔وہ اس نے تو قیافے سے اس کو پہچان لیا ہوگا کہ یہ بچہ جو ہے اور عزیزانِ

من! یہ کچھ مشکل نہیں ہے کہ یہ چیز دیکھ کے پہچان لی جائے کہ یہ اچھے گھرانے کا لڑکا ہے ہونہار' اس کی پیشانی سے یہ چیز نظر آ جاتی ہے کہ یہ کوئی عام بچہ نہیں۔ اور پھر اتنے میں کچھ باتیں بھی اس نے اس کے ساتھ کی ہونگی۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر تو اس وقت کہی جاتی ہے تو رات کی رو سے جب یہ ابھی گھر میں تھے تو بہرحال اتنے بڑے نوجوان تھے۔ تو انہوں نے باتیں بھی کی ہونگی اور انہوں نے پھر یہ دیکھ لیا ہوگا قیافے سے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ کسی بڑے گھر کا ہے اور خود بھی یہ رشد اور ہدایت کو جانتا ہے اس لئے اسے گھر میں عام نوکروں کی طرح یا غلاموں کی طرح نہ سمجھنا اسے عزت کا مقام دینا۔ عَسٰٓی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ (12:21) ہوسکتا ہے کہ ذرا اس کی اچھی تربیت ہو جائے تو ہمارے لئے بڑا ہی فائدہ مند ثابت ہو۔ اَوۡ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ (12:21) یہ ہوسکتا ہے کہ ایسا ثابت ہو جائے کہ ہم اسے بیٹا ہی بنالیں۔ گویا نظر آیا کہ اس نے پہلی نگاہ میں جو چیز بھانپی تھی اس کا قیافہ بڑا صحیح تھا۔ یہاں تک تو اس کی بات ہوگئی اور قرآن اب آگے کہتا ہے وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوۡسُفَ فِى الۡاَرۡضِ (12:21) یوں ہم نے ایک نئے ملک میں یوسفؑ کے لئے ٹکنے کا مقام بنا دیا۔ کیا بات ہے اس تمکن کی۔ یہ دیکھئے کہ جنہیں ان مقامات کے لئے چنا جاتا تھا' کن کن منازل میں سے انہیں گذرنا پڑتا تھا۔

حضرت موسیٰ کو قدم قدم پر خدائے رحیم و کریم کا مشکور ہونے کی تلقین

حضرتِ موسٰیؑ جب وہاں گئے ہیں طور پہ تو پہلی بات یہ ہوئی کہ ہم نے تمہیں اپنے ایک مقصد کے لئے' لنفسی (20:41) قرآن کہتا ہے کہ موسٰی! ہم نے تمہیں اپنی ذات کے لئے چن لیا ہے۔ حضرتِ موسٰیؑ نے کہا کہ شکریہ۔ کہنے لگے موسٰیؑ! شکریہ اتنی سی بات کا نہیں ہے آؤ تمہیں بتائیں اور پھر ایک ایک قدم قدم کے اوپر شکریے کے سجدے بجالاتے' چلے جاؤ۔

میری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیے سجدے

جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

کہنے لگے موسٰیؑ! بنی اسرائیل کی قوم میں پیدا ہوئے تھے' اہلِ فرعون کے ہاں وہ قوم ذلیل ترین قوم تھی' پہلی کڑی ہماری یہ تھی کہ ہم نے تمہیں پیدا ہونے کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کی قوم کے اندر رہنے ہی نہیں دیا اس قوم کا سب سے بڑا باعزت مقام شاہی گھرانہ جو تھا' وہاں تمہیں پہنچا دیا۔ کیوں! کہو شکریہ۔ محلاتِ شاہی میں تمہاری پرورش ہوئی' پتہ ہے کیوں ہوئی؟ تم نے بنی اسرائیل کا ایک غلام بن کے نہیں رہنا تھا' تم نے تو ٹکر لینی تھی فرعون اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ' تمہیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ یہ محلات کی سیاست ہوتی کیا ہے' وہاں یہ کچھ سکھایا تمہیں یہ کچھ پتہ بھی نہیں تھا' تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ سب کچھ سیکھا تھا' تمام مہرے وہاں کے دیکھ لئے تھے' بساطِ سیاست تمہارے سامنے آ گئی تھی ایک ایک چیز تمہارے سامنے تھی۔

حکومت وقت کے سربراہ کی ذمہ داری اور رعایا کے ساتھ روا رکھنے والا سلوک

کہو! غلام قوم کے کسی فرد کے لئے ممکن تھا یہ کہ محلات کے اندر کی سیاست سے وہ یوں واقف ہو جائے۔ ٹھیک ہے! کہو شکریہ۔ پھر تم نے غصے میں آ کے ایک آدمی کو وہاں مار دیا یہ کیفیت تمہاری' تم پہ ہاتھ ڈالنے ہی والے تھے کہ وہاں سے ہم نے تمہیں محفوظ نکال لیا' آج تک تم بظاہر بھاگے بھاگے پھرتے ہو لیکن موسیٰؑ! تم ایک مفرور اشتہاری مجرم کی طرح بھاگے نہیں پھر رہے تھے۔ محلاتِ شاہی کے اندر پلے ہوئے جو ہیں' آزادی کی فضا وہاں نصیب نہیں ہو سکتی تھی' تمہیں ہم پھر ان آزادی کی فضاؤں کے اندر لے آئے جہاں تم کسی کے محکوم نہیں تھے۔ کہا اس کے بعد ایک پوری رعیت جو تھی آگے چل کے اقتدار اتنا تمہیں ملنا تھا کہ تمہیں راعی بننا تھا۔ راعی تو گڈریے کو کہتے ہیں رعیت اس کی بھیڑیں ہوتی ہیں یہ ان کا رکھوالا ہوتا ہے۔ آپ دیکھئے تصور بھی آپ کے ہاں کیا ہے اگر حکومت کا تصور لیا جائے تو ان کا باہمی تعلق جو ہوتا ہے' وہ گڈریے اور بھیڑوں کا تعلق ہوتا ہے۔ کوئی گڈریا اپنی کسی بھیڑ کو بھیڑیے کے حوالے کر دیتا ہے؟ گڈریا آپ پیاسا رہ جائے گا اپنی بھیڑوں کو پہلے پانی پلاتا ہے' اسے نہ بھی ملے دوپہر کی روٹی تو وہ گذارہ کر لیتا ہے لیکن انہیں سب سے پہلے چراگاہ میں چھوڑتا ہے' باہر سے کوئی حملہ کرتا ہے تو اپنی جان پہ کھیل جاتا ہے اپنی بھیڑ کو گزند نہیں پہنچنے دیتا۔ یہ انداز بھی ہم نے تمہیں سکھانے تھے' بڑی ضروری چیز ہے۔

عہدِ فاروقی میں مصر کے ایک گورنر کو سزا دینے کی نوعیت

کیا بات تھی ان فاروقِ اعظمؓ کی بھی جنہیں میں نے شاہکارِ رسالت کہا ہے۔ مصر کے ایک گورنر سے جب ذرا کوتاہی ہوئی تھی نگہ پرداخت کرنے میں اپنے ہاں کی رعیت کے معاملے میں تو اسے بلا لیا تھا۔ پتہ ہے انہیں بلانے کے بعد (آپ کہہ لیجئے سزا) سزا کیا دی تھی؟ انہوںؓ نے کہا تھا کہ یہ لیجئے یہ سو بھیڑیں ہیں ان کو دو مہینے تک چرائیے باہر جا کر' تمہیں پھر معلوم ہو کہ ایک راعی کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں۔ ''جاؤ بھیڑیں چراؤ جا کے'' یہ سزا تھی یا تربیت تھی' قرآن کی تعلیم نے اور رسول اللہ ﷺ کی تربیت نے انہیں کیا بنا دیا تھا۔ یہ سزا دی جا رہی ہے اس گورنر کو کہ جاؤ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ یہ چیخ اٹھے دس دن کے اندر' کہنے لگے نہیں! ذرا اور' کہنے لگے صاحب! مصیبت تو یہ ہے یہاں کی وہ سو بھیڑیں ہیں' وہ کم بخت ایک ادھر نکل جاتی ہے' بھاگ بھاگ کے پکڑ کے لاتا ہوں' دوسری ادھر جاتی ہے۔ کہا کہ یہی کیفیت افرادِ معاشرہ کی ہوتی ہے' یہ کوئی پتھر کے بت نہیں جو تمہیں دیدئے کہ جو جی میں آئے ان سے کہتے جائیے' وہ سامنے سے کچھ کہہ نہ سکیں۔ یہ زندہ اور پائندہ انسان ہیں جو تمہارے سپرد کئے ہیں۔ معاشرے کے انسانوں کی کیفیت یہی ہوگی کوئی ادھر نکل جائے گا' کوئی اُدھر نکل جائے گا لیکن گڈریا ادھر نکل جانے والی بھیڑ کی ٹانگ تو نہیں توڑتا۔ اسے راستے پہ لاتا ہے' لٹھ اس کی بھیڑیے

کے لئے ہوتی ہے بھیڑ کے لئے نہیں ہوتی ''من مارنا پیندا ہیگا اے بھیڈاں چران واسطے''۔عزیزانِ من! یہ مقام تھا ان کا جو راعی ہوتے تھے یہ حکومت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔تو حضرتِ موسٰیؑ کو پھر یہ بھیڑیں دیں کہنے لگے اتنے برس تک بھیڑیں چرائیں۔اب یہ سوچو کہ ایک طرف شاہی محلوں کی سیاست' اس کی بساط وہ ساری کی ساری وہاں سکھائی گئی' دوسری طرف آزادی کی فضاؤں کے اندر یہ بتایا گیا' فرعون تو یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَ هُمۡ (28:4) تھا'' ذبح کرتا تھا ان کو کہ جن میں ذرا سرفرازی دیکھتا تھا' یہاں بھیڑیں چرانی ہیں بھیڑ کو تو کوئی راعی ذبح نہیں کرتا تھا۔اسے چرانا ہے' ان کی پرورش کرنی ہوتی تھی۔اور اس کے بعد ہے کہ یا موسٰیؑ! اس کے بعد تم ہمارے معیار پہ جب پورے اترے تو آج ہم تمہارے ذمے یہ فریضہ لگا رہے ہیں۔ان مقامات سے گذرے ہو موسٰیؑ! کہو کسی ایک مقام پہ شکریہ ادا کر رہے ہو' قدم قدم پہ شکریہ ادا کرنا ہوگا۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ یونہی بات نہیں تھی کہ بادشاہ مر گیا' بادشاہ کوئی تھا نہیں' انہوں نے کیا کریں؟ انہوں نے کہا کہ صاحب! کل صبح سب سے پہلے جو دروازے میں داخل ہو جائے اس کے سر پہ تاج رکھو۔تاجِ نبوت یوں نہیں رکھا جاتا تھا' قرآن نے وہاں لفظ استعمال کیا ہے فَتَنّٰکَ (20:40) ان کٹھالیوں میں سے موسٰیؑ تمہیں گذارا' جب جا کے کندن بنے ہو۔لفظ کٹھالی ہے۔معلوم نہیں مشیت کا پروگرام کن کن کٹھالیوں میں سے ان کو گذارتا تھا اور پھر اتنا عظیم پروگرام انقلاب کا ان کے سپرد کرتا تھا۔یونہی تھوڑا ہوتا تھا کہ وَاللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ (2:105) کے معنی یہ ہوئے کہ صاحب! اللہ جس کو چاہتا ہے تاجِ نبوت سے سرفراز کر دیتا ہے۔اور پھر ہمارے ہاں یہ بات چڑھ گئی شاعروں کے ہتھے میں

خدا کی دین کا موسٰیؑ سے پوچھئے
آگ لینے کو جائیں' پیمبری مل جائے

مملکت کی سربراہی کے اسرار و رموز جاننے کے لیے حضرت موسٰیؑ کو فرعون کے محلات میں رکھا گیا

لو! قرآن کہتا ہے جس دن پیدا ہوئے تھے اس دن تمہیں تیار کرنا شروع کیا تھا' موسٰیؑ تمہیں کٹھالیوں میں سے گذارا تھا جب جا کر ہمارے معیار پہ تم پورے اترے تھے' ہماری کسوٹی کے اوپر پرکھا تمہارے اس سونے کو' کندن ہو گیا ہوا تھا۔تو میں نے کہا تھا کہ یہ کچھ پروگرام ہوتے ہیں ان کے متعلق جن سے اتنا بڑا انقلابی کام لینا ہوتا ہے' یہ یونہی بات نہیں ہے کہ صاحب! نبی بنا دیا۔یہاں یہ یوسفؑ' نبی کے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے' ان سے بھی بہت بڑا عظیم کام لینا تھا۔اب وہاں موسٰیؑ کو غلام قوم میں سے نکال کے پہلے یہاں پہنچایا پھر وہاں پہنچایا۔حضرتِ یوسفؑ یہاں سے یہ جو باہر کی جنگل کی زندگی تھی ان کے ہاں کی صحرائی زندگی تھی' اس زندگی سے ان کو مصر کے محلات میں پہنچایا' یہ ٹریننگ یوں ہو گئی ہے۔اللہ تعالٰی کے لئے کیا مشکل ہے کہ یونہی یہاں سے اٹھا کے مصر کے محل میں پہنچا دیتے ان کے

گھر کے اندر' لیکن نہیں! انسانوں کی دنیا میں وہ تو اسی پروگرام سے سب کچھ کرتا ہے جو انسانوں کا پروگرام ہوتا ہے۔ یوسفؑ کا باہر بھیجا جانا' بھائیوں کی یہ سازش' قافلے والوں کا اس کو ایک بضاعت کی طرح لے جانا' بازار میں جا کے بیچنا' خریدنے والا یہ' جسے ہم کہیں گے اتفاق سے وہ لے گیا ہے اور گھر میں جا کے بیوی سے کہتا ہے کہ اسے عزت کا مقام دینا' اس کی پیشانی میں ہمیں بڑا درخشندہ مستقبل نظر آ رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارے لئے بڑا سودمند ثابت ہو' یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنالیں۔ **وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ** (12:21) یوں ہم نے یوسفؑ کے لئے موقع بہم پہنچا دیا تمکن فی الارض کے لئے موقع' یہ اس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ **وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ** (12:21) تاکہ یہاں پہنچ کے پھر یہ پختگی پیدا کریں ان کے اندر۔

مملکت کی سربراہی کے لیے تاویل الاحادیث کی اہمیت

وہ جو میں نے تاویل الاحادیث کہ ذرا سی بات سامنے آئے اور مآل تک پہنچ جائے' فوراً ایک سیکنڈ میں وہاں نگاہ پہنچ جائے کہ اچھا! یہ بات جو یہاں یوں قدم اٹھا ہے' آخر میں اس کا نتیجہ یہ نکلنے والا ہے۔ اور صاحب! ایک انقلابی شخصیت کے لئے یہ بڑی ضروری چیز ہے اور پھر جس نے اتنی بڑی سیاست ہاتھ میں لینی ہو' تاویل الاحادیث بڑی ضروری چیز ہے۔ یہ جتنے بڑے لوگ دنیا کے اندر یا تاریخ میں آپ کو نظر آتے ہیں ان کی کیفیت وہی جو میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا اقبالؒ کے اس لفظ میں ''خارے دید و احوالِ چمن گفت'' کہ کانٹے کو دیکھے اور پورے گلستاں کی کیفیت آپ کے سامنے رکھ دے۔ یہی لوگ کامیاب ہوسکتے تھے تاویل الاحادیث۔ **وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ** (12:21) خدا اپنے پروگرام کو کامیاب کر کے رہتا ہے' وہ غالب ہوتا ہے اپنے پروگرام کے اوپر' یہ راستے کی جو منزلیں آتی ہیں' اس میں لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ صاحب! یہ یہاں کیا ہو گیا' یہاں شکست ہو رہی ہے' رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے جا رہے ہیں' غار میں چھپے ہوئے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ صاحب! خدا اپنے رسولوں کو غالب کرے گا اور ہم اور ہمارے رسول غالب آ کے رہیں گے' اچھے غالب آ کے رہے ہیں' آدھی رات کو جان بچا کے (معاذ اللہ ان کے الفاظ میں) بھاگے جا رہے ہیں' غاروں میں چھپ رہے ہیں' ماریں پڑ رہی ہیں' لہولہان ہو رہے ہیں' گالیاں پڑ رہی ہیں' پتھر پڑ رہے ہیں اور کہا یہ جا رہا ہے کہ ہم اور ہمارے رسول غالب آ کے رہیں گے' کہا یہ اچھا غلبہ آ رہا ہے۔ **وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ** (12:21) اکثر الناس' سب کی بات نہیں کہی لوگوں کی اکثریت ایسی ہوتی ہے کہ وہ جو واقعہ سامنے آتا ہے' فوری کسی نتیجے پہ پہنچتے ہیں۔ بات اصل میں تاویل الاحادیث کی ہونی چاہئے۔ وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو پھر یہ پہچانتے ہیں کہ نہیں! یہ کڑیاں جو ہیں اس طرح سے' اس سونے کے کھوٹ کو جو پگھلایا جا رہا ہے تو مقصد اس کا مائع بنانا نہیں ہے' سیال بنانا نہیں ہے بلکہ اس کو کسی دوسرے سانچے میں ڈھالنا ہے' وہ یہ جانتے ہیں۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (12:21) وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ (12:22) بڑی عمر کا ہوا۔اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ (12:22) تو وہاں اب تربیت ایسی ہوئی ہے حضرتِ یوسفؑ کی' غلام بن کر یہاں آئے ہیں اس سے پہلے بھی یونہی صحرانشینی کی زندگی تھی تو یہاں آ کے پھر یہ تمام چیزیں علم اور حُکم یعنی یہ حکومت کے اسرارِ نہاں اور علم یہ تمام چیزیں یہاں ان کو سکھائی گئیں ان مقامات کے اوپر وہ پختہ ہوئے۔ اور پھر یہاں وہی بات آ گئی کہ ہاں صاحب! کچھ خدا کا پروگرام تھا تو اس کے لئے وہ کچھ' یہ کڑیاں خدا کر رہا تھا اور آگے خود یہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ایک ذہنی الجھن کا ازالہ

عزیزانِ من! قرآن ہے سوال میرے آپ کے دل میں یہ پیدا ہوگا' وہ تو قیامت تک کے دلوں کے خیالات کو جاننے والا ہے۔ اٰتینٰہ یہاں کہا تھا کہ ہم نے اسے حکومت کے رازہائے سربستہ اور علم کے یہ تمام حقائق' یہ تمام وہاں کے آداب ہم نے اس کو عطا کر دئے۔ تو ذہن میں آیا کہ صاحب! پھر یہ تو خدا جس کو عطا کرتا ہے' اس کو ہی مل ملا جاتا ہے۔ ہم آپ تو یہ کچھ کر نہیں سکتے' خدا کے پروگرام تھے۔ کہا وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ(12:22) یونہی نہیں یہ مل جاتا یہ جو بھی حسن کارانہ انداز سے متوازن زندگی بسر کرتا ہے' یہ اس کا نتیجہ ہوتا ہے یہ جو ہم نے کیا ہے۔اور پھر یہ اسی کے ساتھ نہیں ہوا وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ(12:22) جمع کا صیغہ ہے جو بھی اس طرح سے زندگی بسر کرے گا یہ انداز اس کے ہونگے اس کو یہ چیزیں مل جائیں گے۔اب اٰتینٰہ کی تفسیر یہاں خود آ گئی۔

حضرت یوسفؑ کی داستان میں ترغیباتِ نفس کے صبر آزما مراحل اور عزیز کی بیوی کی دل باختگی کا ذکر

اب اگلی کڑی ہمارے سامنے آتی ہے اس اگلی کڑی کا ایک لفظ جو تھا' میں اس کو دیکھنے کے لئے میں ''جوئے نور'' دیکھ رہا تھا۔آپ کو معلوم ہے یہ میری کتاب ہے جس میں میں نے انبیائے کرامؑ کی داستانوں کو مسلسل بیان کیا ہے' تین چار جلدوں میں' پہلی جلد ہے ''جوئے نور'' حضرتِ نوحؑ سے لے کر حضرتِ شعیبؑ تک' پھر ''برقِ طور'' ہے حضرتِ موسٰیؑ کی' پھر ''شعلۂ مستور'' ہے حضرتِ عیسٰیؑ کا اور پھر ''معراجِ انسانیت'' ہے اس ذاتِ اشرف واقدس ﷺ کی جو واقعی انسانیت کی معراجِ کبریٰ کے اوپر فائز ہے نبی اکرم ﷺ کی سیرت۔تو یہ ''جوئے نور'' اس میں حضرتِ یوسفؑ کا قصہ آتا ہے۔آگے جو بات آتی ہے' یہ آ رہی ہے حضرتِ یوسفؑ اور اس عزیزِ مصر کی بیوی کی داستان' بات تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں نے جوئے نور میں یہاں پہنچنے کے بعد جس انداز سے اسے لکھا تھا ان الفاظ کو ذرا آپ کے سامنے پڑھ دوں' مجھے بھی اس میں کچھ تھوڑی سی کیفیت ملی تھی' آپ کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے لکھا ہے کہ اب اس زریں داستاں کی اگلی کڑی شروع ہوتی ہے اور کاروانِ شوق اس وادی میں داخل ہوتا ہے جہاں سیرت و کردار کی

آزمائش کے لئے ترغیباتِ نفس کے صبر آزما اور نگاہ فریب مناظر' سامانِ صد بہار بداماں کئے' دامِ ہم رنگِ زمیں کی طرح' چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ حضرتِ یوسفؑ کی عمر اس وقت بھرپور جوانی کی تھی۔ پھر رگوں میں خانوادۂ نبوتؑ کا صالح خون' ان تمام خصوصیات کے ساتھ حسنِ عفت سونے پر سہاگہ۔ تندرست جوانی اگر قلب ونگاہ کی پاکیزگی میں گذرے تو اس سے بڑا حسن اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہ تھے حضرتِ یوسفؑ۔ دوسری طرف عزیز کی بیوی تہذیب وتمدن کی بیباکیوں کی تخلیق' عشرت وکامرانی کے ماحول کی پروردہ' دولت کی مرفع الحالیوں سے جگمگاتا حسن۔ غرضیکہ دونوں طرف جذب وکشش کے پورے پورے سامان لیکن ایک طرف جذباتِ نفس کی مکمل حکمرانی اور دوسری طرف ترغیباتِ نفس پر حدود اللہ کی حکمرانی۔ نتیجہ یہ کہ حضرتِ یوسفؑ کا خیال کبھی بھولے سے بھی اُدھر نہ گیا لیکن عزیز کی بیوی کی دل باختگی آتشِ خاموش کی طرح سلگتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن جوشِ فریفتگی نے شعلۂ بے باک کی صورت اختیار کرلی۔ حضرتِ یوسفؑ کمرے کے اندر تھے وہ دست طرازیوں کا فتنۂ مجسمہ' ہزاروں بجلیاں اپنے سامنے نگاہ میں لئے وہاں آ پہنچی' دروازے بند کرلئے اور ہزار نیاز مندیوں کے ساتھ ایک نگہۂ التفات کی ملتجی ہوئی۔ قرآن کے الفاظ میں **وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ** (12:23) ایک لفظ ہے رَاوَدَتْــهُ (12:23) یہ عربی زبان میں ارادے کا مادہ یہی ہے 'رود' ارادہ کرنا ہوتا ہے کسی چیز کا' وہ تو ہم جانتے ہیں۔ خود ترغیبِ نفس پھر قصر پھر اس کے حصول کے لئے دل کے اندر ایک آرزو کا ابھرنا یہ ساری چیزیں ارادہ میں آتی ہیں۔ اسی مادہ سے ان کے ہاں ان کے قاعدے کے مطابق مراودت آتا ہے جہاں سے یہ لفظ رَاوَدَتْــهُ (12:23) آیا ہے۔ مراودت کے معنی ہیں کسی کو اس کے ارادے سے پھیرنا۔ یعنی یہ ہے زبان اس کے لئے کسی لمبے چوڑے فقرے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اسی ارادہ سے اس نے اسی مادے سے وہ جو دوسرا اس نے باب لیا ہے وہ لفظ استعمال کیا ہے اور ساری بات کہہ گیا ہے۔ یوسفؑ کو اس میں اس کے ارادے سے پھیرنا چاہتی تھی۔

حضرت یوسفؑ کی طرف سے بلندی کردار کا مظاہرہ اور لفظ تعوذ کا مفہوم

اب دیکھئے کہ داستاں کی تفصیل کتنی سمٹ کے آ گئی ایک لفظ کے اندر۔ اب یوسفؑ کا اپنا ارادہ بھی نظر آ گیا کہ وہ عفت وعصمت کو اپنی نگاہ میں رکھنا چاہتا تھا اس نے اسے پھیرنا چاہا' اُسؑ کی طرف سے کوئی ترغیب کی بات نہیں ہوئی ارادہ وہاں نہیں آیا ہے' اس نے اُسے اسؑ کے ارادے سے پھیرنا چاہا۔ تو پتہ چلا کہ پہلے اس کو معلوم بھی ہوگیا تھا کہ اس کا ارادہ کیا ہے' اس کا ارادہ پاکباز رہنے کا ہے' اسی سے پھیرنا چاہا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن آپ دیکھئے کہ کس طرح ایک لفظ کے اندر کتنی باتیں کہہ جاتا ہے۔ اور یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ یہ یکا یک پہلے ہی دن یہ بات نہیں ہوجاتی' پہلے کچھ اور انداز سے کسی اور طریق سے یہ سارا کچھ وہ کرتی ہوگی' ہر بار اسے یہ پتہ چلتا ہوگا کہ یہ ادھر آنے کا نہیں ہے۔ یہ نہیں ادھر آتا بالآخر وہ جو کلائمکس پہ پہنچتا ہے تو اس میں ایک لفظ قرآن بتاتا ہے کہ آخر اس نے طے کرلیا

کہ اسے اس کے ارادے سے آج پھیر کے رہوں گی۔ یہ ہوا جی بات۔ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ (12:23) دروازے اس نے اندر سے بند کر دئے۔ وہ جو میں نے کہا تھا کہ درمیان میں یہ بیچ میں داستان کے GAP چھوڑتا ہے اور اس میں کہتا ہے کہ خود FILL-UP کیا کرو' ایمائیت' اس ایک لفظ کے اندر کتنی بڑی داستانیں چھپ کے آ گئیں کہ آج اس نے طے کر لیا کہ اب دیکھو! میں اس کو اس کے اس ارادے سے پھیر کے رہوں گی۔ دروازہ بند کر لیا وَ قَالَتْ هَيْتَ لَكَ ط (12:23) کہا کہ ادھر آ وَ۔ اب یہاں انداز وہی نظر آتا ہے جیسا کہ ماسٹر غلام سے کہتا ہے ادھر آ وَ۔ وہاں یہ لفظ کہے گئے ہیں جواب ملتا ہے قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ط (12:23) میں تمہاری اس تمام جتنی بھی تمہاری سازش ہے' اس سے خدا کے قانون کی پناہ میں آ جانا چاہتا ہوں۔ عزیزانِ من! یہ روز جو **اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم** 'بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہہ جاتے ہیں کبھی نہیں سوچتے اس کے معنی کیا ہیں؟ تعوذ کے معنی کیا ہیں' عوذ کا بنیادی معنی کیا ہے؟ یہ عرب اس لفظ کو استعمال کرتے تھے یہ مرغی اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو یا یہ بکریاں گائیں اپنے بچوں کو' یہ مرغی اس کو لئے لئے پھرتی ہے اِدھر اُدھر' کہیں چیل کا سایہ بھی یہ نظر آتا ہے کہ جس انداز سے یہ بچے اس کے نیچے سمٹ کے آ کے بیٹھ جاتے ہیں اس کی حفاظت میں اسے عوذ اور تعوذ کہتے ہیں۔ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم یہ جو میرے اندر اس قسم کے خیالات ابھرنے شروع ہوئے ہیں یہ مجھے دور لے جائیں گے صحیح راستے سے اس کے لئے میں خدا کے قانون کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔ یہ ہے ان کے ہاں کا تعوذ۔ یہیں سے ہمارے ہاں پھر تعویذ کا لفظ لے لیا ''تعویذ ایتھوں ای ہوندا اے' گل کتھوں تر دی اے تے مکدی اے کتھے جا کے''۔ تعویذ میں بھی حفاظت کا سامان ہوتا ہے۔ دوکان کے باہر وہ انہوں نے لیا اور یاسین کی وہ چرخڑیاں بنائیں اور اس کو انہوں نے باہر کیل سے ٹھونک دیا بس ٹھیک ہے اب حفاظت کا سامان ہو گیا' کس سے؟ وہ جو چھاپہ مارنے والے آیا کرتے ہیں اس سے۔ وہاں سے تعویذ ہوا۔ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ (12:23) پناہ کہاں ڈھونڈ رہا ہے' نظر آیا کہ بظاہر آپ دیکھئے کہ جو کچھ یہ ہو رہا تھا' عام حالات میں یہاں سے بچنے کی کوئی صورت اب نظر نہیں آتی' کوئی پناہ کی جگہ نظر نہیں دکھائی دیتی تھی' سامان جتنے بھی مادی تھے ان میں تو کوئی سامان نظر نہیں آتا تھا۔ بے ساختہ زبان پہ آیا ہے کہ میں تیرے ہی سایۂ رحمت کے اندر پناہ ڈھونڈ رہا ہوں ورنہ یہاں تو حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی اور پناہ گاہ نظر نہیں آتی۔

حضرت یوسفؑ کی طرف سے احسان فراموشی کے الفاظ خدائے علیم وخبیر کے لیے تھے

یہ پناہ ملی تو کہاں ملی۔ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ط (12:23) کہا کہ اور احسانات تو اس کے ایک طرف رہے وہ میرا نشو ونما دینے والا' جس نے یہ مقام مجھے عطا کیا ہے' اس کی تو احسان فراموشی ہو گی اگر میں پھسل جاؤں۔ کیا بات یاد آ رہی ہے! احسن کو دیکھا کیا انداز

ہے اس کے اندر کہ یہ تو اور سب چیزیں چھوڑیے‘ یہ تو بڑی احسان فراموشی ہے۔ اسی لئے ہمارے ہاں کے بعض مفکرین نے کہا ہے کہ ربی سے مراد یہاں وہ اس کا خاوند تھا یعنی ان کا آقا کہ انہوں نے میری پرورش کی ہے‘ یہ اس کے خلاف بددیانتی ہو جائے گی۔ لیکن عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے یہ تو بڑی چھوٹے درجے کی بات ہے کہ اس نے میرے آقا نے‘ میرے مالک نے مجھے پالا پوسا اور یہ اس کے خلاف غداری ہو جائے گی‘ اس کی بیوی پہ ہاتھ ڈال دیا۔ معاذ اللہ بتا رہا ہے کہ کس بلند مقام کے اوپر یہ بات کہی ہے بے ساختہ اِنَّـهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ط اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (12:23) خود یہ بتا رہا ہے کہ انہ فاعل وہاں کیا ہے‘ وہ نہیں ہے اس کا خاوند۔ کہا پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس حسن کارانہ انداز سے جو میں نے زندگی بسر کی‘ تو اس کے یہ نتائج اس نے مجھے دئے اور دوسری طرف میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو پھر اس مقام سے گر جاتا ہے‘ پھر وہ پنپ نہیں سکتا۔ دونوں چیزیں میرے سامنے ہیں۔ دیکھا آپ نے منفی اور مثبت دونوں چیزیں لا الہ اور الا اللہ دونوں آ جاتی ہیں کہ اگر اس مقام سے گر جاؤں تو پھر کہیں پناہ نہیں اور اگر میں اس کے اوپر ثابت قدم رہوں تو میں تو دیکھ چکا ہوں‘ ذاتی تجربہ کر چکا ہوں کہ کس طرح کس بلند مقام کے اوپر اس نے مجھے پہنچا دیا۔

عزیز کی بیوی کی طرف سے شدت جذبات کا اظہار

آگے ایک بات آتی ہے وہ آیت وہاں بعض رونے والوں کے لیے ہے۔ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ج وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ط (12:24) هَمَّ ہوتا ہے ایک شدت کے ساتھ ارادہ کر لینا۔ ارادہ تو صرف ابھرنے والا خیال ہوتا ہے یہ اس سے اگلی منزل ہوتی ہے۔ هَمَّتْ بِهٖ (12:24) یہ تعریف کا صیغہ آ گیا وہ عورت پھر اور آگے بڑھی جوش میں‘ بڑھ گئی‘ شدتِ جوش سے کوئی چیز جو کرنے کی ہوتی ہے اس کے لئے یہ هَمَّ (12:24) آتا ہے لفظ۔ وَ هَمَّ بِهَا (12:24) یہ الفاظ ہیں آ گئے‘ وہی لفظ هما‘ اس میں بھی یہ چیز یعنی میں یہ بتا رہا ہوں ہمارے ہاں اس کی کیا تفصیل آ جاتی ہے اس میں بھی یہ چیز کر دی تو یہ چیز تو اصل بات تو اس دل کے ارادے کی ہوتی ہے اس جوش کی ہوتی ہے‘ جذبات کا غلو ہو جاتا ہے پیدا‘ وہاں بھی یہ ہوا یہاں بھی یہ ہوا۔ معاف رکھئے بیٹیاں بیٹھی ہیں۔ اصلی اختلاطِ جنسی جس کو یہ آگے چل کے بات تھی وہ تو اس سارے واقعے میں ہوا ہی نہیں تھا۔ جرم اگر ہوا تھا تو پھر جرم تو زلیخا سے بھی سرزد نہیں ہوا۔ هَمَّتْ (12:24) تو یہ والی بات یہاں تک اس نے کی۔

لفظ هَمَّ بِهَا (12:24) کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات

هَمَّ بِهَا (12:24) آگے یوسفؑ کی طرف یہ لے آئے یہ ہمارے ہاں اس کے معنی کئے جاتے ہیں اس نے بھی یہ کیا‘ اس نے بھی یہ کیا‘ پھر؟ کہ جی! پھر جب یہ (میں کیا عرض کروں) کہ تیار ہی ہو گئے۔ بعض تفاسیر میں لکھا ہوا ہے کہ جس طرح سے یہ میاں بیوی گویا

بیٹھتے ہیں بستر پہ اس کیفیت تک پھر یہ پہنچ گئے تو اس وقت انہوں نے دیکھا کہ حضرتِ یعقوبؑ سامنے کھڑے ہیں اور وہ انگلی سے ان کو اشارہ کر رہے ہیں تو وہاں سے یہ بات آئی۔ عزیزانِ من! کیا عرض کیا جائے کیا چیزیں ہیں' جو باہر جاتی ہیں۔ کوئی دوسرے صاحب اٹھے انہوں نے کہا کہ انہوں نے زلیخا سے پوچھا کہ وہ ایک کونے کے اندر کس چیز کے اوپر تم نے پردہ ڈالا ہوا ہے' اس نے کہا کہ وہ میرا بت ہے جس کی میں پرستش کرتی ہوں' انہوںؑ نے کہا کہ تو نے یہ پردہ کیوں ڈالا' کہنے لگی کہ میں نہیں چاہتی کہ اس قسم کا جو فعل ہے اس کے سامنے ہو تو اس سے حضرتِ یوسفؑ نے کہا کہ اوہو! یہ اپنے بت کے سامنے یہ کچھ نہیں چاہتی تو میرا خدا تو سب کچھ دیکھنے والا ہے تو میں اس کے سامنے یہ کس طرح کروں۔ یعنی یہ چلتی ہیں پھر تفسیریں اسی طرح سے۔

اسی آیت کا دوسرا حصہ جس نے بات کو واضح کر دیا

اور آپ کو پتہ ہے کہ یہ سارا کچھ ہو کیوں رہا ہے؟ یہ آیت ابھی آدھی پڑھی ہے اگلے لفظ نہیں پڑھے' عزیزانِ من! سنئے وہاں ہی پڑی ہوئی ہے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے وَ لَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ ۚ (12:24) وہ تو اس جوش میں ارادہ کر چکی اور کر گئی اور آگے ہے وَ هَمَّ بِهَا لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ ؕ (12:24) اس کے سامنے اگر خدا کی اقدار اور قوانین نہ ہوتیں تو یہ بھی یہ کر گذرتا۔ صاحب! یہ لَوۡ لَا (12:24) یہاں رکھا ہوا ہے۔ کیا قرآن کا انداز ہے! یعنی یہاں اب دو باتیں آ گئیں' عام حالات میں یہ جذبات ابھرتے ہیں' ہر ایک کے دل میں ابھرتے ہیں۔ ٹھیک ہے حالات ہی ایسے ہوئے ہوئے تھے کہ کوئی اور ہوتا۔ اب سوال ہوا کہ ان حالات میں وہ کونسی چیز ہے کہ جو انسان کو روک کے رکھتی ہے' کیا ہوا کہ وہ هَمَّتۡ بِهٖ (12:24) والی جو تھی اس کے لئے یہ نہیں کہا ہے آگے' کیونکہ اس کے سامنے یہ بات نہیں تھی' کونسی چیز تھی جس نے اس کو یوسفؑ کو روک دیا بُرۡهَانَ رَبِّهٖ دلیل' کھلی ہوئی دلیل' واضح اقدار' واضح قانونِ خداوندی اگر اس کے سامنے یہ نہ ہوتا تو یہ بھی وہی کچھ کرتا جو وہ کر رہی تھی۔ یہ ہیں صاحب! معنی اسی آیت کے اندر۔ اور پھر یہ تو میں نے کہا اسی آیت کی بات ہے۔

ہمارے ہاں کی متضاد سوچ

اسی سورۃ کے اندر اسی داستان میں اگر دو چار آیتیں یا دس بیس آیتیں بھی آگے چلے جاتے اور میں کہتا ہوں آگے جانے کی ضرورت نہیں تھی' یہ ایک ہی سانس میں پہلی آیت میں قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ (12:23) جو وہ کہہ رہا ہے تو یہ ایک طرف سے معاذ اللہ بھی کہہ رہے ہیں اِنَّهٗ رَبِّیۡۤ اَحۡسَنَ مَثۡوَایَ (12:23) کہہ رہے ہیں اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ (12:23) بھی کہہ رہے ہیں اور هَمَّ بِهَا (12:24) بھی ہو رہا ہے پھر!! اوبابا!

عدالت کے اندر حضرت یوسفؑ کی پاک دامنی کی شہادت خود عزیز کی بیوی کی زبانی

ذرا چند سطریں آگے چل کے دیکھو آگے چل کے اسی سورۃ میں ہے وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ (12:32) خود یہ کہہ رہی ہے یہ عزیز کی بیوی جسے آپ زلیخا کہتے ہیں' بات آگے پیش ہو رہی ہے آگے آئے گی بات' اپنی سہیلیوں کے سامنے یہ بات کر رہی ہے کہ تم جو مجھے یہ طعن دے رہی ہو کہ یہ بھی تم سے کام نہیں ہوتا' اس نے کہا میں کروں کیا اس کا' کیفیت یہ ہے کہ میں نے تو اسے پھیرنا چاہا تھا اس کے ارادے سے' میں نے تو بڑی کوشش کی تھی فَاسْتَعْصَمَ ط (12:32) اس نے تو اپنی عصمت کو اس طرح محفوظ رکھا' قابو ہی نہیں آیا۔ یعنی وہ جو مقابل میں دوسرا فریق ہے وہ یہاں شہادت دے رہا ہے فَاسْتَعْصَمَ ط (12:32)۔ اندازہ لگائیے! وہ یہ کہہ رہی ہے۔ اور آگے چل کے جب یہ مقدمہ پھر پیش ہوا تھا' فرعون عزیز مصر کے سامنے' ساری داستان دہرائی گئی۔ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ (12:51) آپ دیکھئے! وہی راودتہ کا لفظ چلا آ رہا ہے ساری داستان میں۔ اس نے پوچھا زلیخا سے کہ اب سچ سچ بتاؤ کہ جب تم نے ارادہ کر لیا تھا اس کو اس کے ارادے سے پھیرنے کے لئے اور اس دن وہ کمرے کے اندر ساری کوشش کر دیکھی تھی کہو کیا ہوا تھا' سچ سچ بتا۔ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ط (12:51) خدا شاہد ہے میں اب سچ کہتی ہوں کوئی برائی کا خیال اس کے دل میں نہیں آیا۔ وہ یہ بیان کر رہی ہے۔ تو اسی داستان میں یہ ساری چیزیں بیان ہو رہی ہیں۔

عصمت کی پابندی انسان کو بلندیوں سے ہم کنار کر دیتی ہے

عزیزانِ من! میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ نہ بھی ہوتیں' خدا کا ایک پیغمبر داستان آگے ساری بیان اس لئے ہو رہی ہے' نقطۂ ماسکہ یہ ہے اس ساری داستانِ حضرتِ یوسفؑ کا جیسے میں نے شروع میں کہا تھا قرآن کہتا ہے یہ کہ یہ جو عصمت ہے اگر اس کی پابندی رکھی جائے' اس کو محفوظ رکھا جائے تو انسان کی سیرت ان بلندیوں کے اوپر پہنچ جاتی ہے جو ہم داستانِ حضرتِ یوسفؑ میں تمہیں بتا رہے ہیں۔ کہا یہ گیا ہے۔ اور عزیزانِ من! اگر هَمَّ بِهَا (12:24) والی بات آ جائے تو وہ تو ختم ہو جاتی ہے عصمت والی بات' آگے تو یونہی ایک PHYSICAL ACTION باقی رہ جاتا ہے۔ کیوں کہا تھا خدا نے کہ یاد رکھو! ہم تمہارے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانتوں سے بھی واقف ہیں۔

جنسی جذبات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی تعلیم

نگاہ کی خیانت' دل میں گذرنے والے خیالات یہ کچھ جرم بن سکتے ہیں تو اس نے کہا ہے کہ ہم تو یہ کچھ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ وہ بھی ایسا' اس کے دل میں بھی یہ جوش مار جاتے جذبات لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ط (12:24) اگر اس کے سامنے یہ اقدارِ خداوندی نہ

ہوتیں تو عام حالات میں یہ ایک تقاضائے بشریت ہے یہ ہو جاتا ہے۔ اور اسی لئے جو میں بار بار کہا کرتا ہوں قرآنِ کریم کی تو تعلیم عجیب ہے وہ ان جذبات کو معیوب قرار نہیں دیتا یہ تو نہایت ضروری ہیں۔ جنسی جذبات جو ہیں افزائشِ نسل کے لئے نہایت ضروری چیز ہے یہ تو سلسلہ اسی طرح سے آگے چلتا ہے' اس کی تسکین بھی ضروری ہے اس کے لئے۔ اس کے لئے قرآن نے حدود مقرر کئے ہیں۔ ان حدود کے مطابق ان جذبات کی تسکین کی جائے' نہ صرف یہ کہ معیوب نہیں بلکہ یہ فطرت کے پروگرام کی تکمیل کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جذبات معیوب چیز نہیں ہیں' سوال صرف یہ ہے کہ ان کی تسکین کس طرح سے کی جاتی ہے۔ بے باکیوں کے ساتھ حیوانات کی طرح یا حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے۔ اور یہ ہے وہ قرآنی تعلیم کا مابہ الامتیاز۔

مذہب کی دنیا میں جذبات کی نفس کشی کا عمل

مذہب کی دنیا کے اندر جذبات کو ہی نہایت معیوب قرار دیا جاتا ہے نفس کشی سب سے بڑا مرحلہ' تزکیہ نفس' نفس کو مار دینا' یعنی ان جذبات کو فنا کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ یہ لوگ کبھی سوچتے نہیں' بتایا ہمیں جاتا ہے کہ یہ مغزِ دین ہے یہ بلندیوں پہ پہنچے ہوئے مقامات کے اوپر لوگ ہیں جہاں سے یہ چیزیں لاتے ہیں: نفس کشی ہو رہی ہے' جذبات کو مار رہے ہیں یعنی خدا جذبات کو پیدا کر رہا ہے یہ مارتے چلے جا رہے ہیں ''دوہاں اچ جنگ ہون ڈئی اے کردا جا پیدا' اوجیویں برسات اچ مچھراں نوں تے کیڑیاں نوں مارن واسطے ڈی ڈی ٹی پوڈر ماردے ترے جانا آں تے باہر ہوندا ہیگا او چھپڑ لگا ہویا او تھے مچھر پیدا ہوندا تریا جاندا ہیگا اسی ڈی ڈی ٹی پوندے ترے جاندے آں''۔

ادھر آ پیارے ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

خدا جذبات پیدا کرتا چلا جاتا ہے' یہ مارتے چلے جاتے ہیں اس کو' اور یہ کبھی مر بھی سکتے ہیں؟ وہ ٹھیک کہا تھا اس نے اور آج کی سائیکولوجی اس کی تائید کرتی ہے کہ

پری رو تاب مستوری نہ دارند

یہ جو نمودِ حسن کے جذبات ہوتے ہیں دل کے اندر ان کو چھپا کے نہیں تم رکھ سکتے

تو در بندی ز روزن سر برارند

راستہ بند کر دو تو روشن دان سے سر نکالتے ہیں۔

احکاماتِ خداوندی کے برعکس جذبات کی تسکین Pervertion بدنہادی کہلاتی ہے

یہ روشن دان وہ چیز ہے جسے PERVERTION کہتے ہیں سائیکولوجی میں' اگر فطرت کے صحیح طریقوں سے ان کی صحیح تسکین

نہ کی جائے تو پھر یہ PERVERTION (بدنہادی) ہوتی ہے زروزن سربرارند۔ آپ نفس کو مار نہیں سکتے۔ قرآنِ کریم کیا کہتا ہے؟ وَ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ (28:50) اس سے زیادہ گمراہ نہیں بلکہ ضائع ہو جانے والا' اس سے زیادہ تباہ ہونے والا اور کون ہو سکتا ہے جو اپنے جذبات کے پیچھے چلے۔ تو چلئے صاحب! جو میں کہہ رہا تھا اس کی تردید ہو رہی ہے اس سے زیادہ اور کون ضائع ہو جانے والا تباہ ہو جانے والا گمراہ ہے لیکن عزیزانِ من! آیت کا ابھی کو ما بھی نہیں آیا جو میں نے چھوڑ دیا وَ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيۡرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50) خدا کی راہنمائی کے بغیر جو اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اس سے زیادہ تباہ ہونے والا کیا ہے۔ تو گویا هدًى من الله کے تابع جو ان سے کام لینا ہے' یہ ہے اصل چیز ان حدود کے اندر رہنا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ابلیس کو مسلمان کرنا ہوگا

اور وہ جو میں نبی اکرم ﷺ کی چمکتی ہوئی حدیث کہا کرتا ہوں وہ عجیب چیز ہے کہ یہ ابلیس اور یہ شیطان جن کو ہم کہتے ہیں' یہ شیطان کے یہ حیوانی INSTINCT کے جذبات ہیں جو ابھرتے ہیں یقیناً انسان کی پیدائش کا تقاضا ہے اس کے اندر ہوتے ہیں' ابھرتی ہے یہ چیز' میں نے کہا ہے کہ مارے تو جا نہیں سکتے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص کا ایک ابلیس ہوتا ہے اس کے ساتھ' آپ ﷺ نے جب کہا کہ ہر شخص کا تو صحابہؓ میں سے کسی نے پوچھ لیا کہ حضور ﷺ کیا آپ کا بھی ابلیس ہے' یہ تو تصور میں نہیں آ سکتا کہ حضور ﷺ کا بھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میرا بھی ابلیس ہے' کہنے لگے جی! پھر آپ ﷺ نے کیا کیا ہے؟ کہنے لگے میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیا ہے۔ عزیزانِ من! میں کہتا ہوں یہ ایسا ٹکڑا ہے یہ وہی ذاتِ گرامی ﷺ کہہ سکتی تھی۔ یہ سب کہیں گے اس کو مار دینا ہے' لگے ہوئے ہیں اس کے پیچھے' وہ تو مر ہی نہیں سکتا۔ یعنی یہ انسانی جذبات آپ سوچئے تو سہی سوال ہی نہیں کہ ان کو آپ مار دیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا قرآنِ کریم یہ بتاتا ہے کہ انسانی جذبات جو ہیں بِغَيۡرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50) اگر ان کے پیچھے چلا جائے تو پھر تباہ کرنے والی بات ہے۔ ہدایتِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو دنیا میں ساری کارفرمائیاں جتنی ہیں یہ تو جذبات کا نتیجہ ہیں ان کو ختم کر دیجئے انسان اس کے بعد مٹی کا مادھو بن کے بیٹھ جائے گا۔

هَمَّ بِهَا (12:24) کی عملی تفسیر اور اس کا نتیجہ اور ابلیس و آدم کے قصے کی عملی شکل

یہ ہے وہ چیز کہ هَمَّ بِهَا (12:24) وہ بھی یہ بیبا کی کر گذرتا اگر اس کے سامنے یہ نہ ہوتا کہ یہ تو ہدایتِ خداوندی کے تابع کرنا ہے اس سے بیباک ہو کے نہیں کرنا' لہٰذا کچھ نہیں کیا۔ كَذٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَ الۡفَحۡشَآءَ ؕ (12:24) یوں اس کو ہم نے بدی اور برائی کی ہر چیز سے بچا لیا۔ قرآن یہاں بھی کہہ رہا ہے اور اگلی بات یہ ہے اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ (12:24) وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا' وہ اس کے قابو آ سکتا تھا شیطان کے؟ اور یہ جو میں نے کہا ہے ''شیطان کے قابو'' قرآن میں یہ ہے وہ جو داستان

ہے وہ آدم کی اور ابلیس کی اور خدا کے ساتھ مکالمے اور وہاں پھر یہ ابلیس سے یہ کہا گیا کہ جاؤ تم اگر اپنی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کرتے اعتراف نہیں کرتے اس لیے تمہاری اصلاح نہیں ہوسکتی۔ وہاں وہ چیلنج دیتا ہے کہ بہت اچھا! اس کی وجہ سے مجھے یہاں ذلیل کیا جارہا ہے بھیجئے اس کو' اتنی سی شرط یہ ہے کہ میرا ٹینٹوا نہ جناب دبا دیجئے گا' مہلت مجھے دیجئے گا اور پھر دیکھئے گا میں اس کے ساتھ کرتا کیا ہوں۔ کہا کہ اچھی بات ہے ''اسی کوئی رعی نئیں کردے ایس کھیڈاچ'' جب تک یہ آدم ہے اس وقت تک تم بھی وہاں رہو گے۔ اس نے کہا کہ اب دیکھو وہ جو محاورہ ہے تگنی کی ناچ نچاتا ہوں' اس کے لئے وہاں قرآن نے جو لفظ استعمال کیا ہے' وہ بڑا ہی عجیب ہے۔

خدائی قانون کی عمل داری کے بغیر اچھا بھلا انسان شیطان کے ہاتھوں ٹٹو بن کر رہ جاتا ہے

آپ کو پتہ ہے وہ میں بتایا کرتا ہوں وہ ایک تو وہ گھوڑے کی سواری ہوتی ہے باقاعدہ لگام اس کو دے کے اور اوپر بیٹھ کے اور یوں کھینچ کے اور وہ جو گاؤں کے لڑکے ہوتے ہیں کسی کا ٹٹوان کے قابو آجاتا ہے تو اس کے بعد ''اومنج دی رسی لینے نیں تے اوہدی تھوتھنی تے بنھ دیندے نیں'' یہ جو ہوتا ہے کبھی اسے کہتے ہیں وہ اس نے وہاں کہا ہے کہ جی بہت اچھا! یہ جو ذاتِ شریف جن کو اتنا معزز بنایا ان کو ذرا بھیجئے ''تسی دیکھنا کہ اوہنوں میں کبھی دے کے کس طراں ٹپونا ہیگاں'' یہ لفظ ہے قرآن کا کبھی۔ وہاں کہا ہے خدا نے یہ ٹھیک ہے لیکن میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں ہوسکتا۔ اور یہاں کہا اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (12:24) اس پہ تو وہ قابو کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے یہ وہ جو چیز تھی وہ ہمارے ہاں جو تفسیر آرہی تھی وہ ساری ذہنِ انسانی کی پیدا کردہ چیزیں ہیں۔ بات تو ساری یہاں یہ آرہی ہے کہ اس طرح سے یوسفؑ نے ان حالات میں اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔

حفاظت عصمت کا سارا دارومدار قوانین خداوندی کو ملحوظِ خاطر رکھنے کی داستان ہے

عزیزانِ من! وہ حفاظتِ عصمت جو ہے وہ PHYSICAL ACTION کا سوال نہیں ہے' دل کے اندر یہ خیال پیدا نہ ہو' ارادے میں یہ بات کہیں نہ آئے' جذبات جو ہیں ان کے متعلق طے ہو کہ ان کی تسکین کا سامان صرف حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے' اس کی تسکین کرنی ہے۔ اس سے باہر نہیں کرنی ہے۔ یہ ہے مخلص بندوں کی نشانی' یہ ہے کہ شیطان کا ان کے اوپر غلبہ یا قابو نہیں آسکتا کہ وہ اپنے دلوں کے اوپر نگاہ رکھتے ہیں۔ یہ تھی کیفیت۔ اس لئے یوسفؑ اس سے بچ گیا۔ اور آگے تو پھر اس کی تصدیق بھی ہوگئی کہ ہوا کیا تھا' ہوا کیا تھا یہ آئندہ درس پہ ہم اٹھا رکھتے ہیں کیونکہ آج وقت ہوگیا ہے۔ ہم سورۃ یوسف کی 24 ویں آیت تک آگئے 25 ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

تیسرا باب: **سورۃ یوسف** (آیات 25 تا 35)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1974ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ یوسف کی 25ویں آیت سے ہوتا ہے (12:25)۔

معاشرتی سطح پر پھیلی ہوئی فحاشی کا شافی علاج

جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا سورۂ یوسف میں یہ داستانِ حضرتِ یوسفؑ مسلسل بیان کی گئی ہے۔ پچھلے درس میں آخری آیت میں جو چیز ہمارے سامنے آئی تھی وہ چونکہ بڑی اہم ہے اس لئے میں اس کے ایک ضروری نقطے کا اعادہ کئے دیتا ہوں، وہ نہایت ضروری ہے۔ عام طور پہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اخلاقی برائیاں بڑی عام ہو رہی ہیں اور ان میں خاص طور پہ فواحش تو اس طرح سے ہمارے ہاں پھیلے ہیں کہ جس طرح

سے وبائی امراض کے جراثیم فضا میں عام ہو جاتے ہیں کہ وہ ہر سانس لینے والے کے اندر از خود چلے جا رہے ہوتے ہیں کچھ اس طرح سے یہ چیزیں عام ہو رہی ہیں۔ وہ جو برسات کی پہلی بارش ہوا کرتی ہے تو اس بارش میں اس شہر کے گلی کوچوں، صحن، چھتوں کی تمام غلاظتیں جتنی بھی ان میں گندگیاں ہوتی ہیں وہ ساری اس کے ساتھ بہہ کے اکٹھی ہو کے، آگے جاتی ہیں، وہ گویا سیلاب آ جاتا ہے غلاظتوں کا۔ یہ اس مغرب کی کم بخت تہذیب کا جو پہلا ریلا دوسری قوموں میں جاتا ہے وہ اسی طرح سے برسات کی پہلی بارش کے سیلاب کی سی کیفیت اس کی ہوتی ہے وہ ساری گندگی وہاں کی جو ہے، ایک طوفان کی طغیانیوں کی شکل میں دوسری قوموں کے اندر چلی جاتی ہے۔ تو ایسے نظر آتا ہے جیسے وہ قومیں کچھ بے بس ہو کے رہ جاتی ہیں۔ یہ تو خیر بات دوسری ہے۔ بے بسی تو اپنی ہوتی ہے خارج سے کہیں کوئی چیز نہیں آتی۔ لیکن ہوتا ایسا ہی ہے جیسا آج کل ہمارے ہاں ہو رہا ہے کہ وہ پہلا سیلاب آیا ہوا ہے اور ہر طرف آپ کو یہ بے حیائیوں اور فواحش کی غلاظتیں سیلاب کی طرح امڈے چلی آ رہی نظر آتی ہیں۔ لوگ مایوس ہو جاتے ہیں کہ صاحب! اس کو روکنے کا ذریعہ کیا ہے، کیسے رک سکتا ہے؟ قرآن نے دو لفظوں میں یہ بات بتائی کہ رک کیسے سکتا ہے۔ جس کلائمکس پہ پچھلی دو تین آیات میں بات پہنچی تھی، میں سمجھتا ہوں کہ فواحش کے پروگرام میں وہ CRISIS تھا انتہائی شدت کا نقطہ جسے کہتے ہیں۔ بند کمرہ، کوئی دیکھنے والا نہیں، عزیز مصر کی بیوی صاحبِ اقتدار بھی اور بہر حال جوانیوں اور رعنائیوں اور برنائیوں کا ایک مجسمہ بھی، وہ وہاں اپنے نوکر کو آمادہ کر رہی ہے ایک برائی کی طرف۔ پھر سوچ لیجئے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں، وہ جو دیکھنے والی گھر کی مالکہ ہے، وہی یہ سارا کچھ کر رہی ہے اس کے خلاف۔ قصہ جنسیات کا ہے کہ جس کی کیفیت عام طور پہ یہ کہہ کے کہی جاتی ہے کہ صاحب! یہ ایسا ایک طبعی فعل ہے اس کے اوپر تو کنٹرول ہی نہیں ہوتا، اتنی شدت ہوتی ہے۔ عام طور پہ دیکھا بھی جاتا ہے، پاگل ہو جاتے ہیں اس جذبے کے اشتعال کی وجہ سے لوگ۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے یہ داستان خاص طور پہ اس مقصد کے لئے اس تسلسل اور اس جاذبیت سے بیان کی ہے کہ یہ بات سامنے آ جائے کہ جسے تم انسانی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری سمجھتے ہو، وہ کمزوری نہیں رہتی۔ وہ تو کمزوری اپنے اندر کی کمزوری ہوتی ہے۔ میں پھر عرض کروں کہ یہ بات یہ ہوئی کہ کوئی دیکھنے والا نہیں۔ یہ بڑی چیز ہے پکڑنے والا تو ایک طرف، دیکھنے والا نہیں، جو گھر میں دیکھنے والی ہے وہی اس چیز کے اوپر آمادہ ہی نہیں کر رہی، دراز دستی کر رہی ہے، زبردستی کر رہی ہے یہ کیفیت ہے۔ تو ایک طرف تو بے باکیوں کا یہ عالم ہے دوسری طرف سے یہ کیفیت کہ وہؑ اس کا خیال تک بھی دل کے اندر نہیں لاتے۔

اخلاقی کمزوری کی بنیادی وجہ اور اس کا سدِّ باب

اب یہ چیز ہمارے ہاں تو بڑی مشکل یہ ہے کہ جب بھی کبھی اس قسم کی اخلاقی چیزیں آتی ہیں، ذہن میں آتا ہے کہ جی! وہ تو اللہ کے

رسول تھے‘ خدا کے پیغمبر تھے‘ ان کا کیا کہنا ہے ’’اسی تے بندے بشر ہوئے‘‘ تو گویا یہ رسول جو چند آتے تھے بس یہ چیزیں تو ان کے لئے ممکن تھیں پھر اس رسول کی تعلیم وہ بھی رسولوں ہی کے لئے ہونی چاہئے پھر اس رسول کا اپنا اُسوہ جو ہے کہ وہ یہ کر کے دکھاتا ہے‘ وہ بھی انہی کے لئے ہونا چاہئے رسولوں کے لئے زیادہ سے زیادہ سے یہ کہتے ہیں جی! وہ صحابۂ کبارؓ تھے تو گویا وہاں قصہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد پھر یہ خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت‘ یہ تلاوت کے لئے رہ گئی‘ یہ ثواب کے لئے رہ گئی‘ یہ مردوں کو بخشوانے کے لئے رہ گئی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتیں جتنی ان کی ہیں‘ وہ سیرتیں ان کے لئے کہ وہ کتنے بلند مقام پہ تھے سبحان اللہ صاحب! کیا بات ہے!!! ایسے مقام کی‘ ان کی بلندیٔ مقام پہ تذکرے کے لئے رہ گئیں۔ اس کے بعد ہمارا کوئی تعلق نہ رہا‘ نہ اس تعلیم سے‘ نہ اس سیرت سے کیونکہ جب یہ کہا جائے کہ صاحب! ان کی کیا بات ہے وہ تو خدا کے رسول ہوئے اور باقی رہ گئے یہ بندے بشر اور رسول اب پھر آنا ہی نہیں ہے قیامت تک کے لئے‘ تو اب قیامت تک کے لئے بندے بشر جتنے بھی ہیں وہ سارے معذور و مجبور و مقہور۔

حضرت یوسفؑ کے سامنے اقدارِ خداوندی کی اہمیت اور قرآن حکیم کا ارشاد اور ذکرِ خدا کا مفہوم

کیا چیز تھی کہ جس نے روک دیا‘ وہ کیوں ہم کہتے ہیں کہ وہ صرف ایک رسول کے لئے مخصوص تھی؟ کہا یہی ہے کہ لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (12:24) ایسے جذبات کی شدت میں بھی کہا گیا کہ اگر اس کے سامنے خدا کی دی ہوئی یہ قدر اور یہ دلیل اور یہ برہان نہ ہوتی تو وہ بھی وہی کچھ کر گذرتا کہ جو وہ کچھ کر رہی تھی۔ تو یہاں بات تو اتنی سی کہی ہے: قانونِ خداوندی کا سامنے آ جانا۔ اب یہاں سے وہ بات صاف ہوئی جو قرآنِ کریم بار بار تاکید کرتا ہے‘ ذکرِ ربی کا۔ میں نے کہا ہے بدبختیاں قوموں پہ ایک ہی طرف سے نہیں آیا کرتیں۔ یہاں سے ہم نکلے کہ صاحب! وہ تو رسول تھے ان کا کیا کہنا ہے۔ کہا یہ تھا وہ کہتا ہے خدا کہ انہوں نے خدا کے اس قانون کو یاد کیا‘ سامنے لائے اور اس سے وہ فوری رک گئے۔ تو گویا یہ قانونِ خداوندی کا ہر وقت سامنے رکھنا یا ایسے شدت کے موقع پر ذہن کو فوراً اس طرف لے جانا کہ نہیں! حدود اللہ یہ ہیں‘ خدا کے فرمان یہ ہیں‘ وہ اقدارِ خداوندی یہ ہیں‘ قوانینِ الٰہیہ کا تقاضا یہ ہے‘ یہ چیز جو ہے اس کی یادداشت یہی ہے جو کچھ یہاں کہا گیا ہے اس کے لئے وہ لفظ قرآن نے ذکر کہا ہوا ہے اور اس شدت سے کہا ہوا ہے کہ وہ ہر وقت زندگی میں اس چیز کو سامنے رکھو۔ وہ ذکر تھا قوانینِ خداوندی کا ہر وقت سامنے رکھنا‘ ہر سانس میں سامنے رکھنا۔

ہمارے ہاں مساجد میں ذکرِ خداوندی کی محفلیں اور قلب کی ضربیں

اب وہ رات کو عشاء کی نمازوں کے بعد آپ دیکھتے ہیں ہر مسجد میں عام ہونا شروع ہو گیا ہے وہ ’’اللہ ھو اللہ ھو‘‘ ذکر ہو رہا ہے۔ اخبارات میں یہ اشتہارات عام ہو رہے ہیں‘ اعلانات ہو رہے ہیں کہ فلاں مسجد میں‘ فلاں حضرت صاحب ذکرِ خداوندی کی محفل برپا

کریں گے یعنی ذکر کی ایک محفل اور اس کے اندر ذکر یہ کہ وہ جو ہے وہ ایک تو وہ قلب کی ضربیں' وہ ایک ذکر ہوتا ہے۔ وہ تو پھر کہیں گئے' بار بار اپنا لے آ رہا ہے' ساری عمر کا قلب کا مریض رہا ان ضربوں کی وجہ سے' وہ سانپ تو نکل گیا اس کی لکیریں ساری عمر پیٹنی پڑتی ہیں۔ اور پھر یہ ''اللہ ہو اللہ ہو''۔

ہمارے ہاں تسبیح کے استعمال کا انداز

وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ ذکرِ خداوندی ہے یاد رکھو! جو تمہیں روک سکتا ہے جیسا کہ یوسفؑ کو روکا تھا۔ وہ ذکر جو تھا اس کا مفہوم یہ رہ گیا خدا کا نام لئے چلے جانا' وہاں محفلوں کے اندر اس انداز سے لئے چلے جاؤ اور زیادہ تقویٰ شعار جو ہیں تسبیحات میں لئے چلے جاؤ' وہ چل رہا ہے صاحب! باتیں کر رہے ہیں ساری دنیا داری کی اور وہ ہمارے بہت سے دوست جو باہر ہو کے آئے ہیں وہ تو کہتے ہیں کہ بعض عرب ممالک کے اندر تو یہ چیز فیشن کی ہے جیسا ہمارے ہاں ہاتھ میں چھڑی رکھا کرتے تھے وہ ہاتھ میں تسبیح رکھتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ سودے سمگلنگ کے ہو رہے ہیں' تسبیح کا دانہ ساتھ چل رہا ہے۔ یہاں بھی ہیں وہ ایسے حضرات۔ کہا جائے کہ صاحب! آپ تو باتیں ہمارے ساتھ کر رہے ہیں اور یہ اس کے بعد تسبیح؟ وہ کہتے ہیں جی! یہ ہمارا قلب چل رہا ہے۔ ذکر کا مفہوم یہ آ گیا آپ کے ہاں: نام لیتے چلے جایئے تسبیح کے دانوں کے اوپر کہ یہ کچھ شمار ساتھ اس کے ہوتا ہے۔

ذکر خدا کا اور روٹی خیرات کی

عزیزانِ من! اگر اللہ کا نام لینا' یہ کہنا اور اس کی تعداد جو ہے اتنی زیادہ بڑھے' یہ ذکرِ خداوندی ہے' صبح ہی صبح یہاں سے وہ فقیر شروع ہوتا ہے دے جا اللہ کے نام پہ' دے جا اللہ کے نام پہ۔ رات کے بارہ بجے تک اس کی آواز آتی ہے' سب سے بڑا ذاکر یہ ہے۔ ذکرِ خداوندی ہو رہا ہے اور روٹی مانگ رہا ہے خدا واسطے کی' خیرات کی۔ کیا یہی مفہوم ہے قرآن کا جو قرآن نے یہ کہا ہے کہ ذکرِ خداوندی سے یہ روک پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ جو پھر آدھی آدھی رات تک ذکرِ ظاہری ہوتا ہے' ھو اور ھو سے ہوتا ہے وہ' اس کے بعد پھر دن میں ان کو دیکھئے تو سہی ان کے اخلاق و کردار اور ان کے معاملات کو' کیا واقعی وہ ان چیزوں سے رکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر ذکرِ خداوندی نے یہ کرنا تھا تو یہاں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے الٹ ہو رہا ہے۔ وہ کیا ہوا ہمارے ہاں؟ بس ایک ذکر کا لفظ جو تھا اس کے معنی ہوئے اردو میں کہ اس کا اکثر ذکر کرتا رہا ہوں' وہ ذکر کرنا' اردو کے اندر یہی ہوتا ہے کہ اس کا نام لیتے رہو' یادِ خداوندی پھر آ گیا اس کا دوسرا ترجمہ' یاد یہی چیز ہے کہ خدا کا نام لیتے رہو' ذکر خدا کا نام کچھ خفی کچھ ظاہری اور اس سے کہا کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے ہم یہ کرتے ہیں۔

رسول اپنی زندگی بشری حیثیت سے گزارتا ہے اور اس کا اختیار وارادہ سلب نہیں کیا جاتا

قرآن نے کہا یہاں یہ ہے کہ وہ یوسفؑ بھی یہ کر گذرتا۔ اب یہاں جو ہے کہ ''وہ بھی کر گذرتا'' نظر آیا کہ یہاں رسول ہونا اور نہ ہونا جو ہے یہاں تک کوئی اس کا فرق نہیں پڑا ہے' ایک بشری حیثیت ہے۔ ''کر گذرتا' وہ بشری حیثیت ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ وہ جسے ہم رسول کہتے ہیں وہ خدا کی طرف سے مجبور کر دیا جاتا ہے اس چیز پہ کہ وہ نیکوکاری کی زندگی بسر کرے' اپنے اختیار وارادے سے یہ نہیں کرتا۔ ہمارے ذہن میں تو کچھ ایسا ہی ہے جب ہم کہتے ہیں کہ رسول معصوم ہوتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں خدا کی طرف سے اسے معصوم بنا دیا جاتا ہے وہ یہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ تو کونسی یہ خوبی ہوئی یہ صاحب! کسی چیز کی۔ معاف رکھئے گا اگر یہ صورت ہے کہ خدا کی طرف سے وہ ایسا بنا دیا جاتا ہے کہ وہ کوئی چیز گناہ کی کر ہی نہیں سکتا تو آپ کریڈٹ دیں گے بکری کو کہ صاحب! میں نے تو کبھی کاٹا ہی نہیں شیر کی طرح کسی کو' بہت معصوم' غلط چیزیں ہیں بڑے غلط تصورات ہیں۔ رسول بھی ان جذبات کے اعتبار سے بشری حیثیت رکھتا ہے اس کی سیرت کی پاکیزگی اس کے اپنے فیصلے کا نتیجہ ہوتی ہے' اپنے کریکٹر کا نتیجہ ہوتی ہے' اپنے اخلاق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خدا کے جو وہ اقدار اور قوانین جو اس پہ وحی کے ذریعے آتے ہیں' بس یہ ہے کہ ان سے پہلے مل جاتے ہیں دوسرے لوگوں کو اس کی وساطت سے' بعد میں ملتے ہیں۔ دونوں کے سامنے یکساں طور پہ ہوتے ہیں۔

حضرت یوسف کے متعلق خدا علیم کا ارشاد

ذکرِ خداوندی یہ ہے کہ ایسے وقت میں جب جذبات کی شدت کا کچھ تقاضا اور ہو' فوراً یہ چیز یاد آ جائے کہ نہیں! میرے خدا نے اس کے متعلق یہ کہا ہے' یہ ہے وہ ایمان خدا کی ان اقدار پر اور ان قوانین پر کہ ایسے وقت میں جب وہ سامنے آئیں تو پھر وہ یوسفؑ کی سی کیفیت پیدا ہو جائے۔ آگے جو کہا ہے اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ (12:24) ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔ تو اب یہ اخلاص جو ہے بندوں میں سے یہ بھی رسولوں کے لئے مختص ہو کے رہ گیا' آگے نہیں جائے گا۔ میں نے جو کہا تھا پچھلی دفعہ کہ ابلیس نے چیلنج دیا تھا خدا سے کہ بھیج دو ابنِ آدم کو دنیا میں اور پھر دیکھ کہ میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں' تو خدا نے یہ کہا تھا جواب میں کہ یہ ٹھیک ہے' جتنے جی چاہے تو اپنے حربے آزما کے دیکھ لے' میرے مخلص بندے جو ہوں گے ان پہ تیرا کوئی کسی قسم کا اثر نہیں ہوگا۔ تو یہ صرف رسولوں کے متعلق تو نہیں کہا گیا تھا اور خدا نے تو کہا ہے قیامت تک کے لئے تو سیدھی سی بات ہے اور دلیل کو آگے بڑھانا ہے تو ختمِ نبوت ﷺ کے بعد تو رسولوں کا سوال ہی نہیں تو اب یہ کونسے مخلص بندے ہیں جن کے اوپر ابلیسی دست درازیوں کا کوئی اثر ہی نہیں ہوگا' وہ محفوظ رہیں گے ان چیزوں سے۔ یہ ہر انسان کے لئے ہے یہ خدا کی ہدایت ہے خدا کے قوانین ہیں' ان کے ذکر کے معنی یہ ہیں کہ ایسے وقت میں کہ جب ذرا سے بھی

جذبات غالب آنے لگیں فوراً خدا کی ایک قدر' اس کا ایک قانون' اس کا فرمان' اس کا ارشاد' اس کی حدود سامنے آ جائیں اور سامنے آنے کے معنی پھر یہ ہیں کہ اس کے بعد پھر آدمی فوراً رک جائے۔

کیا برہانِ ربی صرف حضرت یوسفؑ کے لیے ہی تھا

ان عادی مجرموں کے علاوہ کہ جو بہرحال اب جو جرم میں اتنے آگے چلے جاتے ہیں' وہ بات اور ہو جاتی ہے ورنہ عام طور پہ یہ جرم جو ہوتے ہیں یہ چور راتوں کو کیوں چوری کرتے ہیں' یا کہئے کرتے تھے اب تو بہرحال دن اور رات کا فرق ہی نہیں رہا' اتنا عام ہو گیا ہے یہ جو کچھ بھی ہے' راتوں کی تنہائیوں میں کیوں کرتے تھے' ننگے پاؤں کیوں آتے تھے' بدن پہ سیاہی مل کے کیوں آتے تھے' اندھیرے میں کیوں آتے تھے' کیا بات تھی؟ کوئی دیکھ نہ لے اتنی سی چیز ہے۔ اس کمرے کے اندر تو کوئی دیکھنے والا نہیں تھا جہاں یوسفؑ تھا اور وہ گھر کی مالکہ تھی' وہی مجبور کر رہی تھی۔ کیا چیز ہے جس نے روک دیا؟ لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ ؕ (12:24)۔ تو یہ برہانِ رب صرف یوسفؑ کے لئے تو نہیں تھا' کیا آج ہمارے ساتھ برہانِ رب نہیں ہے؟ پورا قرآن برہانِ ربی ہے' یہ چیزیں ہمارے سامنے نہیں آتیں؟ آتی ہیں اسی طرح سے' ہم کیوں نہیں رکتے؟ اس لئے کہ ہم نے ان کا مطلب ہی کچھ اور سمجھ رکھا ہے۔ وہ جو میں نے کہا ہے کہ وہ چور کسی کے سامنے کیوں نہیں چوری کرتا تھا' ذرا سا کھٹکا بھی ہو جاتا تھا تو اپنی جان پہ کھیل جاتا تھا' تین تین منزلوں کے مکانوں سے کود کے نیچے گر کے جان دے دیتے تھے کہ کوئی دیکھ نہ لے' کیا بات تھی؟ اس کے سامنے فوراً آ جاتی تھی تعزیراتِ پاکستان کی وہ دفعات کہ اس کے تابع اگر پکڑا گیا تو اس کے بعد یہ ہوگا اور یہ جیل ہوگی۔ یہ ہے ذکرِ ربی۔ لیکن جب یہ تعزیراتِ پاکستان' یہ پولیس یہ گرفت' یہ محکمے فیصلے کرنے والے' وہ سارے کے سارے ہی مجرموں کی صف کے اندر آ جائیں تو پھر دن اور رات کی تمیز کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ یوسفؑ کا بند کمرہ تو ایک طرف سرِ راہے جو شاہراہوں پہ ہمارے ہاں ہو رہا ہے' پھر وہ شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھنے والے کا ڈر ختم ہوا' گرفت کا وہ جو خدشہ تھا وہ نکل گیا۔

خدا مجھے دیکھ رہا ہے پر ایمان' بدنگاہی اور خیانت کے لیے ڈھال کا کام دیتا ہے

اس دیکھنے والے نے تو کہا تھا کہ میں دل کے ارادوں اور نگاہ کی خیانتوں تک سے واقف ہوں اور جرم کی تو ابتدا ہی دل کے ارادے اور نگاہ کی خیانت سے ہوتی ہے۔ ارادہ دل میں نہ آنے دیجئے' نگاہ کو خائن نہ ہونے دیجئے' آپ دیکھئے گا کہ کوئی جرم آپ نہیں کر سکیں گے۔ عزیزانِ من! اس کی تو بنیاد دل کا ارادہ اور نگاہ کی خیانت ہے۔ کیا چیز اس کو روکے گی؟ برہانِ ربی روک سکتی ہے اور وہ قیامت تک کے لئے ہے۔ وحی ماننے والے اور نہ ماننے والوں میں تو فرق ہی اتنا ہے کہ ایسے وقت میں' جب دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی' وحی

ماننے والا جو ہے اس کے سامنے خدا کی وحی آ جاتی ہے۔ نہ ماننے والے کے سامنے دنیا کی یہ مشینری جو ہے جرائم کی اور تعزیرات کی صرف وہ مشینری ہوتی ہے۔ اور یہ مشینری دل کے ارادوں تک تو پہنچ ہی نہیں سکتی یہ تو جب تک وہ جرم کا مرتکب نہ ہو جائے' مجرم وہ قرار ہی نہیں پاتا۔

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین دل کے اندر گزرنے والے خیالات کی گرفت نہیں کر سکتے

آپ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہو' ملنے کے لئے دوست آ گیا۔ سامنے آپ کے بیٹھا ہے نہایت اچھا قلم آپ کے سامنے رکھا ہے اور اس کے دل میں یہ آئے کہ یہ ذرا اٹھ کے کہیں اندر جائے اور یہ قلم جو ہے میری جیب کے اندر آ جائے۔ آپ سے باتیں کر رہا ہے' سارا وقت اس انتظار میں بیٹھا ہے شومئی قسمت آپ اٹھ کے نہیں گئے اور وہ ہاتھ ملتا ہوا' افسوس کرتا ہوا' لعنتیں بھیجتا ہوا تمہارے اوپر کہ کم بخت اس کی بھی کیفیت یہ ہے کہ مہمان کا اتنا بھی خیال نہیں کیا اور اٹھ کے چلے آئے' دنیا کا کوئی قانون اسے مجرم نہیں قرار دیتا۔ سرقہ کا جرم تو اس وقت ہوگا جب یہ اس شے کو چرا کے جیب میں لے جائے اور پھر باہر جا کے پکڑا جائے لیکن برہانِ ربی یا ذکرِ ربی جسے کہتے ہیں' جسے کہتے ہیں قلب چلتا ہے عزیزانِ من! اس کے یہ ہیں کہ دل میں ارادہ تک نہیں آنے پاتا جرم کا جب خدا کا ذکر سامنے آتا ہے۔ قلب کے چلنے کے یہ معنی ہیں اسے ذکرِ خفی کہا جائے گا کہ انسان کے اپنے خیالات کے اندر یہ اتنا رچا بسا ہوا ہو یہ ذکر کہ ارادہ تک بھی نہ اس کے خلاف جانے پائے یہ ہے ذکرِ خفی اور ذکرِ جلی۔ اسی لئے جب قرآن نے فحشاء کے متعلق کہا ہے کہ فحش سے بچو ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَ بَاطِنَهُ (6:120) ۔ عزیزانِ من! اس کے ظواہر سے تو بچا جا سکتا ہے' ذرا آسانی ہوتی ہے' پولیس کا ڈر نہ سہی' معاشرے کا ہی سہی' وہ تو چیز ظواہر میں آ جاتی ہے لیکن یہ جو دل کے اندر ارادہ آنے والی بات ہے اس کو تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا' سامنے بیٹھا ہوا آپ کا دوست نہیں پہچان رہا تھا کہ اس کے دل میں اس وقت یہ ہے۔ اور اگلی بات تو پھر وہ ایک قدم ہی اور رہ جاتی ہے۔ دل میں سارے خیالات آپ کے ہاں ہوں تو پھر یہ ہے کہ باہر کے حالات جب آپ کو موقع بہم پہنچا دیں ویسا کرنے کا' بس اس کے بعد پھر کوئی دقت ہی نہیں رہتی۔ یہ ہے دل کے اندر ذکرِ خداوندی۔ عزیزانِ من! یہ ہے یہ چیز جو آپ کو روک دیتی ہے۔ یہ آپ کے ہاں کے باہر کی مشینریاں جو ہیں جرائم سے باز رکھنے کی' انصاف کو نافذ کرنے کی میں نے عرض کیا ہے' ان لوگوں کے لئے ہیں جو قانون شکنی پہ اتر آتے ہیں۔ اب تو خیر سارے اتر آتے ہیں یہ استثنا ہوتا تھا' یہ چیزیں استثنائی ہوتی ہیں۔ اور اسی لئے جب یہ چیز عام ہو جاتی ہے تو یہ مشینری بے چاری فیل ہو جاتی ہے یعنی کس طرح سے ایک ایک شخص کے اوپر ایک ایک سپاہی رکھا جائے اور پھر اگلی بات کہ سپاہی کے اوپر پھر سپاہی رکھا جائے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا۔

کراچی میں گزرے ہوئے وقت کا واقعہ

جس زمانے میں کراچی میں تھا یہ پولیس یہ جو سڑکوں کے اوپر تہ بازاری میں بیٹھ جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اور یہ خوانچے والے اور یہ

ریڑھیوں والے' پتہ نہیں وہ قانون ہے بھی یا نہیں ہے' بہرحال شام کے وقت وہ جو کانسٹیبل وہاں چورا ہے پہ کھڑا ہوتا تھا ان سے آٹھ آنے اس سے روپیہ اس حساب سے وہ وصول کرتے تھے' کھلے بندوں یہ کچھ ہوتا تھا یہ عام ہوگئی وبا کرپشن کی' رشوت کی۔ایک شام وہاں ہم نے سنا وہ سپاہی جو وہی روز کا روپیہ لے رہا تھا اس نے کہا کہ نہیں! اب سوا روپیہ دو' اس نے کہا وہ آج سوا روپیہ کا ہے کو' کہنے لگا کہ گورنمنٹ نے ہمارے اوپر اینٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ ایک قائم کر دیا ہے' چار آنے ان کے بھی تو ہونے چاہئیں۔اینٹی کرپشن' محکمۂ انسدادِ رشوت ستانی۔اس نے کہا کہ چوانی اور دو۔عزیزانِ من! یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ہم جو روز کوستے رہتے ہیں گورنمنٹ کو' پولیس ایسا کرتی ہے' عدالتیں ایسا کرتی ہیں' یہ کچھ ہو رہا ہے۔پورے کا پورا معاشرہ جب اس چیز پہ اتر آئے تو اس وقت مشینری کوئی بھی اس قسم کی جو ہو وہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ایک کے اوپر ایک' کہاں تک رکھیں' کہاں تک پھر وہ جائیں گے۔وہاں یہ بات نہیں رہتی۔

رہیں نہ رند' یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

ہر قسم کی بدعملی کو روکنے کا ایک ہی طریق' اقدارِ خداوندی اور مکافاتِ عمل پر یقین محکم

عزیزانِ من! یہ صرف یہ ایک چیز روک سکتی ہے اقدارِ خداوندی پہ ایمان۔اور اگلی چیز کہ یہ پھر بات کیسے پیدا ہوتی ہے؟ مکافاتِ عمل کے قانون کے اوپر ایمان کہ یہاں سوال یہ ہے ہی نہیں کہ کوئی دیکھنے والا ہے یا نہیں' پولیس مجھے پکڑتی ہے یا نہیں' پولیس نے چھوڑ دیا ہے' عدالت نے بھی چھوڑ دیا ہے' گواہیاں نہیں ملیں' سوال ہی نہیں۔ایک اس وقت دیکھنے والا' جب کوئی دیکھنے والا نہیں اور وہ اس وقت پکڑنے والا جب دنیا کی کسی گرفت میں میں نہیں آ سکتا۔قانونِ مکافاتِ عمل از خود جو نتائج پیدا کرتا چلا جاتا ہے' اس کے لئے نہ کسی سپاہی کی ضرورت ہوتی ہے' نہ پھر کسی مجسٹریٹ کی ضرورت ہوتی ہے' نہ کسی جیل خانے کی ضرورت ہوتی ہے' وہ از خود اپنے نتائج پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔جونہی آپ نے ایک غلط غذا کھائی اور اس کے بعد جو آپ کے پیٹ کا درد ہے' یہ باہر کی کوئی سزا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اتنی شدت کا وہ درد ہوتا ہے۔یہ درد اور الم اور یہی چیزیں ہیں جسے آپ سزا کہتے ہیں' تکلیف پہنچاتے ہیں۔یہ اس وقت جو یہ PAIN ہوتا ہے کتنا شدید ہوتا ہے' نہ کسی سپاہی نے دیکھا' نہ کسی نے پکڑا' نہ عدالت میں آپ کا مقدمہ گیا' نہ انہوں نے آپ کو سزا کا حکم سنایا' نہ کسی جیلر نے یہ بید لگائے آپ پہ اور آپ تڑپ رہے ہیں' اپنے ہی گھر کے اندر بیٹھے ہوئے تڑپ رہے ہیں کیا بات ہے یہ؟ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے یہ از خود کام کرتا ہے۔بس فرق اتنا ہی ہے کہ ہم نے یہاں کوئی ایک سنکھیئے جیسی چیز کھانے کی جو تھی PHYSICAL ACTION بدن سے متعلق جو تھا وہاں تک خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل تو ہم کو یاد رہتا ہے' سنکھیا کھانے سے پیٹ میں درد ہوا انتڑیاں

کٹ رہی ہیں۔

مکافاتِ عمل کے تحت ایک ایسی سزا جو انسانی ذات کو بدنما کرتی ہے

لیکن یہ بات کہ حرام کا کھانا کھانے سے ہماری انتڑیاں کٹیں' یہ بات ہمارے سامنے نہیں رہتی۔ بس یہاں آ کے جسے کہتے ہیں یہ سیکولر اسٹیٹ ہے اور یہ اسلامی مملکت ہے۔ بظاہر تو آپ کو فرق نظر آتا ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ سیکولر سٹیٹ صرف PHYSICAL LAWS جو ہوتی ہیں جو طبعی زندگی ہوتی ہے وہ اس تک ہی جا سکتی ہے۔ جرم کرے کوئی دیکھنے والا ہو' پکڑنے والا ہو' گرفتار کرنے والا ہو' پھر وہ بھی راشی نہ ہو' پھر مجسٹریٹ ہو' وہاں گواہ بھی صحیح طور کے اوپر آئیں' ایمانداری دیانتداری سے وہ فیصلہ دے' اس کے بعد سزا اس کو ملے' یہ سیکولر یہیں تک جا سکتی ہے اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ لیکن مملکتِ خداوندی وہ ہے کہ جہاں دلوں کے اوپر نگاہ ہوتی ہے اور باہر سے تو کسی کی ہو نہیں سکتی ان کی اپنی نگاہ ہوتی ہے۔ صرف وہ مستثنیات کہ جو ان چیزوں سے کسی وقت سہوا یا نسیان ہوا یا کوئی عادی ایسا ہو گیا اس کے لئے' یہ آپ کے ہاں کی مشینری ہوتی ہے' ہر ایک کے لئے نہیں ہو سکتی۔ یہ جو آج آپ کہہ رہے ہیں کہ سارا ہی معاشرہ یہ کچھ ہو گیا ہے۔

مکافاتِ عمل پر یقین محکم رکھنے والی شخصیت کا ردِعمل اور خدا کی بارگاہ میں کی جانے والی التجا

میں نے عرض کیا ہے کہ کوئی خارج کی مشینری اسے نہیں روک سکتی ناممکن ہے۔ تو یہ چیز کہ جس نے روکا تھا لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ ؕ (12:24) ایسے وقت میں جب جذبات کی شدت کا یہ عالم ہو جائے' باہر کے جو خارجی حالات ہیں' وہ سارے مجبور کر رہے ہوں اس جرم کے ارتکاب کے اوپر' کریڈٹ مل رہا ہو اس کی نگاہوں میں وہ عزیز مصر کی بیوی کی بات ماننے سے آپ سمجھ سکتے ہیں بظاہر جسے ہم کہتے ہیں مقام اونچا ہو سکتا تھا اور گھر میں کتنی عزت اور پھر تو راوی عیش لکھتا ہے اس کے بعد' یہ سب کچھ نظر آ رہا ہے۔ اور آگے جا کے ہم دیکھیں گے جہاں حضرتِ یوسفؑ نے یہ کہا ہے کہ اے میرے رب! یہاں معاملہ یہ آ گیا ہے کہ مجھ سے یہ کہا جا رہا ہے یا جبراً اس فحش کا ارتکاب کروں اور یا اس کی سزا سخت مجھے جیل خانے کی ملے گی' اے میرے رب! میں جیل خانے کو ہزار بار ترجیح دیتا ہوں اس چیز کے اوپر' مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جیل جاؤں' اللہ اکبر۔ کس چیز پہ جیل خانے کو ترجیح دی جا رہی ہے؟ دنیا کی پوری عیش پرستیاں سامنے ہیں' معاشرے کی وہاں کی عزت بھی ہو' تکریم بھی ہو' دولت بھی ہو' قوت بھی ملے یہ سارا کچھ (معاف رکھئے گا میری بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہیں) عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ کسی گھر کے لڑکے کے تعلق ہو جائیں اس قسم کے اور پھر آپ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ سامنے ہے دوسری طرف نہ کرنے کا نتیجہ' جیل خانہ نظر آ رہا ہے۔ وہاں دعا مانگی جا رہی ہے' کہا یہ جا رہا ہے میں ہزار بار ترجیح دونگا اس جیل خانے کو اس چیز

کے اوپر اور دعا یہ مانگی جارہی ہے کہ مجھے توفیق نصیب ہو جائے کہ میں اس کو جھیل جاؤں۔

جنسیاتی بدنہادی کے اثرات تو قوموں کو مفلوج کر دیتے ہیں

عزیزانِ من! یہ چیزیں خاصۂ رسالت میں ہی ہیں' تمام انسانوں کے لئے ضابطۂ اخلاق ہے' جو دیا گیا ہے۔ بہرحال وہاں یہ بات ہوئی۔ بات آگے چلتی ہے یہ چلتی جائے گی اور میں پھر آخر میں بتاؤں گا کہ قرآنِ کریم نے اس پوری سورۃ میں اور اُدھر حضرت مریمؑ کی جو سیرت بتائی ہے' عصمت کی پابندی کے اوپر کیوں اتنا زور دیا ہے؟ عزیزانِ من! جنسیات کا تعلق افراد سے نہیں ہوتا' اقوام سے ہوتا ہے' ان کے عروج وزوال سے ہوتا ہے' ان کی موت وحیات سے تعلق ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن نے ایک قصہ اور پوری کی پوری سورۃ میں' دوسری جگہ کہیں اعادہ ہی اس قسم کا نہیں ہوا ہے کہ کسی ایک مقام پہ پوری تفصیل کے ساتھ قصہ بیان ہوتا چلا جارہا ہے اور قصہ کیا بیان ہوتا چلا جارہا ہے؟ حفاظتِ عصمت' اتنی اہمیت اس کو حاصل ہے۔ آج بھی تجربہ کرنا ہو تو کر کے دیکھئے اس معاشرے کے اندر حفاظتِ عصمت جو ہے کہیں اس کی پابندی کے اوپر لے آیئے معاشرے کو' سوپرسنٹ نہیں تو نوے فیصد جرائم جو ہیں ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ آگے بات آئے گی۔ کمرے کے اندر یہ واقعہ یہاں تک آیا ہے۔ آیئے اس داستان کے ساتھ چلیں۔ کتنی دلکش یہ داستان ہے نورِ نکہت۔ اس نے کہا کہ آؤ' اِسؑ نے کہا کہ **مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ط**(12:23) اس جرم کے ارتکاب کے بعد جو تم مجھے مقام دینا چاہتی ہو' میں جانتا ہوں یہ تمہاری نگاہوں کے اندر بڑا ہوگا اور پھر بڑا معزز تم مجھے بنادو گی لیکن اس نے مجھے جو مقام عطا کیا ہے اس سے زیادہ حسین مقام تم مجھے دے نہیں سکتی **اَحْسَنَ مَثْوَایَ ط**(12:23) قرآن کے الفاظ ہیں **اَحْسَنَ مَثْوَایَ**(12:23)۔ بہرحال اس نے یہ کہا کہ **هَمَّتْ بِهٖ**(12:24) ارادہ کیا۔ بات آگے بڑھی۔ یہ جنون کم بخت بڑا سخت ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! پھر میں کہونگا اتنی سی عربی ضرور سیکھ چھوڑیئے' لذت آشنا ہوئیے قرآن کے انداز سے جو الفاظ میں ہوتا ہے۔ ایک لفظ ہے **وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ** (12:25) میں نے کہا تھا کہ عربی زبان میں مادے سے جب وہ مختلف باب آتے ہیں تو وہ اس کے معنی اس کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ بات اندر کیا ہو رہی ہے قرآن ایک لفظ میں بیان کر رہا ہے درمیان میں GAP چھوڑ دیا ہے ایمائیت اور SUGGESTIVENESS کے لئے' اپنے ذہن سے اسے پورا کیجئے۔ کیا ہوا؟ کہا یہ ہے **وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ** (12:25) کہ وہ دروازے کی طرف اس انداز سے بھاگے کہ دونوں میں سے ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ میں آگے چلا جاؤں۔ ایک لفظ ہے **وَ اسْتَبَقَا**'(12:25) ہے تو وہ 'س ب ق' ہی جس کے معنی ہوتا ہے آگے بڑھنا۔ وہ آ گیا بابِ **افتعال استبقا** گردان کی رو سے ق کو ذرا لمبا کیا تو دو ہو گئے اب ایک لفظ قرآن نے کہا ہے کوئی لمبی چوڑی داستان نہیں بیان کرتا' سب کچھ کہہ جاتا ہے۔ وہ جو میں نے کہا تھا کبھی کبھی وہ شاعری کے اندر ہمارے یہاں یہ چیز آتی ہے' بتائی

نہیں جاتی۔بعض دفعہ یونہی ذہن میں کچھ چیزیں آ جاتی ہیں دورِ جاہلیت کی۔ ہمارے ہاں بھی یہ شاعر بلا کے کم بخت ہوتے ہیں ایمائیت سے بڑا کام لیتے ہیں۔

کچھ لوگ بچشمِ تر چلے ہیں
معلوم نہیں کدھر چلے ہیں

اقدارِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھنے والی شخصیت کا حسنِ عمل اور اس کے مقابلے میں عزیز کی بیوی کی غلط بیانی

قرآن میں یہ انداز انتہا تک پہنچ گیا ہے۔الفاظ کے استعمال میں اور پھر وہ عربی زبان تھی وَ اسۡتَبَقَا الۡبَابَ(12:25) ایک جیسے ریس لگ رہی ہے' ایک کے بعد دوسرے کی اور دونوں میں سے ہر ایک کی کوشش یہ ہے کہ میں پہلے پہنچوں دروازے پہ' اس کی کوشش یہ ہے کہ دروازے کو بند کیسے ایسے کروں کہ نکلنے نہ پائے اس کی کوشش یہ ہے کہ میں پہنچوں پہلے اور دروازے کو کھول دوں وَ اسۡتَبَقَا الۡبَابَ (12:25)۔اور اس کشمکش میں وہ عصمتِ دامن جو تھی PHYSICAL دامن کو میں کہہ رہا ہوں' وہ تو چلی جاتی ہے۔وَ قَدَّتۡ قَمِيۡصَهٗ مِنۡ دُبُرٍ (12:25) کچھ لمبی بات نہیں کی ہے' اس کشمکش کے اندر یوسفؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹ گئی۔ساری بات صاف کہہ دی' ساری داستان وہ کہہ جاتا ہے۔وَ اسۡتَبَقَا الۡبَابَ وَ قَدَّتۡ قَمِيۡصَهٗ مِنۡ دُبُرٍ (12:25) کیا محاکات ہیں اس کے!! یہاں تک یہ ہے تو اگلی بات یہ ہے کہ اس میں بہرحال یوسفؑ کامیاب ہو گیا۔ یہ پیچھے سے قمیص کا پھٹنا وہ پیچھے رہ گئی اس کا روکنا کہ بڑھ نہ جائے جسم پہ ہاتھ نہیں پڑتا تو کپڑے کو پکڑتے ہیں' پیچھے سے اس نے کرتے کو پکڑا قمیص کو پکڑا اس کی شدت بھاگنے کی یہ تھی کہ قمیص پھٹ گئی۔

بیوی کی طرف سے جھوٹی ہوس کا سہارا اور سزا دلوانے کی اپیل

عزیزانِ من! ہر چیز آتی چلی جاتی ہے ایک لفظ کے اندر' آتی چلی جاتی ہے۔اگلی بات یہ کہ وہ آگے پہنچ گیا دروازہ کھول دیا کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے وَ اَلۡفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الۡبَابِ ؕ(12:25) اور اتفاق دیکھئے کہ یوں دروازہ کھولا اور دیکھا کہ سامنے اس کا خاوند کھڑا ہے۔اب یہاں دیکھئے یوسفؑ کو اتنی جلدی اور تیزی نہیں ہے کہ وہ اپنی مدافعت میں کچھ کہے وہ جس کے من میں چور ہے قَالَتۡ (12:25) جھٹ بول اٹھی حالانکہ ذرا پیچھے تھی۔قَالَتۡ مَا جَزَآءُ مَنۡ اَرَادَ بِاَهۡلِكَ سُوۡٓءًا (12:25) کہو! اس کی کیا سزا ہے جو تمہاری بیوی کے ساتھ اس قسم کا ارادہ کرے۔یعنی سارا کچھ فیصلہ ہی سنا دیا۔ یہ نہیں ہے کہ مقدمہ پیش کرے اور اس کے بعد ہو کہ تم فیصلہ کرو کس کا جرم ہے اس جرم کی سزا دی جائے' نہیں صاحب! فیصلہ ہی کر دیا۔ ہوسِ خام تھی' ہوسِ خام میں ہی یہ ہوتا ہے کہ بہرحال محبوب ہو اور اس کو سزا دلانے کے لئے فکر کی جائے' ہوس میں بھی پختگی ہو تو یہ بات نہیں ہوتی۔کہا بتاؤ! کیا سزا ہے اس کی جو تمہاری

بیوی۔لفظ یہ تمہاری بیوی جو ہے' یہ نہیں کہا کہ میرے ساتھ وہ جو یہ کرے۔آپ دیکھتے ہیں قرآن کے الفاظ۔اس کی غیرت کو اس کے مقام کو اسے پکارا ہے تمہاری بیوی اور اس پہ یہ ہاتھ ڈالے''میں تے خیر نمانی کی ہیگی ساں تیری عزت ول تکیا' جیہڑا تیری عزت تے ہتھ پاوے'' یہ ہوتی ہے نفسیاتی چیز۔آگے چل کے آئے گا اسی داستان میں بڑے عجیب ٹکڑے ہیں۔ایک ٹکڑا ہے جب وہاں سے وہ یوسفؑ کا چھوٹا بھائی' بنیامین جن کا نام لیا جاتا ہے وہ وہاں انہوں نے روک لیا تھا وہ کٹورے کا قصہ آگے آئے گا اور یہ پھر واپس آئے تھے۔پہلے یوسفؑ کے ساتھ یہ کیا وہ گیا ہاتھ سے' پھر بنیامین دوسرا بیٹا جو حضرتِ یعقوبؑ کا چہیتا تھا' وہ وہاں روک لیا گیا۔یہ وہاں سے واپس جب آئے ہیں تو نظر آتا تھا کہ باپ پہ قیامت گذر جائے گی اس سے کہ دوسرا بیٹا بھی' میں کہتا رہا اور یہ لے گئے اور اس کو بھی یہ کہیں گم کر آئے۔ آنے کے فوری بعد اس باپ سے آ کے یہ کہا کہ آپ کو کچھ پتہ ہے کہ آپ کے اس چہیتے نے کیا کیا وہاں؟ بنیامین نے کیا کیا یہ نہیں کہا' ہمارے بھائی نے کیا کیا یہ نہیں کہا' کچھ معلوم ہے تمہیں! تمہارے اس لاڈلے نے وہاں کیا گل کھلائے۔یہ ہے قرآن کا انداز۔یہاں وہ کہہ رہی ہے دیکھا تم نے تمہاری بیوی کے اوپر جو دست درازی کرے کہو! کیا سزا ہے۔میں تو یہ سمجھتی ہوں اِلَّآ اَنۡ یُّسۡجَنَ (12:25) قید کر دیا جائے لیکن اگر تمہاری غیرت کی تسکین اس سے بھی نہیں ہوتی اَوۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (12:25) اس سے زیادہ دردناک سزا اس کو دی جائے۔تم فیصلہ کرو کیونکہ تمہاری عزت کے اوپر اس نے ہاتھ ڈالا ہے۔اب حضرتِ یوسفؑ کی DEFENCE آ گئی۔قَالَ ہِیَ رَاوَدَتۡنِیۡ عَنۡ نَّفۡسِیۡ (12:26) انہوںؑ نے کہا کہ یہ بات یہ نہیں ہے اس نے مجھے پھسلانا چاہا تھا۔

ہر دو فریقین کے معاملے کو حل کرنے کے لیے ایک تیسرے فریق کی ضرورت کو پورا کرنے کا طریق

اب یہ دو ہی وہاں اندر تھے تیسرا کوئی نہیں تھا کہ جو عینی شاہد ہو جاتا۔بات آگے بڑھی تو گھر میں ہی کوئی اور تھا' بات تو آگے چلنی تھی کہ کیا کیا جائے' اس نے کہا وَ شَہِدَ شَاہِدٌ مِّنۡ اَہۡلِہَا ۚ (12:26) آہاہا! قرآن کی کیا بات ہے! کہ ایک وہاں شہادت دینے والا کہہ لیجئے' نگران کہہ لیجئے' بات سن کے فیصلہ کرنے والا کہہ لیجئے ان میں سے ایک' کس میں سے؟ اَہۡلِہَا (12:26) خود اس بیوی کے خاندان میں سے اس کی طرف کا ایک آدمی' اب اس کے خلاف شہادت جانی ہے تو شہادت میں کہا مِّنۡ اَہۡلِہَا (12:26)۔اب یہاں آیئے ہمارے ہاں ایک ہوتی ہے CIRCUMSTANCIAL EVIDENCE کسی جرم کے ارتکاب کے وقت کوئی گواہ نہ ملیں عینی شاہد نہ ہوں تو مقدمے کا فیصلہ جج پھر کیسے کرتا ہے' وہ ہوتے ہیں CIRCUMSTANIAL EVIDENCE' حالات جو ہیں ان کو اگر بیان کیا جائے تو اس سے وہ کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے۔اب یہاں گواہ تو کوئی نہیں تھا اس کمرے کے اندر جو واردات ہوئی ہے اس کا تو گواہ کوئی نہیں ہے۔وہ کہہ رہی ہے اس نے جرم کیا یہؑ جواب دے رہے ہیں کہ اس نے مجھے پھسلانا چاہا' تیسرا آدمی کوئی نہیں ہے تو فیصلہ کیسے ہو۔یہ باہر جو بیٹھا ہے اس چیز کو سن کے کچھ کہنے والا' اس کے پاس کونسی EVIDENCE ہے؟

CIRCUMSTANCIAL EVIDENCE خارجی حالات کی شہادت اور وہ یہ تھی کہ اس نے یہ کہا کہ میں یہ سمجھتا ہوں (ابھی اس نے دیکھا نہیں ہے سارے قصے کہ اس کی قمیص کہاں سے پھٹی)۔

پیچھے سے قمیض پھٹنے کے معاملے نے سارا مسئلہ حل کر دیا

اِنۡ کَانَ قَمِیۡصُهٗ قُدَّ مِنۡ قُبُلٍ فَصَدَقَتۡ وَ هُوَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ (12:26) اگر تو قمیص سامنے سے پھٹی ہے تو یہ مجرم ہے وہ سچی ہے۔ دیکھا CIRCUMSTANIAL EVIDENCE بھی اس کمرے کے اندر کی واردات سے کیا مل سکتے تھے وہاں سے ایک ہی چیز تھی اور وہ کرتہ پھٹ گیا تھا اور اس پھٹنے سے وہ اس نتیجے پہ پہنچا۔ یہ ہوتی ہے جج کی نگاہ۔ اگر وہ سامنے سے پھٹا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ دست درازی کر رہا تھا اور وہ روک رہی تھی یہ پھٹا۔ اور اگر وَ اِنۡ کَانَ قَمِیۡصُهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ فَکَذَبَتۡ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ (12:27) اور اگر وہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ اس کے اس ارادے یا کشمکش سے بھاگ رہا تھا وہ اس کو پکڑ رہی تھی، کرتہ پھٹ گیا۔ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیۡصَهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنۡ کَیۡدِکُنَّ ؕ (12:28) جب اس نے عزیز مصر نے دیکھا کہ وہ کرتہ اس کا یا قمیص پیچھے سے ہی پھٹا ہوا تھا، بات ساری سامنے آ گئی نظر آ گیا کہ وہ مجرم نہیں ہے۔

ندامت کے سلسلہ میں ایک معاشرتی پہلو

اب یہاں سے قرآن ایک اور داستان بیان کرتا ہے اس معاشرے کی داستان بیان کرتا ہے۔ قَالَ اِنَّهٗ مِنۡ کَیۡدِکُنَّ ؕ (12:28) وہ اپنی بیوی کو کہہ رہا ہے۔ اب یہاں پھر ایک چیز قرآن کی آئی! اگر کسی ایک فرد کو کسی جرم کا ملزم یا مجرم قرار دیا جائے اور مطعون قرار دیا جائے تو یہ بڑی تلخ بات ہے اور اگر ایک پورے گروہ کو کہہ دیا جائے ''پئی اے تہاڈا دوکاندار اں دا حال ای اے ہیگا اے'' آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں وہ جو چبھن ہے تو تلخی اس میں کم ہو جاتی ہے۔ کوئی دوکاندار اگر کم تولے یا کوئی سودا آپ کو دے آمیزش اس میں ہو اور کوئی پکڑ لے اور اسے کہا یہ جائے کہ صاحب! آج کل تم دوکانداروں کا حال ہی یہ ہو گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں صاحب! یہ سب ٹھیک تولتے ہیں اور تم ایسے ہو جو یہ کرتے ہو، وہ چیز شدت کی ہوتی ہے۔ اب اس معاشرے میں نظر آ رہا ہے کہ کس طرح یہ چیز عام ہو رہی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّهٗ مِنۡ کَیۡدِکُنَّ ؕ (12:28) یہ تو نظر آتا ہے کہ تمہارے وہی مکر جو تم روز کرتی پھرتی رہتی ہو یہ اسی قسم کا ایک مکر ہے، تم سب، معاشرے کی ساری عورتوں میں آ گئی بات، اب اس کے خلاف وہ جو نشتر زنی تھی اس پہ حریری کپڑا لپیٹا گیا نشتر کی نوک کے اوپر، تم عورتوں کا چلن ہی یہ ہو گیا ہے آج کل ''فٹے منہ تہاڈا ہور کچھ نئیں''۔ اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ (12:28) بیشک! اس میں شبہ نہیں کہ تم عورتوں کی یہ جو اس قسم کی مکاری کی چالیں ہیں، بڑی خطرناک ہیں۔ وعظ کہنا شروع کر دیا۔ ذرا آگے چل کے ابھی میں عرض کرتا ہوں کہا

کیا۔ بات یہاں آ گئی اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ(12:28) عربی زبان کے اعتبار سے ان یقیناً کَیۡد وہ تدبیر جو مخفی ہو مکر کی تدبیر یا وہ ہر تدبیر کہ جو ذرا مخفی طریقے پہ کی جائے اسے کَیۡـــــد کہتے ہیں۔ کـــــن یہ ضمیر ہے وہ ایک کے لئے کَ آتی ہے اور جمع کے لئے کُنَّ(12:28) آتی ہے۔ تمہارا عورتوں کا اس قسم کا یہ مکر یہ مکاریاں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔

ہمارے ہاں کی تفسیروں میں عورت کا مقام تو نہایت پست سطح پہ پیش کیا جاتا ہے

بات صاف ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے شاعروں کے ہتھے چڑھ گئے یہ طعن۔ ایک تو آپ کے ہاں یہ معلوم ہونا چاہئے اچھے اچھے بڑے بزرگوں کی کتابوں میں آپ دیکھئے عورت کے خلاف تو یہ سب لٹھ لے کے پھرتے ہیں دنیا بھر کی برائیاں ان کے اندر ہیں ہر قسم کی معاذ اللہ معاذ اللہ لغزشیں اور مکر اور چالیں یعنی جتنے آپ کے ہاں یہ بڑے بڑے بزرگ ہیں ان کی کوئی تصنیف اٹھا کے دیکھئے۔ وہ شروع کرتے ہیں کہ برائیوں کی ابتدا جنت کے اندر وہ حوا کے ہاتھوں شروع ہوئی جس نے پھسلایا آدم کو جرم اس کا ہے پہل وہاں سے ہوئی۔ یہ ''کشف المحجوب'' داتا صاحب کی اٹھا کے دیکھ لیجیے کہ وہ جو پہلے دن عورت نے بیج بویا تھا اس قسم کی خباثت کا برائی کا مسلسل چلا آ رہا ہے ساری برائیوں کا سرچشمہ عورت اور ساتھ ہی یہ کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ ماں عورت نہیں ہوتی؟ ''اوفٹے منہ تہاڈا''۔

باپ کی بیوی ہو تو جنت کی مالک اور اگر اپنی بیوی ہو تو مکاریوں کا سرچشمہ

آپ نے سوچا کہ جب پھر یہ عورت جو لاتے ہیں یہ برائیاں اور وہ اور وہ ذہن میں تصور کیا ہوتا ہے؟ بیویاں سی تصور کچھ ہوتا ہوگا جو کچھ انہوں نے ان کا حال بنا رکھا تھا لیکن یہ کہتے وقت پھر وہ بھول جاتے ہیں شاید اپنی بیویوں کے متعلق کہیں کہ جو باپ کی بیوی ہے اس کے پاؤں کے نیچے تو جنت ہے اور اپنی بیوی جو ہے دنیا بھر کی مکاریوں کا سرچشمہ اور تمہارے بیٹے کی ماں بھی تو یہی ہے وہ بیٹا کہتا ہے اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ یہ کہہ رہا ہے جنت سے نکلوانے کا موجب یہ اسی ایک کے متعلق۔ ''ہے کوئی کھڑا ہو کے سوچدا کہ اسی بکدے کی پئے ہیگے آں''۔ اور جو عام معاشرے کی عورتوں کو کہئے گا تو وہ عورتیں مائیں بھی تو ہونگی ان میں سے کچھ تو آج ہی ہونگی کچھ کل کو آنے والوں کی مائیں ہونگی اور ہر بیٹا جو ہے اس کو اپنی ماں کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے لٹھ لے کے ان کے پیچھے بیچاریوں کے پھر رہے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی بتایا جا رہا ہے سبحان اللہ صاحب! ماں کی کتنی عزت اور کتنی عظمت ہے باپ کی بیوی کی اور اپنی بیوی؟

ہیر وارث شاہ کے حوالے سے ہمارے ہاں کی تفسیروں کا معیار

کسی سے پوچھئے ان کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ صاحب! ہم نہیں یہ کہہ رہے خدا کا ارشاد ہے اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ

(12:28) ' کم بخت! یہ عزیز مصر نے یہ بات کہی اپنی بیوی کو اور یہ خدا کا کلام اور خدا کا فیصلہ کہہ کے ہمارے ہاں QOUTE ہوتا ہے کہ جی! وہ تو اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ (12:28) خدا نے کہہ دیا ہے۔ اور پھر آ گے آ گئے وارث شاہ' سبحان اللہ! وہاں تو سہ آتشہ ہو جاتا ہے ''اک زبان پنجابی ہوندی تے'' پھر ان مضامین میں تو پنجابی پوچھئے نہیں کیا گل کھلاتی ہے۔ میرے سامنے ہر وقت ایک شاعر بیٹھا رہتا ہے اور میں ڈرتا رہتا ہوں' ایک مصرع یوں لکھا ہوا' بس پوچھو ہی نہیں پھر کیا ہو جاتا ہے۔ اس آک کے پودے کو جو اتنا اتنا کچھ لگتا ہے۔ بالکل آم کی شکل اس کی ہوتی ہے بالکل آم' کہیں دیکھ لیجئے کسی وقت' اوپر سے آم کی شکل' ثمرِ بہشت اور اس کو ذرا چونچ مار کے جب طوطا یا جانور وہ دیکھے تو اس کے اندر سے وہ جو نکلتی ہیں ''اومائی بڈھیاں اسی اوہنوں پنجابی اچ کیندے آں'' وہ روئی کی قسم کی وہ چیز نکلتی ہے اور بڑی زہریلی ہوتی ہے۔ خود آک کا دودھ ہی بڑا زہریلا ہوتا ہے اور وہ تو بڑی زہریلی ہوتی ہیں۔ ذرا سی آنکھ میں پڑ جائے تو پوچھو نہیں کیا حشر برپا کر دیتی ہیں۔ یہ جو لگتا ہے آک کے اس پیڑ کو یہ ''اوہنوں کیندے نیں اَک دی کُنی'' یہ اس کے لفظ ہے۔ یہاں ہوا تھا لفظ کُـــنَّ ۔ وارث شاہ جب پھر بیان کرتے ہیں وہاں' ذکر آتا ہے عورتوں کا تو وہ بات تو ہستی کی چلی ہوئی ہے تو بات تو چلی آتی تھی ایک عورت کی' وہی جیسے یہاں اس کی بیوی کی بات چلی آتی ہے اور وہ کَیۡدَکُنَّ (12:28) کہہ رہا ہے۔ وہاں پہنچ کے یہ شاعر صاحب یہ مقابلے میں کہتے ہیں کہ

اے تریمتاں مکر دیاں کُنیاں نیں

تو نیچے حاشئے میں لکھا ہوتا ہے خدا کا فرمان ہے اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ (12:28) وہاں سے لیا شاعر نے۔ شاعری اس میں بڑی مزیدار ہے۔ بظاہر ان کی صورت پہ نہ جایئے ثمر بہشت جیسا آم نظر آئے گا صاحب! اس کا باطن کھولئے' زہر سے بھری پڑی ہوتی ہے۔ لیکن وہ کُنی جو ہے وہ یہاں سے لایا ہے وہ شخص اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ (12:28) ''اے تریمتاں مکر دیاں کُنیاں نیں'' اور سند میں یہ صاحب! کہ اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ (12:28) خدا کا فرمان ہے اب اس کے بعد کیا کہا جائے۔

مولانا رومی کی مثنوی کو تو فارسی زبان میں قرآن کا درجہ دیا جاتا ہے' خدا پناہ!

یوں ہمارے ہاں قرآن کی تفسیر ہوتی ہے۔ آپ کو شاید پتہ نہ ہو ہیر وارث شاہ کا ختم شریف ہوتا ہے دو دو تین چھ چھ مہینے تک وہ رات کو بیٹھا جاتا ہے اور اس کو باقاعدہ پھر وہ پڑھنے والے جو ہیں ایک لے جو ہے جس میں پڑھی جاتی ہے بڑی دلکش ہوتی ہے۔ یہ سارا کچھ ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر اس کا ختم شریف ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جس طرح سے مولانا رومی کی مثنوی کے متعلق کہہ دیا ہے کہ وہ ہست قرآں در زبانِ پہلوی کہ یہ فارسی زبان میں قرآن ہے۔ ان کے متعلق بھی یہ ہوتا ہے کہ یہ ساری قرآن کی تفسیر ہے اور وہ پڑھنے

والا پھر تفسیر بتاتا ہے اس کی قرآن کی اور اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ (12:28) ''اے تریمتاں مکر دیاں کُیاں نیں'' یوں چلتی ہے یہ ساری بات۔ تو یہ اس عزیز مصر کا قصہ ہے اس نے یہ کہا بیوی کو کہ اسے نہیں کہا کہ تو ایسی ہے بلکہ کہا کہ تمہاری حالت ہی عورتوں کی ایسی ہے تو ٹھیک ہے اس نے کہا کہ بھئی! میرا کیا جرم' جب ساری عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں جیسی تم خود کہہ رہے ہو تو جرم کی سزا تو یہیں ختم ہوگئی۔

مصر جیسے تہذیب وتمدن ماحول کی تصویر کشی

عزیزانِ من! بڑا ہی نازک مقام آ گیا ہے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ یہ تہذیب وتمدن کا معاشرہ تھا اور اس زمانے میں مصر کی تہذیب بڑی بلندیوں پہ پہنچی ہوئی تھی۔ جس زمانے کا یہ ذکر آ رہا ہے کہ تہذیب وتمدن کے دور میں پھر کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہ واقعہ کسی اجڈ معاشرے میں ہوتا جسے اجڈ آپ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی گاؤں کی زندگی میں ہی اگر ہوتا کہ سامنے یہ بات نظر آ جاتی کہ یہ بیوی جو ہے اس نے یہ کچھ کرنا شروع کیا عزیزانِ من! وہ بیوی ہوتی یا بیٹی ہوتی یا بہن ہوتی جو بھی یہ دیکھ لیتا پہلی چیز یہ تھی کہ اس کا سر قلم کر دیتا وہیں اس کو مار دیتا اور خاوند تو یقیناً اس کو مار دیتا' اس کی غیرت کا تقاضا تھا لیکن یہ تو دورِ جاہلیت کی باتیں ہیں۔ دورِ تمدن کی کیا ہوتا ہے؟ اسے جو یہ کہا کہ یہ نہیں کہ تو ایسی ہے' عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ بیوی کے متعلق یہ بات سامنے آ رہی ہے یُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا (12:29) ''یوسفؑ! او یار چھڈ ایس چیزنوں' مٹی پاؤ''۔

شرم وحیا کے پیش نظر علامہ پرویز کی زندگی کا ایک اہم ترین دل خراش واقعہ

عزیزانِ من! تصویر کھینچ کے رکھ دی۔ میں پھر یہ دہرا دوں ہماری جہالت کے قصے میں' ہمارے گاؤں کے قصے میں' مجھے اپنے گاؤں کا پتہ ہے وہاں تو یہ واقعے کہیں صدیوں میں ایک دفعہ ہوتے تھے' مشہور تھا یہ ہمارے ہاں کا کہ کوئی ایک لڑکی کسی منگیتر کے ساتھ نکل گئی۔ غیر بھی نہیں یعنی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی کوئی مجبور تھا ہمارے ہاں۔ ہم وہ مکان دیکھنے جایا کرتے تھے کہ جب وہ آئی ہے یا وہ لائے ہیں باپ نے اس کو گلا گھونٹ کے مار دیا اور گھر میں جو دہلیز ہوتی ہے' اس کے نیچے قبر کھود کے اور وہاں دبا رکھا تھا وہ دہلیز مشہور تھی سارے علاقے میں اور ہم دیکھنے جایا کرتے تھے کہ یہاں وہ لڑکی دفن ہوئی تھی جو شادی سے پہلے منگیتر کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ تھا ہمارے دورِ جاہلیت میں۔ دورِ تمدن ہے سامنے وہ واقعہ آ گیا ہے' شہادت مل گئی ہے' اسے لعن طعن بھی کر رہا ہے اور اسے کہتا ہے کہ یوسفؑ جاؤ! قصہ چھوڑو بات بڑھاؤ نہیں برخوردار! لعنت بھیجو ''مٹی پاؤ'' قصہ چھوڑو۔ کیا بات ہے ہمارے اکبرالہ آبادی کی بھی بات تو ایسی عمدہ کر جاتا ہے

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
اسے غیرت نہیں آتی اُسے غصہ نہیں آتا

قوم کے اندر سے جذبۂ غیرت نکال دیجیے تو پوری قوم چلتی پھرتی لاش کا روپ اختیار کرے گی

عزیزانِ من! سن رکھئے جس قوم سے غیرت نکل جاتی ہے وہ دنیا کی ذلیل ترین قوم ہو جاتی ہے۔ نہ وہ خود بچ سکتی ہے' نہ دنیا کا کوئی حمایتی اس کو دنیا میں بچا سکتا ہے جس قوم کے دل سے غیرت نکل جائے۔ غیرت ہی ایک جذبہ ہے جو انسان کو ہر قسم کی مدافعت کے لئے تیار کر دیتا ہے' ہر قسم کے حملے کے لئے تیار کر دیتا ہے۔ کسی قوم کے اندر سے غیرت نکال دیجئے قوم چلتی پھرتی لاشیں ہو کے رہ جاتی ہے۔ معاف رکھئے گا یہ جو ہمارے ہاں پھر یہ بیٹیوں کو بیچتے ہیں اور بیویوں کے ساتھ یہ کچھ ہوتا ہے' ان کے ہاں ہوتا کیا ہے؟ غیرت ہی ہے بیچ میں سے جو نکل گئی ہوئی ہے۔ اور جب یہ افراد کی بجائے کہیں آگے چل کے قوم کی یہ حالت ہو جائے کہ اس کو پھر کسی بات پہ بھی غصہ نہ آئے کیا' وہ قوم ہندو کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس قوم کے متعلق بہت پہلے میں نے یہ بات بھانپی تھی لکھ دی تھی' دوست میرے پیچھے پڑ گئے تھے کہ کیا کیا تم نے۔

تقسیمِ ہند کے دوران 20 ہزار بچیوں کا سکھوں کے نرغے میں لئے جانے کے باوجود لاہور میں سکھوں کی ٹیم کے پھولوں کے ساتھ استقبال پر' پرویزؒ کی آہ وفغاں

ہماری تقسیم کے زمانے میں جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا تھا' اسے چھوڑ دیجئے۔ یہ تو خود ہمارے ہاں کا بھی جو کمیشن تھا اس کی رپورٹ تھی کہ کم از کم بیس ہزار ہمارے ہاں کی معصوم بچیاں چھین کے لے گئے تھے اور مشرقی پنجاب کے دیہات کے اندر وہ ان کے گھروں میں رورو کے اور تمہاری غیرت پہ لعنت بھیج کے زندگی بسر کر رہی تھیں' ہماری بیٹیاں ان سکھوں کے ہاں۔ یہ ہمارے ہاں کی ان دنوں کی رپورٹیں تھیں' تصدیق کرنے کے بعد اور تحقیق کرنے کے بعد۔ اور اس کے اوپر ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ اسی لاہور کے اندر سکھوں کی ایک ٹیم کھیلنے کے لئے آئی تھی اور آپ کے لاہور کے اندر ان کا استقبال کیا گیا' جگہ جگہ دروازے بنائے گئے سبیلیں لگائی گئیں۔ عزیزانِ من! میں نے اس زمانے میں لکھا تھا کہ اب اس ذلیل ترین قوم کو دنیا میں کوئی نہیں بچا سکے گا جس کی غیرت نہیں رہی ہے۔ جس کی بیس ہزار بیٹیاں ابھی ان کے سامنے سرحد سے پار ان گاؤں کے اندر ان کے قبضے میں تھیں' وہ آ رہے ہیں میں نے دیکھا کہ ان کو گلے مل رہے تھے۔ یہ ان کو اپنے گھروں میں لے کے گئے تھے' ان کی تواضع کی تھی ان لوگوں نے۔ روہیلے نے تو وہ دوسو سال پہلے یہ بات کہی تھی کہ جب اس نے مغلیہ بادشاہت کو فتح کیا' سلطنت کو فتح کیا' بادشاہ کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی تو اس کے بعد اقبالؒ نے اپنے ہاں اس بات کو لکھا ہے بڑی عجیب چیز ہے۔ وہاں آ کے محل کے اندر' محل کی تو یہ مغلانی جو بیگمات ہوتی تھیں وہ بھی فنون سپاہ گری کی ماہر ہوتی تھیں۔ وہ سواری میں تیر اندازی میں' شمشیر زنی میں ماہر ہوتی تھیں۔

مغلانی بیگمات پوری طرح سمارٹ ہونے کے باوجود فاتح بادشاہ پر ہاتھ نہ اٹھا سکیں

اس نے کہا کہ وہ آیا اور سب کچھ کرنے کے بعد یہ بیگمات تو محلات کے اندر تھیں محلات کے اندر ایک پلنگ کے اوپر دوپہر کے وقت ہی اس نے کہا کہ میں تھوڑا سا سستا لوں' وہ لیٹ گیا اپنی تلوار کھول کے لٹکا دی اونچی جگہ پہ' نہتا اور وہ لیٹ گیا' آنکھیں بھی بند کر لیں اور یہ بیگمات ساری اِدھر اُدھر وہاں چلتی پھرتی تھیں اور اس کے بعد اس نے آنکھ کھولی تو اس نے یہ بات کہی کہ نہ مجھے نیند آئی تھی' نہ میں سویا تھا میں نے دیکھا یہ تھا کہ یہ قوم جو ہے' یہ بچ سکتی ہے اس کے بعد یا نہیں اور اس کا ایک ہی ماپنے کا پیمانہ تھا کہ اس قوم کے اندر' غیرت رہی ہے یا نہیں' میں نے اپنی تلوار بھی لٹکا کے رکھ دی تھی میں نے بڑا رسک لیا تھا' میں دیکھ رہا تھا کہ تم سب کے پاس تلواریں لٹکی ہوئی ہیں تم سب ان تلواروں کو چلانا بھی جانتی ہو' تم ادھر اُدھر پھر بھی رہی تھیں' یہ دشمن سویا ہوا تھا جس نے تمہارے ساتھ تمہارے بادشاہ کے ساتھ یہ کچھ کیا ہے۔اس کے ہاتھوں سے ابھی خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں' تم اِدھر اُدھر پھرتی رہیں کسی سے یہ نہ ہوا کہ ایک تلوار کا وار آ کے کر دیتیں۔ اس نے اس کے بعد یہ کہا تھا کہ یہ قوم نہیں بچ سکتی۔

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

کوئی قوم خواہ وہ کتنی بھی مہذب کیوں نہ ہو اس کی موت ہمیشہ غیرت کو خیر باد کہنے سے ہی ہوتی ہے

قوموں کو باہر کے دشمن تو آ کے نہیں مارتے۔ یہ تو پہلے مری ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ تو ان کا جنازہ پڑھنے کے لئے یا دفنانے کے لئے باہر کے دشمن آیا کرتے ہیں۔کبھی زندہ انسان کو کوئی مار سکتا ہے! افوہو۔کہتا ہے **یُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا**سکتۃ(12:29) جانے دے قصے کو' چھوڑو بات نہ بڑھاؤ اس کے اوپر مٹی ڈالو۔عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں یہ ایک قصہ ہے جو بیان ہو رہا ہے قرآن اس کے اندر کیا کیا کچھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

مہذب معاشرے میں طعن و تشنیع کی نوعیت

وَ اسۡتَغۡفِرِیۡ لِذَنۡۢبِکِ(12:29) اس سے کہا اس سے معافی مانگ۔**اِنَّکِ کُنۡتِ مِنَ الۡخٰطِئِیۡنَ**(12:29) تو ہی قصوروار تھی' فٹے تمہاری ایسی کی تیسی۔ چلے گئے معاملہ ختم ہو گیا' قصہ ختم ہو گیا۔**وَ قَالَ نِسۡوَۃٌ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ امۡرَاَتُ الۡعَزِیۡزِ** (12:30) معاشرہ سارا ہی مہذب تھا چرچا ہو گیا' ساری بڑی بڑی کوٹھیوں میں بڑے بڑے محلوں کے اندر ''نیں کجھ سنیاں ای'' دیکھا اس کو! بدھو کہیں کی' گھر کا نوکر ہے اس کو بھی نہیں پھسلا سکی اپنے ساتھ' الٹی ملزم بن کے بیٹھ گئی' مجرم بن کے بیٹھ گئی۔یہی چرچا تھا۔**امۡرَاَتُ الۡعَزِیۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنۡ نَّفۡسِهٖ قَدۡ شَغَفَهَا حُبًّا**ط(12:30) نوکر کی محبت' غلام کی محبت بڑی اس کے دل میں گھر کر گئی ہے وہ اس کو

پھسلانے کو کوشش کرتی ہے اور یہ بھی نہیں اس کے ساتھ کر سکی اور مجرم بن کے بیٹھ گئی۔ اِنَّا لَنَرٰھَا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (12:30) کچھ نہیں! کھلی ہوئی گمراہی کے اندر نظر آ رہی ہے۔ ''جیسے کسے نوں کہوے اوشکاری بنی پھردا ہیگا ایں گھی وی نئیں پڑھنی اوندی ہیگی اے''۔ مہذب سوسائٹی ہے۔ فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَکۡرِھِنَّ (12:31) اس کے اندر بھی ان کی کوئی اپنی چال تھی' چلو آزما کے دیکھیں کیسے نہیں پھنس سکتا' اسے آتا ہی نہیں ہے۔

عدالت میں اپنی بدنیتی کا اعتراف

قرآن نے تفصیل نہیں بتائی' ساری تفصیلیں اس کے اندر آ جاتی ہے بِمَکۡرِھِنَّ (12:31) اور یہ مَکۡرِھِنَّ (12:31) یہیں نہیں آیا آگے چل کے یہ مقدمہ آئے گا عدالت میں پیش ہوگا' وہاں پھر یہ اقرار کریں گی کہ واقعی یہ ہماری سازش تھی جس کے تحت ہم نے وہاں یہ سب ڈھونگ رچایا تھا۔ قرآن تفصیل نہیں دیتا۔ اَرۡسَلَتۡ اِلَیۡھِنَّ وَ اَعۡتَدَتۡ لَھُنَّ مُتَّکَاً وَّ اٰتَتۡ کُلَّ وَاحِدَۃٍ مِّنۡھُنَّ سِکِّیۡنًا وَّقَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَیۡھِنَّ ؕ (12:31) اس نے بہرحال یہ بات سنی اس نے یہ بتانے کے لئے کہ یہ خوامخواہ مجھے مطعون کرتی ہو' تم آ کے دیکھ لو کوشش کر کے دیکھ لو۔

زلیخا نے ناکام رہنے کے بعد ایک اور چال چلی جب کہ اس نے حضرت یوسفؑ کو زبردست قوت ارادہ کا مالک پایا

ممکن ہے وہ کہتی ہوں کہ یہ اتنے میں بھی ناکام رہی ہے اس کو اتنا بھی نہیں آتا' بنی پھرتی ہے کہ اس میں اتنی جاذبیت نہیں ہے کہ ایک غلام ہی اس پہ ریجھ جائے۔ اس نے کہا کہ یہ تم بہت زیادہ کاریگر بنی پھرتی ہو اور بہت زیادہ حسین ورعنا' تم آ جاؤ۔ یعنی کچھ اس قسم کی چیزیں ہیں جو اس کے اندر سے نکلتی ہیں۔ انتظام کیا اس نے کہ اچھی بات! شام کی چائے ہمارے ساتھ ہی پیجئے گا اور رات کا کھانا یہیں آ کے کھائیے گا۔ اب دیکھئے وہ معاشرہ مہذب ہے قرآن یہ بتاتا ہے۔ میز لگائی گئی اور چھری کانٹے بھی ان کے ہاتھ میں دے دئے گئے۔ یہ سارا کچھ جو کچھ ہوا تو اس کے بعد اس نے یہ کہا قَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَیۡھِنَّ ۚ (12:31) یوسفؑ سے کہا کہ آؤ ذرا باہر آؤ' ٹھیک ہے وہ آیا یا تفصیل پھر نہیں ہے کہ کیا ہوا یا کیا صورت تھی۔ فَلَمَّا رَاَیۡنَہٗۤ اَکۡبَرۡنَہٗ (12:31) انہوں نے اسے دیکھا اور اس کے بعد بہرحال وہ مکر تھا جس قسم کے بھی وہ تیر چلانا چاہتی تھی دست عشوہ طرازیوں کے یہ سب کچھ کیا ہوگا' قرآن نہیں بتاتا صرف ایک لفظ بتاتا ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ کر دیکھا لیکن اسے بڑا عظیم انسان پایا۔ بات ختم ہوگئی۔

لفظ اللہ اکبر اور المتکبر کا واضح مفہوم

یہاں لفظ اَکۡبَرۡنَہٗ (12:31) ہے یعنی یہ خاص طور پہ یہ جو کبریائی ہوتی ہے ہمارے ہاں تو پھر یہ تکبر ہو گیا یہ لفظ اس قدر مذموم ہو گیا

ہے' بھول گئے کہ خدا نے اپنے آپ کو المتکبر کہا ہے۔ پانچوں دفعہ ہم اللہ اکبر اللہ اکبر پکارتے ہیں یہ تو وہی ہے یعنی یہ ہے اتنی قوتوں کا مالک کہ کوئی بھی شکست دینے والی قوت اس کے اوپر غالب نہ آ سکے۔ یہ ہوتے ہیں اس کبر اور کبریائی کے معنی۔ قرآن نے جہاں یہ کہا ہے کہ یہ چیز غلط ہے وہاں پھر وہی بات آ گئی جو میں کہا کرتا ہوں کہ جہاں اس نے کہا ہے کہ جذبات کا اتباع جو ہے' اس کے پیچھے لگ جانا غلط ہے صرف اس صورت میں کہ وہ بغیرِ ہدایتِ خداوندی ہو۔ ہدایتِ خداوندی کی حدود کے اندر جذبات کی تسکین کوئی مذموم چیز نہیں ہے' یہ تو مستحسن ہے۔ اسی طرح سے استیلا یا تکبر فی الارض جو قرآن نے کہا ہے ہمیشہ ساتھ بغیر الحق کہا کہ اگر وہ قوانینِ خداوندی کے خلاف ہے تو پھر بری بات ہے اور اگر وہ قوانینِ خداوندی کے لئے ہے تو یہ تو وہ ہے تکبر جس کے لئے خدا نے اپنے آپ کو المتکبر کہا ہے۔ جس کے لئے اس کی شانِ کبریائی کا اعلان ہم اللہ اکبر سے کرتے ہیں۔ یہ تو بہر حال اب ہم جو کچھ کرتے ہیں' اللہ اکبر ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے اسے **اکبرنہ** یعنی بڑی ہی زبردست قوتِ ارادی کا مالک پایا جسے دنیا کی کوئی بھی قوت شکست نہ دے سکے۔ قرآن ایک لفظ میں ساری بات کہہ گیا۔ اگر اتنا ہی ہوتا کہ اس کو پاکباز پایا' اس کو معصوم پایا' اس کو خلیق پایا' بات نہ بنتی اسے انہوں نے دیکھا کہ اللہ اکبر! یہ شخص اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے کہ کوئی بھی مخالف کی قوت اسے شکست نہیں دے سکتی۔ وقت نہیں ہے اور ویسے جی بھی نہیں چاہتا میں اس کی تفسیر میں جو کچھ ہمارے ہاں لکھا ہوا ہے اگر بتاؤں کیا کیا بتاؤں!! سینہ تمام داغ دار پنبہ کجا کجا نہم۔ وَ **قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ** (12:31)۔

لفظ قطع ید کا مفہوم اور اس کے استعمال کے مختلف پہرائے

اب یہاں ہے قطع ید' یہ قطع کے معنی کاٹنا ہوتا ہے' ید کے معنی ہاتھ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں قرآن میں سرقہ یا چوری کی سزا کے سلسلے میں یہ کہا ہے قطعِ ید جسے آپ کہتے ہیں۔ یہ جو ہے اس کے معنی بالضرور ہاتھوں کا پنجوں سے' کلائی سے' کاٹ کے پھینک دینے کے نہیں' قطع کے معنی' عربی زبان میں لیا جائے تو میں کہا کرتا ہوں کہ عربی زبان کو سامنے رکھنا چاہئے یہ قطع کے معنی کسی چیز کو کاٹ دینا ہوتا ہے' کاٹ دینا آپ کے ہاں بھی' ابھی تک آپ محاورے میں دیکھئے ''اس نے اس کا راستہ کاٹ دیا'' وہ کیا ہوتا ہے راستہ کاٹنا؟ راستہ روک دیا' قطعِ لسان کہتے ہیں کسی کی زبان بندی کر دینا' بولنے نہ دینا۔ اس نے وہ چار دلائل ایسے دئے صاحب! قطعِ لسان ہو گیا' عربی زبان میں قطع لسان کہتے ہیں' عربی زبان میں قطعِ ید کہتے ہیں کسی کی قوت کو روک دینا' ید کے معنی قوت ہوتا ہے۔ وہ انبیائے کرامؑ کے متعلق کہتا ہے **اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ** (38:45) ہاتھوں والے اور آنکھوں والے۔ تو ہر انسان آنکھوں والا اور ہاتھوں والا ہے' وہ کہتا ہے کہ صاحبِ قوت' صاحبِ بصیرت یہ نبی ہوتا ہے۔ کہہ میں یہ رہا تھا کہ ید کے معنی عربی زبان میں قوت کے ہوتے ہیں' قطعِ ید کے معنی ہوتا ہے کسی کی قوت کو روک دینا' اس پہ پابندی لگا دینا۔ ہاتھ کو روک دینا دست درازی نہ کرنے پائیں جو طریقہ بھی آپ کے ہاں

ایسا ہو جس سے کہ وہ ہاتھ رک جائے آئندہ وہ کچھ کرنے سے۔اسی لئے وہاں نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (5:38) قرآن نے کہا ہے یہ اللہ کی تجویز کردہ بیڑیاں ہیں۔ایک لفظ میں بات بتا دی بیڑیاں کیا کرتی ہیں! وہ ٹانگ کو کاٹ کے نہیں پھینک دیتیں' اس کی آزادی کو پابند کر دیتی ہیں کہ ان حدود کے اندر تم چل سکتے ہو جو متعین کی گئی ہیں۔بات یہ وہاں آئے گی جہاں وہ آیت آئے گی۔میں یہیں تک نہیں رہتا میں کہتا ہوں کوئی مملکت اپنے ہاں اگر یہ طے کرے جب جرائم عام ہو جائیں تو وہاں پھر سزا میں انتہائی شدت برتنی چاہئے تا کہ وہ سزا عبرت آمیز ہو جائے۔تو عبرت آمیزی کے لئے مملکت اپنے ہاں جو کچھ بھی طے کرے۔لیکن یہ کہ جو وہاں قطعِ ید لکھا ہے اس کے معنی بالضرور یہ لینا کہ وہ ہاتھوں کو کاٹ کے پھینک دینا یہ اس کے ایک مخصوص معنی ہیں۔

عربی محاورے کے مطابق زلیخا کی سہیلیوں نے اپنے ہاتھ کھانے سے روک لیے تھے اور زخمی کر لیے تھے

عربی زبان کی رو سے ہاتھ کو روک دینا' دست درازی پہ پابندی عائد کر دینا' اس کی قوت کو سلب کر لینا یہ سارے معنی اس میں آئیں گے۔اور یہاں تو بات سیدھی سی ہے قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ (12:31) انہوں نے اپنے ہاتھ اگر قطع کرنے کے معنی کاٹ کے پھینک دئے ''تے او ساریاں لنڈیاں ہو گیاں او تھے تے جینیاں پیٹھیاں ہو یاں سن'' یہ تو بات ہو نہیں سکتی کہ چھریاں ان کے پاس کھانے کی میز کی تھیں اور پھر وہ کاہے کے لئے۔زیادہ سے زیادہ ہاتھوں کو زخمی کر لینا آپ کہہ سکتے ہیں اور آگے چلیں اگر اور اس کے معنی تو وہ یہ کہ وہ انہوں نے دیکھا مبہوت رہ گئیں اور کھانے سے ہاتھوں کو روک دیا ''چھڈ کے بیٹھ گئیاں''۔''اپنے ہاتھوں کو کھانے سے روک دیا'' یہ بھی عربی زبان کے محاورے کے مطابق معنی ہونگے۔اور میں سمجھتا ہوں یہ زیادہ جچتے ہیں ورنہ زخمی کر لینا بھی الگ بات ہے کہ مبہوت اس طرح سے ہو جائے کہ اس کو ہوش نہ رہے اپنی چھریوں سے اپنے ہاتھوں کو زخمی بھی کیا جائے۔ہو سکتا ہے میں کہتا ہوں یہ تو یہ ہے اس کو کیسے سمجھا جائے لیکن میں سمجھتا ہوں یہاں یہ چیز زیادہ اچھی نظر آتی ہے یوسفؑ سامنے آیا' وہ؟؟؟ اور معاشرے اور عشوہ طرازیاں اور یہ ساری کچھ جو کچھ وہ ہوتا ہے اس معاشرے کے اندر اس میں تو صاحب اگر چار آدمی ایک عورت کے ساتھ گھرے ہوئے ہوں تو وہ پوچھو نہیں کیا کرتی ہے یہاں یہ ایک بے چارہ سارے شہر کی عورتوں میں گھرا ہوا تھا' یہ سارے معاشرے کی عورتوں میں گھرا ہوا تھا پتہ نہیں کیا کیا کچھ انہوں نے کیا ہو گا لیکن اس کے بعد قرآن نے تو ایک لفظ کہا ہے رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ (12:31) اس کو سب کچھ کر کے دیکھا اور اس کو بڑا عظیم انسان پایا اور ان کی کیفیت یہ ہو گئی۔میں سمجھتا ہوں اس سے وہ پھر اتنا مبہوت رہ گئیں کہ کھانے سے ان کے ہاتھ رک گئے۔بڑی صحیح چیز ہے۔وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ (12:31) انہوں نے آخر کہا آہاہا! خدا عظیم ہے یہ واقعی یہ کوئی انسان تو ہے نہیں۔تو نظر آتا ہے کہ وہاں بشر جو تھے' ان کی یہ صورت تھی نہیں' بیچاریوں کو یہ کہنا پڑا کہ نہ! یہ تو کوئی انسان کوئی بشر نہیں۔اور ویسے محاورتاً

بھی یہ عام کہا جاتا ہے کہ یہ کچھ ہے۔اور ہمارے ہاں پھر کہتے ہیں وہ تو جی فرشتہ ہوا یعنی بڑا جیسے کسی کو CREDITABLE۔فرشتے میں تو استعداد ہی نہیں ہوتی جرم کرنے کی' گناہ کرنے کی' معصیت کرنے کی۔تو ایسا ہی ہے جیسے کسی سے کہا جائے گا کہ صاحب! یہ بکری کسی کو چیرتی پھاڑتی نہیں ہے۔کیا باتیں یہ سعدی کہہ جاتا ہے

تواضع زگردن فرازاں نکو

اختیار' قوت یا استطاعت رکھنے کے باوجود کسی کے ساتھ انکساری سے پیش آنا ہی حسنِ عمل ہے

یہ جو تکبر' قوت' دولت' حشمت' موعظت والے ہیں وہ اگر خاکساری' انکساری اختیار کریں' توجہ اختیار کریں' چھوٹے کی عزت کریں نکو یہ ہے نیکی۔گدا گر بھیک مانگنے والا اگر انکساری کرتا ہے تو وہ اس کی عادت ہوتی ہے' بلکہ مانگنے کی تکنیک ہوتی ہے۔تو یہ جو چیز ہوتی ہے کہ وہ صاحب! وہ تو فرشتہ ہوا یہ کچھ اس کی قابلِ قدر بات نہیں ہوتی' فرشتہ مجبور ہوتا ہے انسان صاحبِ اختیار ہے۔اپنے اختیار کی قوت رکھتے ہوئے ان چیزوں سے باز رہنا جو ہے یہ بڑا اونچا مقام ہے۔حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا (12:31) یہ تو کوئی انسان نظر نہیں آتا اور واقعی بہت اونچا ہے۔اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (12:31) وہی ہمارا محاورہ کہ یہ تو کوئی فرشتہ نظر آتا ہے' آدمی نہیں نظر آتا۔قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ (12:31) اس نے کہا دیکھ لیا یہ ہے وہ جس کے متعلق مجھے طعنے دیتی تھیں کہ اسے بھی نہ پھسلا سکی' گھر کے نوکر سے بھی نہ یہ کچھ کر سکی۔یہ ہے وہ کذٰلک یہ ہے وہ دیکھ لیا۔

تمام کوششوں کے باوجود میں اپنے پروگرام کو نظر انداز کرنے والی نہیں

وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ (12:32) یہ ہے وہی لفظ عَصَمَ میں نے بہتیری کوشش کر دیکھی کہ اس کو اس کے ارادے سے پھسلا سکوں فَاسْتَعْصَمَ (12:32) یہ چٹان کی طرح جما ہوا رہا۔یہ ہے وہ۔وَ لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ (12:32) لیکن یہ بات سن رکھو اور یہ بھی سن لو کہ میں کوئی ایسی ویسی نہیں' میں بھی اپنے ہٹ کی پکی ہوں' میں ابھی رکنے والی نہیں ہوں میں پھر وہی کچھ کروں گی اور اگر اب بھی یہ اپنی ضد کے اوپر اڑا رہا تو پچھلی دفعہ تو میں نے بات چھوڑ دی تھی' معاف کر دیا تھا اب کے یہ نہیں ہوگا اب کے تو اس کو ذلیل کر کے رہوں گی' اب کے اس کو قید میں بھجوا کے رہوں گی۔TYPICAL چیز ہے ان کے سامنے اپنی عزتِ نفس کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ ہے جو انداز کہ یہ نہ سمجھ لو کہ صاحب! مجھ میں کوئی قوت ہی نہیں تھی میں نے کہا ہی نہیں تھا یہ ٹھیک ہے یہ سب کچھ ہے یہ ٹھیک ہے پہلی دفعہ وہ ہوا تھا' میں نے جانے دیا تم نے اب دیکھ لیا کیسا ہے' اب اس کے بعد تم یہ دیکھنا کہ میں کیسی ہوں۔اور یہ کان کھول کے سن رکھو اب بھی اگر یہ اپنی ضد پہ اڑا رہا تو پھر دیکھو اس کا حشر کیا ہوتا ہے۔اس نے یہ گرجتے'

کڑکتے ہوئے' بجلیوں کی طرح یہ کہا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی خدائے خبیر سے التماس

جواب سامنے سے اسے نہیں کچھ کہا۔ قَالَ رَبِّ (12:33) اے میرے نشو ونما دینے والے! مجھے یہ دھمکیاں دی جا رہی ہیں تو سن رہا ہے۔ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ط(12:33) اے میرے پروردگار جس چیز کی طرف مجھے یہ بلا رہی ہیں اس کے مقابلے میں جیل میں جانا میرے لئے ہزار درجے بہتر ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے اور ان سے یہ نہیں کہا کہ یہ تم یہ کہتی ہو دیکھو پھر میں کیا کرتا ہوں ''گھسُن مار کے تیرا بوتھا سجا دینا''۔ اسے کہا اے میرے نشو ونما دینے والے! اے میرے پروردگار! تو دیکھ رہا ہے کوئی بات ہی نہیں۔ میرے لئے قید میں چلے جانا ہزار درجہ بہتر ہے اس سے مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ (12:33) یہ یہاں جمع کا صیغہ ہے پھر نظر آ گیا کہ یہ ساری عورتوں کے متعلق کہا جا رہا ہے تو گویا ان کا نظریہ سامنے آیا کہ یہ اکیلی نہیں یہ کچھ کر رہی تھی' ان سب نے جو مل کے یہ جو کچھ ایک متا پکایا ہے اس قسم کا' جو کچھ یہ اس کے بعد کریں گی یَدْعُوْنَنِیْٓ(12:33) یہاں جمع ہے ایک عورت نہیں۔ یہ سب مل کے جو کچھ کرنا چاہتی ہیں اس کے مقابلے میں جیل میں جانا ہزار درجے بہتر سمجھتا ہوں۔ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ (12:33) اس سے کہا کہ فی الواقع اگر تو مجھے اس کی توفیق نہ دیتا۔

لفظ صبی کا مفہوم اور خدائے علیم وخبیر اور رحیم وکریم سے توفیق مانگنا اور اس کا ملنا

عزیزانِ من! پھر لفظ ہے کیدھن تو وہی ہے ان کے مکر سے بچنے کے لئے' اگر تیری طرف سے یہ چیز یہ توفیق نہ ہوتو پھر تو انسان اتنا کمزور ہے لفظ ہے اَصْبُ اِلَیْهِنَّ (12:33) میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان میں ایک بات کہنے کے لئے سینکڑوں الفاظ ہوتے ہیں قرآن کا انتخاب ہے اَصْبُ اِلَیْهِنَّ ، صبی بچے کو کہتے ہیں کہ اگر یہ چیز توفیق نہ ہوتی جو کچھ یہ مجھے بہلا پھسلا رہی تھیں تو یہ میرا علم' میری حکمت' میرا بڑا ہونا' یہ سارا کچھ' یہ میرا REASON یہ سارا کچھ چھوڑ کے میں بالکل بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگ جاتا۔ بچے کی حرکت کیا ہوتی ہے؟ وہ ایک کھلونے سے رَیجھ جاتا ہے۔ بچے میں تو REASON نہیں ہوتا' اقدار نہیں ہوتیں' حدود نہیں ہوتیں' صرف جذبہ ہوتا ہے جی میں آیا کہ یہ کھلونا میں نے لینا ہے' اب اس کے بعد صاحب! اگر وہ ماں بیچاری کے پاس پیسے نہیں ہیں یا وہاں یہ وقت نہیں ہے آگے کھینچتی ہے وہ ضد میں وہاں کھڑا ہوا رو رہا ہے' چیخ رہا ہے' لینا ہے چاند کو اس برتن کے اندر ڈالو' وہ ڈالا جائے گا اس کے اندر' UNREASONABLE ہونے کی انتہا ہو جاتی ہے بچہ صرف جذبات کا اتباع کرتا ہے اس میں REASON نہیں ہوتا' پابندی نہیں ہوتی اپنے اوپر کسی قسم کی۔ اس جذبے کی جب تک تسکین نہیں کرتے اس وقت وہ دہائی دیتا چلا جاتا ہے۔ ایک لفظ کہا کہ اگر یہ

بات نہ ہو' تیری طرف سے یہ برہان نہ ہوں' تیری طرف سے یہ اقدار نہ ہوں' یہ خیال نہ ہو تو اس کے بعد تو پھر حالت یہ ہو جاتی ہے ایک بچے کی سی ہو جاتی ہے کہ صرف جذبات کے پیچھے پھرنا ہے کوئی REASON نہیں' کوئی LAW نہیں' کوئی قانون نہیں' کچھ نہیں۔ اگر یہ چیز تیری طرف سے نہ ہوتی میں بالکل یہ کچھ کرنے لگ جاتا۔ یہ کہہ کے کہ میری کیفیت ایک بچے کی سی ہو جاتی' کتنی بڑی بات کہہ گیا ہے۔ عزیزانِ من! خالص جذبات کا اتباع۔ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ (12:33) پھر وہاں یہ صورت ہوتی مجھ سے کہا جاتا کہ سب کچھ دیکھتے بھالتے تیری کیفیت یہ ہوگئی تو سب کچھ ہی بھول گیا۔ بچہ تو اس وقت سب کچھ ہی بھول جاتا ہے جب اس کے سامنے کھلونا آ جاتا ہے۔ میری کیفیت یہ ہو جاتی لیکن میں تجھ سے توفیق مانگتا ہوں۔ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ (12:34) اس نے اس خلوص سے یہ توفیقِ خداوندی مانگی۔ اور جو اس خلوص سے یہ توفیق مانگتا ہے ہم پھر فوراً اسے توفیق دیتے ہیں۔ سن لی خدا نے اس کی یہ بات۔ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ (12:34) جتنی بھی انہوں نے تدبیریں' مکاریاں' وہ کی تھیں یہ سب سے بچ گیا۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (12:34) وہ سننے والا بھی ہے اور آگے بات ہے کہ جاننے والا بھی ہے۔ یہ کہنے والا یہیں سے کہہ رہا ہے یا یہاں سے بات نکلتی ہے ''بڑا ڈاہڈا اے بھائی صاحب'' صرف سننے والا ہوتا تو ہزاروں لاکھوں اس کو پھسلا کے ادھر کے اُدھر ہو جاتے' سنانے کے لئے جو دس دس لاکھ کا گروہ اس کے گھر میں کھڑا ہو کے باوضو اس عرفات کے میدان میں دعائیں مانگ رہا ہے' پچیس سال سے کہ یہ ساتھ جو اتنی سی مملکت بن گئی ہے اس کا بیڑہ غرق کر' یا اللہ اس کو تباہ کر' ہو رہا ہے' اگر وہ صرف سننے ہی والا ہوتا تو واقعی پہلی دفعہ یہ معاملہ جو تھا سب ٹھیک ہو جاتا' ساتھ علیم بھی تو ہے وہ جانتا ہے دلوں کے اندر کیا ہے۔ یہ یہاں کچھ کرنے کے بعد ان سب نے اٹھ اٹھ کے اپنے گھروں کی طرف چلے جانا ہے ورنہ یہ دس لاکھ کہیں یہاں جو یہ کہہ رہا ہے اگر یہ دل کے ارادے سے کہہ رہا ہوتا تو اسی وقت اٹھ کے اُدھر کا رخ کر لیتا' ان کے یہاں چلنے سے پہلے پہلے وہ اس مملکت کو خالی کر کے رہ جاتے' یہ سیلابِ بے پناہ جو تھا اس کا کوئی مقابلہ کر سکتا ہے۔

معززین کا فیصلہ کہ یوسفؑ کو وقتی طور پر جیل میں قید کر دیا جائے

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (12:34) ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ (12:35) یہاں پھر مہذب معاشرے کی ایک بات کہہ گیا ہے کہ سب کچھ ان لوگوں نے جان بھی لیا' سارے بڑے بڑے وزرا امرا اربابِ اقتدار کی یہ بیگمات تھیں' معاشرے کی معزز ترین خواتین تھیں۔ انہوں نے ایک ایک گھر میں جا کے یہ کہا ہوگا کہ اگر تم وہ کچھ ہاتھ اس پہ نہیں ڈالتے' کوئی سزا نہیں دیتے ''ساہڈی تے بے عزتی خراب ہوگئی'' ہم تو ٹکے کی نہیں رہیں گی۔ مشہور یہ ہو جائے گا کہ ہم نے یہ سب کچھ کیا ہوا ہے۔ یہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ قرآن کہتا ہے کہ سب کچھ دیکھنے بھالنے کے بعد بھی کہ انہوں نے فیصلہ یہ کیا کہ یوسفؑ کو جیل خانے میں بھیج ہی دینا چاہئے۔

مہذب معاشرہ جو ہے کس طرح اس کی تصویر کا ایک خدوخال سا چلا آ تا ہے۔مَـــا رَاَوُا الْاٰیٰــتِ (12:35) کھلے کھلے طور پر دیکھ لیا' را ہے' دیکھ لیا سب کچھ کہ یہ واقعی سب کچھ بناوٹ ہے'وہ بڑا ہی پا کباز ہے۔ان کے خلاف کچھ نہیں لیکن پھر بھی سوچا یہ کہ تقاضائے مصلحت یہی ہے حَتّٰی حِیْنٍ(12:35) کچھ وقت کے لئے ہی سہی یعنی یہ تو ہے نہیں کہ جرم ثابت ہو گیا کہ تین سال کی سزا اس کی مقرر ہے وہ دی جائے' بات تو اتنی سی تھی کہ ان کی بات رکھنی ہے حَتّٰی حِیْنٍ(12:35) قرآن یہ کیا بات کہہ جا تا ہے! متعین نہیں' جرم متعین ہو تو سزا متعین ہوتی ہے' تھوڑے ہی وقت کے لئے سہی ٹھیک ہے صاحب! بھیج دو ان کو اندر' یہی اچھا ہے۔بھیج دیا۔اور یہاں سے پھر اس پروگرام کی اگلی کڑی شروع ہوتی ہے جیسا کنعان کی چراہ گاہوں سے مصر کے محلوں میں آنا اس عظیم پروگرام کی ایک پہلی منزل اور کڑی تھی اسی طرح سے ان محلوں سے قید خانے میں جانا جو تھا پھر اس پروگرام کی اگلی کڑی تھی۔وہاں کیا ہوا اسے ہم آئندہ درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ وقت ہو گیا ہے۔سورۃ یوسفؑ کی آیت 35 تک ہم آ گئے 36 آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ(2:127)

❀......❀......❀

چوتھا باب: **سورۃ یوسف** (آیات 36 تا 52)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1974ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یوسف کی آیت 36 سے ہو رہا ہے (12:36)۔

حضرت یوسفؑ کے خلاف سیاست فرعونی کی جھلک کے بنیادی نکات اور قید کے دو ساتھیوں کا ذکر

اور آپ کو یاد ہے کہ اس سورۃ میں حضرتِ یوسفؑ کی داستان مسلسل چلی آ رہی ہے۔ سابقہ درس میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ اس معاشرہ کے اعلیٰ طبقے میں یہ بات پھیل گئی اور انہیں اطمینان ہو گیا کہ حضرتِ یوسفؑ اس میں بے گناہ ہیں' کوئی الزام ان کے سر پر دھرا نہیں جا سکتا۔ یہ ساری سازش وہ عزیز مصر کی بیوی اور دوسری معاشرے کی خواتین کی ہے لیکن ان کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوا کہ اس کے باوجود یوسفؑ کو کچھ عرصے کے لئے قید کر دیا جائے۔ یہ ہے سیاستِ فرعونی۔ آپ دیکھتے ہیں قرآنِ کریم بات تو ایک کہانی کی سی جیسے ہوتی ہے' بیان کرتا جاتا ہے لیکن کتنے اہم نکات اس کے اندر آتے چلے جاتے ہیں یونہی اشارتاً' کنایتاً باتیں اس میں سے نکلتی چلی جاتی ہیں۔ ملوکیت کی سیاست ہوتی ہی مصلحت کے اوپر ہے۔ وہاں حقائق' انصاف' عدل' قانون یہ کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جس کے مطابق فیصلہ کیا جائے وہاں ہوتا یہ ہے کہ مصلحت کا تقاضا کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا' اطمینان کر لیا کہ یوسفؑ بے گناہ ہے لیکن اس کے باوجود یہی مناسب سمجھا کہ اسے لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ط (12:35) کچھ وقت کے لئے قید خانے بھیج ہی دیا جائے۔ حضرتِ یوسفؑ قید خانے میں آ گئے۔ وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ (12:36) اور اسی قید خانے میں' جیل خانے میں دو اور نوجوان بھی قیدی تھے۔ ایک دن ان میں سے قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا وَ قَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ط (12:36) ایک دن ان میں سے ایک نے حضرتِ یوسفؑ سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں بادشاہ کے لئے انگور نچوڑ رہا ہوں تا کہ اس سے شراب تیار کی جائے۔ وہ بادشاہ کی ساقی گری کا فریضہ سرانجام دیتا تھا اور اس وقت کسی جرم میں قید میں تھا۔ تو کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں پھر اسی ساقی گری کے منصب پر فائز ہوں یا وہی فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرے سر پر کچھ روٹیاں ہیں اور یہ کوے اور چیلیں اور گدھیں ان کو نوچ نوچ کر لئے جا رہی ہیں۔ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ (12:36) ہمیں ان خوابوں کی تاویل بتائیے کہ کیا بات ہو گی۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے حضرتِ یوسفؑ سے کیوں پوچھا وہ بھی تو انہی کے اندر ایک قیدی تھے۔ قرآن خود بتاتا ہے انہی کے الفاظ میں کہ انہوں نے ان کی طرف رجوع کیوں کیا۔

حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والے کی کیفیت

کہا کہ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (12:36) ہم نے دیکھا ہے کہ قید کی حالت میں بھی تمہاری زندگی کس طرح حسن کارانہ انداز

سے بسر ہو رہی ہے۔ ہیرے کی فطرت میں روشنی دینا ہوتا ہے' وہ ہر مقام میں' ہر زمان میں' ہر حالت میں روشنی دئے چلا جاتا ہے۔حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والے انسان زمان اور مکان کی خصوصیات سے بالا ہوتے ہیں۔نیکی ان کے اندر سے پھوٹ کر باہر آتی ہے۔وہ مصلحتوں کے تقاضے سے نیک نہیں بنتے۔وہ نیک ہوتے ہیں جیسے شہد میٹھا ہوتا ہے اسے WITH EFFORT میٹھا نہیں بننا پڑتا اسے یہ نہیں سوچنا پڑتا کہ اس وقت مجھے میٹھا ہو جانا چاہئے۔اور میں تو کہونگا کہ اگر وہ کبھی چاہے بھی تو کڑوا نہیں ہو سکتا۔حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والے کی' جسے کہتے ہیں فطرت ہو جاتی ہے کہ اس سے حسنات' حسن کارانہ رویہ بے ساختہ ہر مقام پر باہر آتا چلا جاتا ہے۔یہ نوجوان جیل خانے کی کوٹھڑی کے اندر بھی اس انداز کی زندگی بسر کر رہا ہے کہ وہ جو دوسرے ساتھی قیدی ہیں' انہوں نے بھی یہ محسوس کیا ہے کہ واقعی یہ کوئی بڑا ہی نیکو کار انسان ہے اور اس بنا پر اس کے پاس آ گئے کہ آپ کوئی بزرگ ہیں (جیسے ہم آپ کہتے ہیں) ہمیں بتائیے کہ ان خوابوں کا انجام' تعبیر کیا ہوگی۔

خدا کا پیغام پہنچانے والے کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے

اب یہ دیکھئے انداز! خدا کا پیغام پہنچانے والے ہر موقع سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔فائدہ اٹھا لینے کے معنی EXPLOITE کرنا نہیں بلکہ وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے ہی نہیں دیتے۔حضرتِ یوسفؑ نے ایک سیکنڈ میں ایک چیز ساری سوچ لی۔قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ط(12:37) اسی وقت اس کی تعبیر نہیں بتا دی کہا کہ ہاں! میں تمہیں اس کی تعبیر بتاؤں گا کھانے کے وقت سے ذرا پہلے' اتنا سا توقف کرو۔

زندگی کا ایک نفسیاتی پہلو کسی کو اپنی طرف مرکوز کرنا بھی ہے

اس میں ایک بڑی نفسیاتی چیز ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

ان کی تمنا کی بے تابی تو یہ ہے کہ وہ فوراً معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اس کا انجام کیا ہے۔تو اس سے وہ CONCENTRATE کر دی مرکوز کر دی اپنی توجہ حضرتِ یوسفؑ کے اوپر اور انہوںؑ نے درمیان میں وقت لیا کہ یہ جو چیز ہے یہ کچھ زیادہ عرصے تک یہ ان کے اندر شدت اختیار کر جائے اور وہ پوری توجہ سے میری بات سننے کے قابل ہو جائیں۔اس لئے کہا کہ ہاں! کھانے کے وقت سے پہلے میں تمہیں یہ بات بتا دوں گا۔ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىْ رَبِّىْ ط(12:37) میں تعبیر بتا دوں گا وہ کہ جس کا خدا نے مجھے علم دیا ہے۔یہاں سے عام طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خوابوں کی تعبیر کا علم بھی نبیوں کو وحی کے ذریعے سے ملتا تھا۔

وحی اور خواب کی تعبیر میں فرق

بات یہ نہیں ہے۔ وحی خوابیں نہیں ہوتیں' خوابوں کی تعبیریں بتانے کے لئے نہیں آتی' وحی خدا کی طرف سے انسانوں کی راہنمائی کے لئے متعین' واضح' غیر مبہم الفاظ میں ہدایت آتی ہے۔ خوابوں کی دنیا میں تو ویسے بھی اشارے ہوتے ہیں اور اشارے بھی اس قسم کے کہ ان کی تعبیریں کچھ اور کی اور ہوتی ہیں۔ دیکھا کچھ جاتا ہے' وہ تعبیر بتانے والے اس سے مفہوم کچھ اور لیتے ہیں۔ خوابیں خدا کی طرف سے نہیں ہوتیں۔ یہ انبیا کی وحی کا حصہ نہیں ہوتیں۔ وحی تو بڑی ہی واضح' بڑی ہی متعین اور الفاظ کے اندر وحی ہوتی ہے یہ نہیں کہ صرف نبی کے دل میں خیال ڈالا جاتا ہے اور اس خیال کو وہ اپنے الفاظ میں آگے بیان کرتا ہے۔ یہ الفاظ قرآنِ کریم کے خدا کی وحی ہے یہ خیالات صرف نہیں ہے اور اسی کو وحی کہتے ہیں اس کے علاوہ جو اور آپ کے ہاں مختلف قسمیں وحی کی بنائی گئی ہیں کہ وہ مبشرات ہوتے ہیں اور یہ سابقہ ہوتے ہیں' یہ سارے عجمی تصورات ہیں۔ قرآن کی رو سے خدا کی طرف سے جو نبی کو وحی ملتی تھی وہ یہی وحی تھی جو متعین الفاظ میں آتی تھی اور جو قرآن کے اندر آ گئی۔ اب یہ جو چیز حضرتِ یوسفؑ نے کہا کہ مجھے جو علم دیا گیا ہے خدا نے جو علم دیا ہے میں اس کی رو سے تمہیں بتاؤں گا کہ اس کی تعبیر کیا ہے۔

خدا کی طرف سے انسان کو ملنے والی صلاحیتوں کو بھی علم کہا گیا ہے

یہ علم خدا کی طرف سے جو ملتا ہے یہ صرف وحی تو نہیں ہے وحی کو بھی العلم کہا گیا ہے لیکن ہر علم وحی نہیں ہوتا اور خدا کی طرف سے جو علم دیا جاتا ہے یہ سمجھ لیجئے ایک بنیادی حقیقت کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں دے دی ہیں' ودیعت کر کے رکھ دی ہیں' انہیں وہ خدا اپنی طرف سے کہتا ہے کہ ہم نے دی ہیں۔ ان صلاحیتوں کی بنا پہ انسان جو حاصل کرتا ہے بعض مقامات پر خدا اسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم نے یہ چیز دی۔ مثلاً بنیادی طور پہ اسے دیکھ لیجئے قرآنِ کریم میں ہے **عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ** (96:5) خدا نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو کچھ یہ نہیں جانتا تھا۔ یہ تو ہر انسان کے متعلق بات ہو گئی۔ اتنا ہی نہیں آگے یہ کہا کہ **عَلَّمَ بِالْقَلَمِ** (96:4) خدا نے اسے قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا۔ اب یہ تو واضح ہے کہ ہم میں سے کسی کو بھی خدا آ کے تو قلم کے ساتھ لکھنا نہیں سکھاتا تختی پہ' وہ تو استاد سکھاتا ہے' بچہ اپنی محنت سے سیکھتا ہے۔ یہاں آپ دیکھتے ہیں کہ پوری نسبت خدا نے اپنی طرف کی ہے ہم نے انسان کو سکھایا **عَلَّمَهُ الْبَیَانَ** (55:4) دوسری جگہ ہے ہم نے اس کو بولنا سکھایا۔ اب یہ واضح ہے کہ خدا تو ہر فرد کو بولنا نہیں سکھاتا' وہ اسے قلم سے لکھنا نہیں سکھاتا' وہ خود آ کے تو اسے تعلیم نہیں دیتا یہ کیا چیزیں ہیں جو کہی گئی ہیں؟ معنی اس کے یہ تھے کہ ہم نے انسان کے اندر یہ صلاحیت رکھ دی کہ وہ علم حاصل کرے۔ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے دونوں طرح سے صلاحیت رکھ دی قوتِ گویائی سے اور تحریر کے ذریعے سے۔ تو ایسے

مقامات جہاں یہ چیز آئے کہ خدا نے یہ علم دیا' خدا نے یہ کیا' خدا نے یہ بتایا' تو غیر از نبی کے لئے یاد رکھئے جہاں بھی یہ چیز آئے گی اس کے معنی وحی نہیں ہونگے اور نبی کے لئے بھی جہاں یہ چیز آئے گی جہاں اس کی بشری حیثیت سے یہ چیز آئے گی وہاں مفہوم وحی نہیں ہوگا وہ یہ چیز ہوگی کہ اس کے اندر اس کی استعداد رکھ دی گئی ۔ سورۃ مائدہ میں وہ آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے تمہیں شکار کرنا سکھایا(5:4)۔ یہ آپ سوچتے ہیں خدا جہاں جہاں یہ چیزیں کہتا ہے کہ ہم نے سکھایا ہم نے بتایا' وہ وحی نہیں ہے' وہ الہام نہیں ہے' خدا کی طرف سے براہِ راست کوئی علم نہیں ملتا' ہر انسان کے اندر جو صلاحیت اور استعداد خدا کی طرف سے ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے اس کے لئے یہ الفاظ آتے ہیں۔ اس لئے حضرتِ یوسفؑ نے بھی جو یہاں کہا ہے کہ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ؕ (12:37) کہ یہ تاویل اس علم کی بنا پہ میں تمہیں دونگا جو خدا نے مجھے دیا ہے۔ تو یاد رکھئے! یہ وحی نہیں ہے یہ وہی علم ہے کہ جو ہر انسان کو ملتا ہے اور اس میں پھر انسان اپنی اپنی محنت کے مطابق' کوشش کے مطابق ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔

آئندہ دور میں سائیکولوجی کے علم کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا

میں نے پچھلی دفعہ بھی یہ عرض کیا تھا کہ ان خوابوں کے متعلق ہمارے اس دور میں یہ جو سائیکولوجی کا علم چلا ہے ابھی تو وہ اپنی طفولیت کے زمانے میں ہے تو اس میں خوابوں کو کافی اہمیت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے اندر نفسِ غیر شعوری ہے UNCONSCIOUS MIND ہے اس کے بہت سے خیالات' اس کی پژمردہ آرزوئیں' ناکام تمنائیں' اس کے حسین خواب جو دن بھر دیکھتا ہے وہ اس کے سٹور ہاؤس کے اندر جمع ہوتے رہتے ہیں اور جب شعوری نفس یا CONSCIOUS MIND وہ روبہ عمل نہیں ہوتا تو اس وقت پھر اس سٹور ہاؤس سے یہ چیزیں نکلتی ہیں۔ اور میں نے جو مثال دی تھی اس کو پھر دہرا دوں کہ جس طرح سینما کی کسی فلم کو کاٹ دیا جائے' ٹکڑے کر دیا جائے ایک ایک جو ٹکڑا اس کا ہوتا ہے الگ الگ کر کے اور اس کو ملا دیا جائے اور پھر اس میں سے ایک ایک ٹکڑا اٹھایا جائے تو ہر ٹکڑے کے اوپر تصویر کا کوئی نہ کوئی حصہ تو ہوگا لیکن ان میں ربطِ باہمی نہیں ہوگا۔ وہ ایک کے بعد دوسری تصویر آئے گی یہاں گھوڑا آ جائے گا اس کے بعد اگلا ٹکڑا جو ہے ہوائی جہاز کا آ جائے گا وہاں ایک عورت آ جائے گا وہاں کہیں باغ ہوگا پھل لگا ہوگا کہیں درخت نظر آئے گا یعنی وہ عجیب قسم کا غیر مربوط ملغوبہ ہو جائے گا۔ خوابیں یہ ہوتی ہیں۔ اور سائیکولوجی والے اب اس پہ محنت کر رہے ہیں کہ وہ اس طرح سے ملے ہوئے ٹکڑوں میں ربط پیدا کر کے کسی نتیجے پر پہنچیں کہ یہ بات کیا ہوئی۔ تو خوابیں یہ ہوتی ہیں۔ یہ جو کہا ہے کہ مجھے خدا نے علم دیا تو بہت پہلے زمانے کی بات میں بھی حضرتِ یوسفؑ اس کو علم کی حد میں لے آئے ہیں حالانکہ یہ علم کی حد کے اندر ہمارے دور میں آ کر یہ چیز پہنچی۔

دو قیدیوں کے ساتھ حضرت یوسفؑ کا اپنا تعارف

انہوںؑ نے کہا کہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ یہ کیا بات ہے۔اور آگے چل کے ایک لفظ آتا ہے کہ جس میں آپ دیکھیں گے کہ یہ وحی نہیں تھی۔اور اس کے بعد اپنا تعارف کراتے ہیں۔مصر میں فرعون کے جیل خانے میں ہیں وہ قوم مشرکوں کی قوم تھی خدا پر بھی کہیں ایمان نہیں رکھتی تھی آخرت پر بھی ایمان نہیں رکھتی تھی۔تو تعارف کراتے ہیں کہ پہلے یہ بات سمجھ لو کہ میں اس قوم کا فرد نہیں ہوں نہ ہی میرے یہ عقائد ہیں جو اس قوم کے عقائد ہیں اِنِّیۡ تَرَکۡتُ مِلَّۃَ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ (12:37) میرے یہ عقائد نہیں ہیں میں ان سے الگ ہوں۔وَ اتَّبَعۡتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ؕ(12:38) میں اس مسلک کا پیرو ہوں جو میرے آباءؑ ابراہیمؑ اسحاقؑ یعقوبؑ کا مسلک تھا میں اس خاندان میں سے ہوں میں ان کے مسلک کا پیرو ہوں اِن کے مسلک کا پیرو نہیں ہوں پہلے یہ بات سمجھ لو ان میں سے نہیں ہوں۔تو پہلے اپنا تعارف کرایا۔اب نظر آتا ہے کہ اگرچہ اہلِ مصر کا مذہب یہ نہیں تھا لیکن وہ ان کے مذہب' مسلک' عقائد سے واقف ضرور ہونگے کہ انہوںؑ نے کہا کہ میں تو اپنے باپ ابراہیمؑ' اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے مسلک پر ہوں۔

عربی لغت کے تحت لفظ آبا کی وضاحت اور ایک اہم مسئلہ کی نشاندہی یعنی مرے کو مارے شاہ مدار

ضمناً یہاں ایک لفظ آ گیا ہے۔عربی زبان میں اب جس کی جمع اٰبَـآء ہے یہ صرف باپ کو نہیں کہتے بلکہ باپ کے اوپر جتنا سلسلہ چلتا ہے باپ' دادا' پردادا ان سب کو وہ اب کہتے ہیں اور اٰبَـآء کہتے ہیں۔ہمارے ہاں بھی یہ لفظ آباؤ اجداد استعمال ہوتا ہے صرف باپ کے لئے نہیں ہوتا اوپر تک ہوتا ہے۔اسی طرح سے نیچے ولد کا لفظ صرف بیٹے کے لئے نہیں ہوتا بیٹا' پوتا' پڑپوتا نیچے تک یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔آپ کہیں گے کہ یہ بات میں نے کیوں چھیڑ دی؟ بڑی اہم ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں یتیم پوتے کو حصہ نہیں ملتا دادا کی وراثت سے۔یعنی ایک شخص کے دو بیٹے ہوں ان میں سے ایک بیٹا اس کی زندگی میں مر جائے تو اس کے بچے یتیم ہو جائیں گے اور دوسرا بیٹا زندہ ہو تو یہ دادا کی جتنی جائیداد ہے یہ اس کو ملے گی جو وہ زندہ بیٹا ہے یہ جو یتیم پوتے ہیں وہ محروم ہو جاتے ہیں اس کی جائیداد سے۔آپ سوچئے ہمارے ہاں کے یہ فقہ کے مسائل ہیں' مرے کو مارے شاہ مدار۔کہ جی! وہ جو ہے وہ تو ولد کے لئے یا اولاد کے لئے ہے اور وہ تو بیٹے ہیں۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ عربی زبان میں بھی یہاں اب جو ہے یہ صرف باپ کے لئے نہیں آتا اوپر تک وہ لے جاتے ہیں اسی طرح سے ولـــــد بھی صرف بیٹے کے لئے نہیں آتا نیچے تک آ جاتا ہے۔وہ بیٹا مر گیا ہے تو اس کا بیٹا بیٹے کی جگہ بیٹا ہو جاتا ہے عربی زبان کی رو سے قرآنِ کریم کی رو سے۔لیکن یہاں ان کے ہاں عجیب تماشا ہے یہ شخص جس کے یہ بیٹے تھے اس کا یہ جو ایک بیٹا مر گیا ہے اس کے بعد اس کا پوتا رہ گیا اگر یہ پوتا مر جائے تو پوتے کی جائیداد کا دادا کو تو حصہ دیدیتے ہیں کہ جی! وہ باپ ہے اور

اس دادا کی جائیداد سے یتیم پوتے کو حصہ نہیں دیتے کہتے ہیں بیٹا نہیں ہے۔

یتیم کو حصہ دلانے پر پرویز کو کفر کا فتویٰ

جو پرویز کے خلاف کفر کا فتویٰ لگا تھا اس میں یہ شق بھی تھی کہ یہ یتیم پوتے کو حصہ دلاتا ہے۔ حصہ چھیننے والوں کے خلاف تو کوئی جرم عائد ہوسکتا ہے یہاں حصہ دلانے والے کے متعلق یہ کہا جارہا ہے۔ بات ضمناً آئی تھی کہ اٰبَآءِیْ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ (12:30) عربی زبان میں یہ چیز کہتے ہیں اور ہر زبان میں یہ کہتے ہیں ہمارے ہاں آباؤ اجداد کہتے ہیں انگریزی میں FORE FATHERS آپ کہتے ہیں تو وہ باپ تک تو نہیں ہوتا وہ سارے ہی FORE FATHERS کہلاتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کی دو قیدیوں سے تفصیلی گفتگو

بات ضمناً تھی کہ میں ابراہیمؑ' اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے مسلک کا پیرو ہوں میں ان کے مسلک کا پیرو نہیں ہوں جو نہ خدا کو مانتے ہیں نہ آخرت کو مانتے ہیں۔ اور آگے بات آئی جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ (12:38) میں خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں رکھتا۔ عزیزانِ من! قید خانے کے اندر وعظِ یوسفی ملاحظہ فرمائیے۔ خیر! یہاں تک بھی یوں نظر آتا ہے جیسے عقیدہ ہی بیان ہو رہا ہے کہ میں شرک نہیں کرتا۔ ابھی اسی سانس میں دیکھیں گے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ قید خانے کے اندر' فرعون کی ملوکیت کے استبداد میں جکڑے ہوئے' اس کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے وہاں کے دو آدمیوں سے بات کر رہے ہیں اور نظر آتا ہے کہ جو دونوں قیدی تھے وہ کوئی عام قیدی نہیں تھے' یہی چیز بادشاہ کی ساقی گری یا تقسیمِ رزق کے مناسک جن کے ذمے تھے وہ بہرحال وہاں کے نامور آدمی تھے' ان کے ساتھ یہ باتیں ہو رہی ہیں۔ ابھی دیکھئے یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ یہاں تک تو وہ شرک کی بات صرف کہی کہ ہمارے ہاں جو اسے صرف بت پرستی تک محدود کر دیا جاتا ہے۔

لفظ توحید جو مقامِ انسانیت ہے ان کی اور شرک کی وضاحت

کہا کہ میں اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرتا۔ اور آگے بڑی چیز ہے۔ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا (12:38) یہ خدا کا بہت بڑا فضل ہے ہمارے اوپر' کیا فضل؟ کہ ہم شرک نہیں کرتے۔ یہ بات باعثِ فضیلت کس طرح سے ہے' یہ فضلِ خداوندی خاص طور پہ گنایا گیا ہے یہ کیا بات ہے؟ عزیزانِ من! بڑی بات ہے جو یہ کہہ گیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں تو سمٹ کر جس طرح سے عبادت صرف اس شکل میں آ گئی جسے ہم نماز کہتے ہیں' اسی طرح سے شرک اور توحید بھی یہ آ گئی: توحید اپنے ذہن میں الفاظ میں کہنا خدا ایک ہے بس یہ توحید ہے اور شرک وہ کہ خدا کے ساتھ اوروں کو خدا بنا لینا اور سمٹ سمٹا کے بت پرستی۔ لیکن یہ تو بہت بڑی چیز ہے توحید مقامِ انسانیت کا تعین ہے

شرک اس کے پستی میں گر جانے کا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کائنات میں ہر شے انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر دی گئی تو گویا کائنات کی جتنی چیزیں ہیں وہ تو انسان کے محکوم بنا دی گئیں۔ ان کائنات کی قوتوں میں سے کسی کو بھی خدائی اختیار کا یا انسان سے بالا قوت تسلیم کرنا یہ تو حقیقت کے خلاف ہوا (قرآن کی بتائی ہوئی حقیقت)۔ یہ دیوی دیوتا ان کے ہاں اگنی دیوی' یہ بادل دیوتا' سورج دیوتا' چاند دیوتا' ہوا دیوی' زمین خود ماتا دیوی یعنی فطرت کی ان قوتوں کو اپنے اوپر معبود تصور کر لینا انسانیت کی ذلت ہے کہ جو چیزیں اس کے تابعِ تسخیر بنائی گئی ہیں یہ ان کے تابعِ مسخر ہو جاتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو قرآن کی رو سے آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوئی تھیں یہ آدم ملائکہ کا مسجود ہے' یہ انہیں مسجود سمجھ لیتا ہے۔ یہ انسانیت کے مقام کی تذلیل ہے' کائناتی قوتوں میں سے کسی کو بھی انسان اپنے سے بالا اگر تصور کرتا ہے۔ شرک کا آدھا حصہ تو چلا گیا یوں' آگے بات رہی کہ انسانوں میں سے کسی کو ایسا تصور کر لینا کہ یہ اس کے تابعِ فرمان ہے یعنی اس سے نیچے ہے قرآن نے کہا **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ** (17:70) ہر انسانی بچے کو ہم نے یکساں واجب التکریم اور واجب التکریم بنایا ہے اس لئے کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کے متعلق یہ کہہ دینا کہ میں اس کا محکوم ہوں وہ میرا حاکم ہے یہ انسانیت کے مقام کی تذلیل ہے اور یہ سب چیزیں شرک ہیں۔

کسی انسان کا کائناتی قوتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اگر شرک ہے تو کسی انسان کے سامنے جھک جانا بہت بڑی ذلت ہے

آیئے دیکھیں توحید۔ میں کہہ رہا تھا کہ انہوں نے کہا **ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ** (12:38) کہا ہم پہ' انسانوں پہ یہ خدا کا کتنا بڑا فضل ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اکثریت انسانوں کی اس بات کو سمجھتی نہیں ہے کہ کسی ایک انسان کا فطرت کی قوتوں کے سامنے یا اپنے جیسے انسان کے سامنے جھک جانا کتنا بڑا ذلت کا باعث ہے اور جو تعلیم جو وحی خدا کا جو فرمان اس قسم کی ذلت سے انسانوں کو بچا لے کتنا بڑا خدا کا احسان اور فضل ہے انسانوں کے اوپر کہ ذلت اور پستی' محکومیت اور محتاجی کی ان زنجیروں سے اس نے آزاد کر دیا انسان کو۔ یہ ہے فضل جو کہا گیا ہے۔ توحید فضلِ خداوندی ہے۔ اب دیکھئے میں نے کہا ہے کہ دونوں طرف سے' خارج میں فطرت کی قوتوں کے سامنے جھکنے سے' اپنے جیسے انسانوں کے سامنے جھکنے سے آزاد کر دیا خدا نے انسان کو' اس کا یہ بہت بڑا فضل ہے۔ یہ تو ہے شرک سے آزادی' توحید پھر کیا ہے؟ آگے آتا ہے۔ یہاں تو یہ پہلے NEGATIVE (نفی) کی بات تھی کہ ان کے سامنے بھی نہیں جھکنا' اس کے سامنے بھی نہیں جھکنا' یہ شرک ہے۔ خدا کا بڑا احسان ہے انسانوں کے اوپر کہ اس نے اسے اس قسم کے شرک سے آزادی دلائی' اس قسم کی غلامی سے آزادی دلائی' ان زنجیروں کو توڑ کے پھینک دیا۔ یہ منفی چیز تھی یہ لا الہ کا

حصہ ہے' کوئی الٰہ نہیں ہے۔

حضرت یوسفؑ کا اپنے ساتھیوں سے ایک اہم سوال

اس کے آگے ایک حصہ آتا ہے اور وہ یہ ہے دیکھئے بندی خانے کی کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے ایک قیدی کی حیثیت سے انہیں یہ کہتے ہیں یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ (12:39) اے میرے قیدخانے کے ساتھیو!۔اپنے آپ کو ان سے اونچا نہیں بتایا' قرآن کا اعجاز ہے۔جیسے تم قیدی ویسا ہی میں قیدی' اے قیدخانے کے میرے ساتھیو! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ءَاَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ (12:39) کہو! کسی ایک آقا کی غلامی اور ملازمت اچھی ہوتی ہے یا بہت سے آقاؤں کی غلامی کرنا اچھا ہوتا ہے۔آپ نے دیکھا کہ مردِ مومن کسی موقع کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ان کو ایک طلب اور محتاجی تھی اسؑ کے پاس بیٹھنے کی' بات سننے کی' خوابوں کی تعبیر انہوں نے سنی تھی وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ صاحب! کیا آپ نے یہ وعظ شروع کر دیا۔انہوں نے خوابوں کی تعبیر ان سے پوچھی انہوںؑ نے وقت لے کے اس میں سے فائدہ اٹھایا کہ یہ کہو ایک آقا کی غلامی یا بہت سے آقاؤں کی غلامی۔ کون کہے گا کہ بہت سے آقاؤں کی اچھی ہوتی ہے۔دلیل وہ جو اس سطح کے اوپر بھی سمجھ میں آ جائے۔اور پھر کہا کہ وہ آقا پھر نہ تو کوئی فطرت کی قوت اور نہ کوئی انسان ہو اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ (12:39) ایک خدا' واحد اور پوری قوتوں کا مالک خدا۔کہو! یہ مسلک اچھا ہے یا یہ جو میں کہہ رہا ہوں ایک کی غلامی اور وہ ایک بھی کوئی انسان نہیں' کوئی ذہنی معبود نہیں' فطرت کی قوتیں نہیں۔کہا یہ چیزیں تم جن کی عبادت' معبودیت اختیار کئے ہوئے ہوتے ہو۔

لفظ معبودیت کا لغوی اور قرآنی مفہوم پرستش نہیں بلکہ اطاعت کرنے کا ہے

مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلَّاۤ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ (12:40) یہ جن کی معبودیت تم اختیار کئے ہوئے ہو۔میں ابھی لفظ معبودیت استعمال کر رہا ہوں کہ اس کا صحیح لفظ ذرا آگے آتا ہے قرآن کی رو سے کہ کیا ہوتی ہے یہ معبودیت' کیا ہوتی ہے یہ عبادت۔تَعۡبُدُوۡنَ(12:40) کا لفظ یہاں آیا ہے ہمارے ہاں تو سیدھا سا ترجمہ ہو جائے گا کہ جن اپنے معبودوں کی پرستش تم کرتے ہو۔معبود تو یہاں پھر وہی پتھر کے بت ہو گئے جن کو خدا بنا لیا جائے گا یا دیوی دیوتا' تعبدون ہو گیا پرستش کرنا یہ جن کی تم پرستش کرتے ہو۔ دیکھئے قرآن کیا بتاتا ہے! کہا بہرحال یہ جن کے سامنے تم جھکتے ہو وہ کیا ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ (12:40) چند نام ہیں جو رکھ لئے گئے ہیں کچھ تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے کچھ تم نے نام رکھ لئے' نام ہیں یہ رکھے ہوئے' ان کی یہ حقیقت نہیں ہے۔ذہنوں کے اندر عقیدتاً نظریہ کے طور پر کچھ الفاظ چلے آ رہے ہیں انہیں تم لوگوں نے معبود بنایا ہوا ہے

جنہیں معبود بنایا ہوا ہے ان میں تو یہ کوئی قوت اور اختیار و اقتدار نہیں ہے۔ چند نام رکھے ہوئے ہیں تھیٹر کے ایکٹر میں کوئی بادشاہ بنایا ہوا ہوتا ہے کوئی وزیر بنایا ہوا ہوتا ہے' کوئی کمانڈر ان چیف ہوتا' پردے کے باہر یہ سارے ان کے نام رکھے ہوئے ہوتے ہیں آپ کے افسانہ نگار نے اور ناول نگار نے' ان میں سے ہر ایک ذرا پردے کے پیچھے جائے تو وہی روپ جو روز ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کو سمجھنے یا سمجھانے کی سند خود قرآنِ حکیم کی ہونی چاہیے

کہا یہ تو نام تم نے رکھ لئے ہیں کیا تھیٹر کے ایکٹر کا نام بادشاہ رکھنے سے وہ پھر بادشاہ ہو جاتا ہے وہ شہنشاہِ اعظم ہو جاتے ہیں؟ وہ تو وہی کا وہی ہوتا ہے۔ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے' ان کی حقیقت یہ نہیں ہے جو کچھ تم سمجھتے ہو۔ مَّآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ(12:40) کیوں نہیں ہیں یہ حقیقت؟ خدا نے ان کے لئے کسی قسم کی کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔ تو اگلی بات یہ ہو گئی کہ کسی کو جو کچھ بھی آپ نے سمجھنا ہو' اس کے متعلق خدا کی سند ہونی چاہئے کہ اسے کیا سمجھا جائے گا۔ یونہی نہ کسی کو آپ حضرت جی سمجھ سکتے ہیں' نہ کوئی مقرب سمجھ سکتے ہیں' نہ اولیاء اللہ سمجھ سکتے ہیں خدا کی سند ان کے لئے نہیں ہے۔ اب یہ دیکھئے تَعۡبُدُوۡنَ(12:40) اور معبود اور وہ جو توحید کہی تھی' شرک کہا تھا' اب اس کی وضاحت یہاں آئی۔ یہ کہا یہ تھا کہ جن کی تم تعبدون (میں نے کہا ہے میں لفظ وہی استعمال کرتا جا رہا ہوں) عبادت کرتے ہو کہا کہ نہیں! اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) حقِ حکومت صرف خدا کو اختیار ہے' یہ توحید ہے' حقِ حکومت کا سزاوار کسی اور کو سمجھنا یہ شرک ہے۔ تو تعبدون کے معنی پرستش کرنا نہیں' اطاعت کرنا ہے' آج کی اصطلاح میں محکومیت اختیار کرنا ہے۔ معبود کے معنی وہ نہیں جس کی پرستش کی جائے' وہ ہے جس کی اطاعت کی جائے' جس کی محکومیت حاصل کی جائے' جس کے لئے حقِ حکومت سمجھا جائے اس کا سزاوار اس کو قرار دیا جائے۔ قرآن کی توحید یہ ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور پھر یہ چیز تو ذہنی ہو جائے گی حقِ حکومت تو اسے حاصل ہے جس کو نہ ہم نے کبھی دیکھا' نہ براہِ راست سنا' نہ کبھی سامنے آیا اور اس نے کچھ سامنے حکم نہیں دیا تو وہ ایسے کی حکومت کیا' حکومت اس کے بعد پھر ان کے نزدیک ذہنی ہو گئی کہ ہاں صاحب! آدمی کو چاہئے کہ عقیدہ یہ رکھے کہ ٹھیک ہے حاکمِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہی ہے اور پھر یہ محکومیتیں سارے انسانوں کی اختیار کرتا چلا جائے۔ مملکت کے اندر اقتدارِ اعلیٰ اور یہ جو دوسری مملکتِ کبریٰ ہیں ان کے نزدیک بہت بڑی مملکت جو زیرِ زمین ہوتی ہے۔ اس میں خدا کے مقربین اور عقیدہ یہ رکھے کہ حقِ حکومت خدا کو حاصل ہے۔

حکومت کا حق صرف خدا کو ہے جس کا عملی ذریعہ اس کے احکام ہیں' اس کی کتاب ہے

عزیزانِ من! یہ صرف عقیدے کی بات نہیں ہے کہ خدا کو مان لیا' حقِ حکومت کسی اور کی' اس نے خود کہہ دیا ہے کہ میرے حقِ حکومت کے معنی یہ ہیں کہ مَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ(5:44) ہم نے یہ کتاب نازل کر دی ہے' اطاعت ہمیشہ

قانون کی کی جاتی ہے۔خدا کی اطاعت خدا کے قانون کی اطاعت ہوگی اس کا قانون اس کتاب کے اندر منضبط محفوظ ہے۔لہٰذا اب عملی بات آ گے ہے کہ خدا کی کتاب کی حکمرانی' یہ توحید ہے اور اس کے علاوہ کسی کی حکمرانی' یہ شرک ہے۔جنہیں تم سمجھتے ہو کہ انہیں حقِ حکومت حاصل ہے اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ (12:40) نام ہیں کچھ تم نے رکھ لئے' کچھ تمہارے بڑوں نے رکھ لئے۔اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) اسے یاد رکھئے کہ قرآنِ کریم نے جہاں بھی عبادت کا لفظ استعمال کیا ہے' حکومت کے معنوں میں استعمال کیا ہے' حکمرانی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔خدا کی عبادت کے معنی ہیں خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔زیادہ نہیں تو ضمناً دو ایک حوالے تو آپ لے لیجئے۔قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنۡ كَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا (18:110) یہ کہا انہوں نے کہ الٰہ واحد صرف خدا ہے جو شخص بھی خدا کے حضور حاضر ہونے کے متعلق یقین رکھتا ہے' اسے چاہئے کہ عملِ صالح کرے۔وَّلَا یُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا (18:110) یہاں لفظِ عبادت آیا ہے اور خدا کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔

خدا اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا اور یہی اس کی عبادت ہے اور یہی اس کا امر ہے

میں نے کہا ہے کہ یہاں لفظ جو ہے یہ عبادت آیا ہے اسی سورۃ میں چند آیات پہلے خدا کے متعلق کہا ہے اَبۡصِرۡ بِهٖ وَ اَسۡمِعۡ مَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا یُشۡرِكُ فِیۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا (18:26) وہاں عبادت کا لفظ ہے یہاں حکم کا لفظ آ گیا خدا اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا لہٰذا اس کی عبادت' اس کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔میں نے عرض کیا تھا قرآنِ کریم تو اپنے الفاظ کے معنی خود واضح کر دیتا ہے اپنی آیات کا مفہوم خود مشرح کر دیتا ہے۔ایک جگہ لفظِ عبادت کہا ہے دوسری جگہ حکم کا لفظ استعمال کیا ہے۔یہی چیز ہے جو حضرتِ یوسفؑ تہ خانے کی کوٹھڑی میں اپنے قیدی ساتھیوں سے کہتے ہیں کہ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔اور آیئے پھر یہاں قرآن کا اعجاز' دہرا دیا اَمَرَ (12:40) اس نے حکم دیا ہے اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ (12:40)

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے الفاظ ملا لیجئے درس کا انداز یہی ہوتا ہے اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) خدا کے سوا کسی کو حق حکومت نہیں ہے امر اس نے حکم دیا ہے اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ (12:40) کہ اس کے سوا کسی کی' اگر لفظ عبادت لائیں گے تو آپ دیکھ لیجئے' معنی کیا ہو گئے۔حق حکومت صرف اس کو حاصل ہے اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو' کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔عزیزانِ من! یہ ہے عبادت کا مفہوم' یہ ہے خدا کو معبود قرار دینے کے معنی۔وہی جسے قرآن نے خود حکومت کہا ہے' حکم کہا ہے' محکومیت معبودیت ہو گئی۔ذٰلِكَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (12:40) یہ ہے محکم نظامِ زندگی۔وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (12:40) لوگوں کی

اکثریت اسے نہیں جانتی۔جن کے پاس قرآن نہیں تھا ان کا نہ جاننا تو قابلِ فہم ہوسکتا ہے قرآن کے ماننے والے اور قرآن کو سامنے رکھنے والوں کی بھی اگر یہ کیفیت ہوجائے کہ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ(12:40) تو پھر انسان کہاں سے علم حاصل کرنے جائے گا۔

ہم نے احکامِ خداوندی کی بجائے بادشاہ کو ظل اللہ علی الارض کہنا شروع کر دیا

اب اس باب میں سب سے زیادہ پیچھے' یہ وہی ہیں جو قرآن پہ ایمان رکھنے کے مدعی اور اس کی تلاوت کرنے کے دعویدار ہیں۔ یہاں عبادت کے معنی پرستش کئے' معبود کے معنی وہ جس کی پرستش کی جائے' پرستش وہی جو ہمارے ہاں آپ کے سامنے عام طور پہ ہوتا ہے اور اس کے بعد حقِ حکومت جو ہے وہ دنیا کے ہر انسان کو حاصل ہوگیا۔اس حد تک حاصل ہوگیا کہ یہاں کے بادشاہ کو ظل اللہ علی الارض کہا گیا زمین پر خدا کا سایہ۔حق حکومت تمام انسانوں کے اندر آ گیا' یہ قرآن کے ماننے والوں کی کیفیت یہ ہے۔ذٰلِکَ یہاں الگ چیز ہوگئی' محکومیت الگ ہوگیا' حکمران الگ ہوگیا' معبود الگ ہوگیا' پرستش اور چیز ہوگئی' اطاعت اور چیز ہوگئی اس لئے کہ وہ دین تھا یہ مذہب اور اس نے کہا ہے ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ(12:40)' دین میں اس کے معنی یہی ہونگے۔دین میں خدا کو جب حاکم کہا جائے گا تو اس سے مراد حکمرانی ہوگی جب عبادت کہا جائے گا تو اس کے معنی خدا کے احکام کی اطاعت ہوگی۔معبودیت' محکومیت کے معنوں میں ہوگی۔

حضرت یوسفؑ کا دورانِ قید اپنے ساتھیوں کے سامنے کیا جانے والا وعظ

مذہب میں یہ معنی جو ہیں پرستش کے معنوں میں آ جائیں گے۔اسی لئے قرآن نے کہا ہے ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (12:40) وعظ یوسفؑ قید خانے کی کوٹھڑی کے اندر اپنے ساتھیوں کے ساتھ۔اور اس سے بڑی بغاوت بھی کوئی اور ہوسکتی ہے جو یہ وہاں پھیلا رہے تھے کہہ رہے ہیں کہ جسے تم بادشاہ سمجھ رہے ہو وہ تو یونہی اس کا نام رکھا ہوا ہے' ایکٹر ہے ارے! اس کی اطاعت' اس کی عبودیت' اس کی محکومیت شرک ہے' کفر ہے' درجہ انسانیت سے گرنے کی بات ہے' تذلیلِ انسانیت ہے۔اسی بادشاہ اور بادشاہ فرعون جن کی فرعونیت دنیا میں آج تک ضرب المثل ہے' فرعونیت کے استبداد کے شکنجے میں کسا ہوا قیدی' جیل خانے کی کوٹھڑی کے اندر اپنے لوگوں سے نہیں' اسی بادشاہ کے جو مصاحب ہیں' ان سے بات کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یہ جس انسان کی تم محکومیت اختیار کرتے ہو' یہ تو وجہ تذلیلِ انسانیت ہے' تم کیا کر رہے ہو' حقِ حکومت اسے حاصل نہیں ہے' حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔یہ وعظ کہا جا رہا ہے قید خانے کے اندر' فرعون کے استبداد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔عزیزانِ من! اللہ کے بندوں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔

خوابوں کی تعبیر اور فرعون کے زمانے میں پھانسی دینے کے طریق کا ذکر

بات یہ ذہن نشین کرانے کے بعد اب دیکھا کہ وہ جس مقصد کے لئے یہ سن رہے تھے۔یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ اَمَّاۤ اَحَدُکُمَا

فَیَسۡقِیۡ رَبَّہٗ خَمۡرًا ۚ وَ اَمَّا الۡاٰخَرُ فَیُصۡلَبُ فَتَاۡکُلُ الطَّیۡرُ مِنۡ رَّاۡسِہٖ (12:41) میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جس نے دیکھا ہے کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے' وہ بری ہو جائے گا اور بادشاہ کی ساقی گری کرے گا اور جس کے تحت الشعور نے یہ بتایا ہے کہ اس کے سر پہ روٹیاں ہیں اور وہ نوچ کے لئے جا رہی ہیں یہ گدھیں اور یہ چیلیں' نظر آتا ہے کہ وہ صلیب دیا جائے گا۔ اور صلیب پہ اس زمانے میں آپ کو معلوم ہے کہ وہ پھانسی کی طرح نہیں تھی کہ جھٹکے کے بعد فوراً اتار دیتے تھے' صلیب پہ زندہ گاڑ دیتے تھے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں ٹھونک کے اور وہ وہاں EXHAUST ہو کے مرتا تھا یعنی وہ وہاں کی اذیت بھوک پیاس تپش پھر آپ سوچتے ہیں کہ اگر وہ خون بھی نکلتا تھا تو اس اذیت سے مرتا تھا صلیب والا جو تھا۔ اور مرنے کے بعد پھر وہ وہاں جو ٹنگا رہے گا تو پھر اس کا گوشت اور اس کے پوست جو ہیں وہ تو یہ گدھیں اور چیلیں نوچ کے لے ہی جائیں گی۔ تو وہ کہا یہ کہ یہ جس نے دیکھا ہے کہ اس کے سر پر سے روٹیوں کو وہ نوچ نوچ کے لئے جا رہی ہیں' نظر آتا ہے کہ وہ صلیب دیا جائے گا اور اس کی یہ کیفیت ہو گی۔ قُضِیَ الۡاَمۡرُ الَّذِیۡ فِیۡہِ تَسۡتَفۡتِیٰنِ (12:41) یہاں ایسا نظر آتا ہے (بڑے حتمی یقین سے جیسے کہا جاتا ہے) کہ یوں سمجھئے کہ یہ گویا فیصلہ ہی یہ ہو جائے گا تمہارے ہاں عدالت سے' اسی عدالت سے فیصلہ ہی سمجھو۔

خواب کی تعبیر ظن کی بنیاد پر ہوتی ہے جب کہ وحی کا ظن سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا

یہاں تک یہ نظر آتا ہے کہ اس حتم و یقین کے ساتھ جو شخص یہ بات کہہ رہا ہے تو یقیناً کوئی ماروائے انسانیت SOURCE ہے وحی ہے یا خدا نے بتایا ہے کہ اس کی بنا پہ یہ چیز کہہ رہے ہیں۔ اب یہی آپ کے ہاں کہا جاتا ہے تفسیریں بھی یہی کی جاتی ہیں۔ افسوس مجھے یہ آتا ہے کہ ایک لفظ آگے نہیں دیکھا جاتا وَ قَالَ لِلَّذِیۡ ظَنَّ اَنَّہٗ نَاجٍ (12:42) اور جس کے متعلق انہیں ظن گمان گذرا تھا کہ وہ نجات پا جائے گا۔ ظن کا لفظ قرآن میں موجود ہے وحی کو تو ظن نہیں کہا جا سکتا۔

ملوکیت کے دور میں وکیلوں کی ضرورت' ایک ضروری امر ہوتا ہے

جس کے متعلق ان کا گمان یہ تھا کہ وہ بری ہو جائے گا' اس سے یہ کہا مِّنۡہُمَا اذۡکُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّکَ (12:42) وہ جو تیرا آقا ہے اگر تو اس کی خدمت گری پہ' ساقی گری کے منصب پہ فائز ہو جائے اور بری ہو جائے تو اس سے یہ ذکر کرنا ان واقعات کا جو میرے ساتھ گذرے ہیں۔ اس تک یہ بات غالباً پہنچی نہیں ہے کہ کس طرح سے ان لوگوں نے ایک بے گناہ کو قید خانے کے اندر بند کر رکھا ہے' اس تک بات پہنچانا۔ عزیزانِ من! اس زمانے میں اور ملوکیت کے دور میں ان تک بات پہنچانا جو تھا ناممکن ہوتا تھا' بات پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ درمیان میں وسیلوں کی ضرورت تھی۔ دربان اور مصاحب اور سردارانِ قوم' ان کے توسط سے کہیں جا کے بات پہنچتی تھی۔ وہی نظام ہے جو ہمارے ہاں اب مقربینِ بارگاہِ الٰہی نے مقرر کر رکھا ہے کہ ان کی وساطت سے اللہ تک بات پہنچتی ہے۔ حضور میرے لئے خدا کے ہاں

درخواست کیجئے۔ وہ خدا جو ہر ایک کی شہ رگ کے قریب تر ہے' جو کہتا ہے میں ہر ایک کی سنتا ہوں۔ لیکن وہ تو تصور ملوکیت کا ہے کہ صاحب! اس عام بادشاہ کے حضور براہِ راست درخواست نہیں پہنچ سکتی' وہ شہنشاہِ اعلیٰ' حاکم الحاکمین' عرشِ معلیٰ کے اوپر فائز اور اس تک یہ بندہ بشر گنہگا کی درخواست براہِ راست پہنچ جائے؟ تو آپ نے دیکھا کہ وہ جو ملوکیت کے تصور ہیں' کہاں کہاں تک ہمارے ہاں محیط ہوئے ہوئے ہیں۔

حضرت یوسفؑ بادشاہ تک اپنی بے گناہی کا پیغام نہ پہنچا سکے اور پھر کئی برس قید رہے

یہ ملوکیت میں یہ بات تھی کہ بات ہی نہیں بادشاہ تک پہنچ سکتی تھی کس کو پکڑا' کس کو قید میں ڈال دیا۔ کون بے گناہ ہے' کون گنہگار ہے۔ ٹھیک ہے۔ کہا کہ اس سے یہ ذکر کرنا۔ ویسے ہی ہوا درمیان کی کڑیاں پھر قرآن نے چھوڑ دیں ضرورت نہیں' دیکھئے کس طرح سے کڑیاں مل جاتی ہیں فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ (12:42) وہ بھول گیا۔ تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ واقعی چھوٹ گیا' بری ہو گیا' اپنے منصب پہ بھی فائز ہو گیا۔ یہ کچھ نہیں درمیان میں قرآن نے کہا اتنی سی بات کہی کہ وہ وہاں وہ بات بھول گیا اور کئی برس تک یوسفؑ قید میں رہا۔ اس کے بعد کئی برسوں کے بعد' یہ واقعہ ہوا۔ وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ (12:43) اس نے اپنے اہلِ دربار سے کہا وہ جوان کے ہاں نو رتن ہوتے تھے' یہ مصاحب ہوتے تھے' ان میں یہ لوگ بھی تھے جو خوابوں کی تعبیریں بتایا کرتے تھے۔ مذہب کی دنیا میں تو ان لوگوں کی بڑی اہمیت ہوتی تھی' فالیں بتانے والے' پیش گوئیاں کرنے والے' خوابوں کی تعبیریں بتانے والے۔ اس نے اپنے اہلِ دربار سے کہا کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے کہ کچھ یا سات۔

محاوراتی زبان کی حقیقت

عزیزانِ من! عربی زبان میں سبع کا لفظ ویسے متعین SEVEN کے لئے بھی آتا ہے' سات کے لئے بھی آجاتا ہے لیکن جس طرح ہمارے ہاں یہ کہتے ہیں کہ میں نے تمہیں بیس دفعہ کہا ہے کہ ایسا نہ کرو تم باز نہیں آتے' ارے ہزار بار تمہیں سمجھایا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتا کہ گن کے میں نے سو دفعہ یا ہزار دفعہ یا سات دفعہ کہا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں نے تمہیں کتنی بار کہا تو جہاں کوئی چیز متعین نہ کرنی ہو تو وہاں یہ الفاظ' ہمارے ہاں دس' سو' ہزار یہ بولتے ہیں عربوں کے ہاں سات' سترہ' ستر' سات سو بولتے ہیں ان معنوں میں۔ اس لئے جہاں یہ ہے سبع سمٰوٰت تو وہاں سات آسمان نہیں ہے اس کے معنی متعدد کرّے ہیں۔ خیر! تو یہاں دونوں میں سے کوئی لے لیجئے۔

خوابوں کی تعبیر کا ذکر نیز فالیں نکالنے والوں کی تکنیک کا ذکر

میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ کچھ دبلی سی گائیں ہیں کچھ موٹی سی گائیں ہیں وہ دبلی سی گائیں موٹی گاؤں کو ہڑپ کر گئیں' نگل گئیں۔ پھر میں نے یہ دیکھا ہے کہ کچھ خوشے سرسبز دانوں والے ہیں اور کچھ خشک خوشے ہیں اناج کے۔ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ (12:43) ان سے کہا کہ تمہیں دعوے بڑے ہیں کہ خوابوں کی تعبیریں بتایا کرتے ہو' بتاؤ اس خواب کی تعبیر کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ صاحب! ہم تو نہیں بتا سکتے ہمارا علم محدود ہے یہ تو نہیں کہتے۔ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ (12:44) کہا کہ یہ خواب ہے! یونہی پریشان خیالی ہے۔ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ (12:44) اس قسم کی پریشاں خیالیوں کی تعبیریں ہم نہیں دیا کرتے۔ ہم تو خوابوں کی تعبیریں بتایا کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ وہ DIPLOMATIC LANGUAGE جسے کہتے ہیں اس میں جواب دیا جاتا ہے۔ یہ جتنے بھی فالیں دینے والے نجومی وغیرہ ہوتے ہیں' آپ دیکھئے گا یہاں وہ جو وہ سڑک کے اوپر بیٹھے ہوتے ہیں' ان کی گفتگو سننے کے قابل ہوتی ہے۔ اس قسم کے منجھے ہوئے وہ ذو معنی الفاظ ہوتے ہیں کہ وہ اس وقت ہر ایک کا اطمینان بھی کر دیتا ہے اور ان الفاظ پہ اگر بعد میں کوئی گرفت کرنا چاہے تو وہ اس میں سے بالکل نکل جاتے ہیں' ایسے ذو معنی الفاظ ہوتے ہیں۔ آج کی سیاست کی دنیا میں اسے DIPLOMATIC LANGUAGE کہتے ہیں اور بڑے فخر سے بیان کی جاتی ہے کہ وہ اس میں بڑا ماہر ہے وقت کے اوپر ایسے الفاظ بول جانے کہ ہر ایک اس وقت مطمئن ہو جائے اور بعد میں گرفت کرنا چاہے تو وہ یوں نکل جائے جیسے زندہ مچھلی ہاتھ میں سے سبک کے نکل جاتی ہے۔

سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والوں کا اپنا حال اور ان کے پاس جانے والوں کی سطح ادراک

یہ جتنی مذہب والی' دنیا والے جو ہوتے ہیں قسمتیں بتانے والے تو وہ ان کے ہاں کے الفاظ اس قسم کے گھڑے ہوئے منجھے ہوئے' پوچھنے والا صاحبِ ضرب و مجنون۔ وہ تو پہلے ہی عقل و حواس کھوتا ہے تو ان کے پاس جاتا ہے ہوش و حواس اور عقل و فکر قائم ہو تو کوئی ان لوگوں کے پاس جائے پوچھنے کے لئے کہ میرا مستقبل کیا ہے؟ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ جو وہاں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پہ 114 HEAT کی ڈگری میں بیٹھا ہوا سارا دن دو دو پیسے مانگ رہا ہے اس سے اپنے مقدر کا حال پوچھا جا رہا ہے۔ تو عقل و فکر کے دئے تو پہلے ہی یہ بجھا دیتے ہیں۔ تو صاحبِ غرض ہوا' یہ ہوا مجنون۔ بات کی ایسے جس سے اطمینان ہو جائے' تسلی ہو گئی۔ عزیزانِ من! راز اتنا ہی ہوتا ہے اور الفاظ وہ ایسے ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہ کہہ دیا کہ صاحب! ٹھیک ہے خوابوں کی باتیں تو ہم بتا سکتے ہیں' یہ تو پریشان خیالیاں ہیں ان کی بات کیا بتائیں۔

حضرت یوسفؑ کے ساتھ بادشاہ کا خواب رابطے کا باعث بن گیا

وَ قَالَ الَّذِیۡ نَجَا مِنۡهُمَا وَ ادَّکَرَ بَعۡدَ اُمَّةٍ(12:45) بادشاہ کا خواب اس کی تعبیر پوچھی گئی' انہیں بات آئی نہیں تو ان کو اپنا خواب یاد آ گیا' تعبیر بتانے والا اور جو کچھ اس نے کہا تھا بَعۡدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُکُمۡ بِتَاۡوِیۡلِهٖ فَاَرۡسِلُوۡنِ (12:45) بادشاہ سے کہا' ان سے کہو میں بتاتا ہوں اس کی تعبیر کیا ہے' مجھے ذرا وہاں بھیج دو۔ دیکھا وہ جو اس کو ضرورت پڑی ہے تو بات یاد آئی۔ اب درمیان کی کڑیاں غائب انتظام ہو گیا یہ وہاں چلے گئے۔ یُوۡسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیۡقُ (12:46) دیکھا قرآن کا انداز! اب جو آیا ہے پتہ ہے کہ بات پہلے یہی ہو گی کہ تمہیں میں نے یہ کہا تھا کہ بادشاہ سے اس واقعہ کا ذکر تو کر دینا' کتنے برس تم نے گذار دئے اتنی سی بات بھی تم سے نہ ہو سکی۔ آتے ہی اسے کہا ہے اے سچائیوں کے مجسمہ یوسفؑ! تیری کیا بات ہے۔ اور صدیق کہا ہے یہاں اسے اس لئے کہ جو بات اس سے کہی تھی کہ تیرے خواب کی تعبیر یہ ہے وہ سچی نکلی ہے۔ اے سچے یوسف! اَفۡتِنَا فِیۡ سَبۡعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاۡکُلُهُنَّ سَبۡعٌ عِجَافٌ وَّ سَبۡعِ سُنۡۢبُلٰتٍ خُضۡرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ لَّعَلِّیۡۤ اَرۡجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ (12:46) کہا کہ یہ خواب ہے سات یا چند دبلی گائیں جو موٹی گائیوں کو کھا گئیں' چند سرسبز و شاداب خوشے' تھوڑے سے خشک خوشے اس کی ذرا تعبیر تو بتا دیجئے تا کہ میں لوگوں کے پاس جاؤں اور ان کو تمہارے متعلق علم ہو جائے کہ کتنی بڑی ایک ہستی وہاں قید خانے کے اندر ہے۔

حضرت یوسفؑ کے نزدیک بادشاہ کے خواب کی تعبیر اور اس کا حل

قرآن کا انداز ہے یوسفؑ نے جتایا تک نہیں کہ تم سے کہا گیا تھا اور تم نے یہ بات نہیں کہی۔ قَالَ تَزۡرَعُوۡنَ سَبۡعَ سِنِیۡنَ دَاَبًا ۚ (12:47) اس سے کہا کہ کرو یہ جا کر کہ سات سال تک خوب ''جنوں کیندے نیں دب کے واہا''۔ فَمَا حَصَدۡتُّمۡ فَذَرُوۡهُ فِیۡ سُنۡۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّا تَاۡکُلُوۡنَ (12:47) یہ بات وحی کی بھی نہیں ہے انسانی علم و حکمت جس سے آدمی غور کرتا ہے' کہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ خوب محنت سے کھیتی کروا تنا زیادہ اگاؤ کہ تمہاری ضروریات سے فاضل ہو' جتنا اس میں سے کھاؤ' باقی جتنے دانے ہیں' ان کو انہی خوشوں کے اندر رہنے دو۔ کیا طریقہ ہے PRESERVATION کا! تحفظ کا! خوشوں کے اندر رہنے دو محفوظ رہے گا۔ فطرت نے تو یہ پیکر اس قسم کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں انسان کو حیرت ہوتی ہے کتنا عجیب پیکر دیا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے اندر رہنے دو' بس اس میں سے تھوڑا سا کھاؤ ضائع مت کرو بچا کے رکھو خوشوں کے اندر۔ ثُمَّ یَاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ سَبۡعٌ شِدَادٌ یَّاۡکُلۡنَ مَا قَدَّمۡتُمۡ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّا تُحۡصِنُوۡنَ (12:48) اس کے بعد خشک سالی آئے گی تو اس میں یہ جو رکھا ہوا ذخیرہ کیا ہوا اناج ہے' یہ کام آئے گا۔ اسے احتیاط سے کھاؤ' سارا ہی نہ کھا جانا اس میں سے بیج کے لئے الگ ضرور رکھ دینا۔ بھوکا بھوک کی شدت میں یہ بھی نہیں سوچتا کہ اس میں سے بیج کے

لئے رکھ لینا چاہئے' برے وقت کے لئے رکھ لینا چاہئے۔ اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے' اللہ مالک ہے۔ یہ نہیں کہا کہ سارا کھا جانا پھر کہیں سے مل جائے گا' بیج کے لئے رکھ لینا' پہلے یہ کچھ کرنا اور خوشوں کے اندر سنبھال کے رکھنا' جب یہ جمع کیا ہوا کھاؤ تو سارا ہی نہ کھا جانا' بیج کے لئے رکھنا۔ اندازہ لگا رہے ہیں کہ کیا نصیحتیں ہو رہی ہیں۔ **ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَ فِیْهِ یَعْصِرُوْنَ** (12:49) اس لئے کہ پھر اس کے بعد بارشیں ہونگی' خشک سالی کے بعد کھیتیاں اگیں گی۔ انگوروں میں خوشے لگیں گے تم پھر ان کے رس نچوڑو گے' خوشحالی کا زمانہ آئے گا۔ اس طرح سے درمیان کا عرصہ جو خشک سالی اور قحط سالی کا ہے اسے اس تدبیر کے مطابق بسر کرنا۔ پھر بیچ میں GAP ۔ اس نے سنا' سیدھا جا کے بات کہی' بادشاہ کے کانوں میں یہ بات پڑی اس نے کہا کہ یہ لوگ جسے پریشاں خیالی قرار دیتے تھے' اس نے تو متعین طور پہ وہ بات بتائی ہے جو سمجھ میں آ گئی۔ عزیزانِ من! نظر آ رہا ہے کہ قرائن بتا رہے تھے اس چیز کے لئے کہ اس قسم کی خشک سالیاں آتی ہیں ان میں کیا کرنا چاہئے۔ یہ تدبیر جو تھی اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ نہایت اچھی تدبیر ہے۔ یہاں سے قرآن بات شروع کرتا ہے **وَ قَالَ الْمَلِکُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ** (12:50) بادشاہ نے کہا اوبلاؤ اس کو جس نے یہ بات بتائی ہے۔ DIRECTLY قرآن ایک لفظ کہتا ہے یعنی درمیان میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں' اوئے! اسے بلاؤ کون ہے یہ شخص۔ **فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ** (12:50) جب اس کے پاس قاصد آیا۔

پیغمبر اور پیغامبر میں فرق

دیکھئے یہ رسول کا لفظ قاصد کے معنوں میں' لغوی معنوں میں بھی قرآن نے اس کو استعمال کیا ہے اور رسول جب اصطلاحی معنوں میں آئے گا تو وہ تو صرف وہ خدا کا رسول ہوگا جو خدا کی وحی کو انسانوں تک پہنچائے' ہوتا وہ بھی پیغامبر اور قاصد ہی ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے یہ قاصد عام انسانوں کا پیغام دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے' وہ قاصد خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ اور اسی لئے ہمارے ہاں یہ احتیاط برتی گئی اور برتنی چاہئے کہ عام قاصد کو پیغامبر لکھتے ہیں اور رسول جو ہے اسے پیغمبر لکھتے ہیں۔ الف بیچ میں نہیں ڈالتے۔ عزیزانِ من! یہاں تو رسول اور عام رسول میں اتنا فرق کیا جاتا ہے کہ تحریر میں بھی ہم لوگ احتیاط رکھتے ہیں اور یہ احتیاط رکھنی چاہئے۔ جب وہ قاصد وہاں آیا اور اس نے آ کے کہا کہ بادشاہ نے کہا کہ لاؤ اس قیدی کو نکال کے۔

حضرت یوسفؑ کا بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے سے پہلے ایک باوقار طریق نشاندہی

عزیزانِ من! مقام وہ آ گیا ہے کہ جہاں بصیرت وجد کرتی ہے' انسان کی روح رقص کرتی ہے کہ مردِ مومن کا کریکٹر کیا ہوتا ہے۔ بے گناہ ہے' یونہی جیل خانے میں ڈالا ہوا ہے' پتہ نہیں کتنے سال گذر گئے ہیں' پہلے کتنے گذرے ہیں جب اس قیدی سے یہ بات کہی تھی

کہ جا کے ذکر کرنا' قرآن کہتا ہے اس کے بعد کتنے سال گذر گئے۔ایک بے گناہ قید خانے کے اندر بیٹھا ہے اس سے آ کے وہ کہتا ہے کہ چلو بادشاہ کو تو تمہاری بات بڑی پسند آئی ہے۔یہ تو تمہیں بہت معظم بنا دے گا' چلو قید خانے سے نکلو۔عزیزانِ من! یہاں کوئی بھی ہوتا ''جوتی وی نہ پوندا'' اور اگر ہم آپ اپنی سطح پہ سوچیں تو اس میں کوئی برائی کی بات نہیں' بے گناہ ہیں یونہی قید خانے کے اندر ڈالے ہوئے ہیں۔عزیزانِ من! توجہ سے سنئے مردِ مومن کے کریکٹر کی بلندی کا مقام آتا ہے۔قاصد سے کہا کہ بادشاہ سے کہو تمہارا شکریہ لیکن میں ترحّمِ خسروانہ کی بنا پر قید سے باہر نہیں آنا چاہتا۔اس سے کہو کہ اس کے مقدمے کی تحقیق ازسرِ نو کرائے اور وہاں اگر میں بے گناہ ثابت ہوں تو پھر مجھے قید خانے سے باہر نکالے' ویسے نہیں قید خانے سے باہر جاؤں گا۔اللہ اکبر اللہ اکبر! اسے کہتے ہیں کریکٹر۔ترحم خسروانہ کی بنا پہ قید سے نہیں باہر آنا' چاہتا ہوں میری بے گناہی عدالت سے ثابت ہو' پھر باہر نکلوں گا۔کیوں عزیزانِ من! مردِ مومن کا مقام دیکھا آپ نے۔اسے کہتے ہیں کہ جاؤ اپنے بادشاہ سے کہہ دو' جاؤ اپنے بادشاہ سے کہہ دو۔فرعون کا حکم آ رہا ہے کہ آؤ وہ کہہ رہے ہیں کہ دوسری وہ معزز بنانا چاہتا ہے۔اس نے کہا کہ جو بات سارے نورتن نہیں بتا سکے' اس شخص نے بتایا ہے۔لاؤ اس کو میں مقرب بناؤں' معزز بناؤں۔بادشاہ کا حکم پھر اس قسم کے اعزاز و اکرام کی دعوت' کہا جاتا ہے کہ نہیں! یوں نہیں باہر آ سکتا اسے کہو کہ اگر مجھے باہر نکالنا ہے ازسرِ نو تفتیش کرائے میرے مقدمے کی اور اس پہ اگر میں بے گناہ ثابت ہوں' تو میں پھر جیل خانے سے باہر آؤں گا۔

ہمارے ہاں کی غلط روایات نے نبی اکرم ﷺ کے بلند مقام کو بھی داغ دار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی

عزیزانِ من! یہ مقام ہے ایک طرف میں نے کہا ہے کہ روح وجد میں آ جاتی ہے اور دوسری طرف جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کے روایت پرستوں نے کیا کیا ہے۔ٹکر مارنے کو جی چاہتا ہے۔آپ کے ہاں بخاری کے اندر یہ حدیث ہے' مجھے معاف رکھئے گا حضور ﷺ کی تکریم اجازت نہیں دیتی لیکن بات کہنی پڑتی ہے۔حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اس آیت پہ پہنچے تو کہا کہ یوسفؑ نے تو یہ کہا' اگر میں یوسفؑ کی جگہ ہوتا تو فوراً وہاں چلا جاتا' اف۔دیکھتے ہیں یہودیوں کی سازشیں کہاں تک گئی ہوئی ہیں۔یوسفؑ کو وہ اپنا پیغمبر سمجھتے ہیں رسول اللہ ﷺ جو ہیں وہ حریف ہے۔یوسفؑ کا مقام قرآن اس کی شہادت دے رہا ہے' یوسفؑ کے مقامِ بلند کے متعلق قرآن شہادت دے رہا ہے۔یعنی اب یہودیوں کو یہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا پیغمبر تم دیکھو کتنا اونچا ہے' تم خود کہتے ہو' اب خود کہتے ہو تو اس کے بعد پھر نبی اکرم ﷺ کے خلاف تو کوئی بات آتی نہیں۔وہ انہوں نے اس کے اندر یہ حدیث داخل کر دی آپ کے ہاں۔اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح ترین کتاب جس کے متعلق آج یہ کہا جاتا ہے اہل حدیث کی طرف سے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث سے انکار کفر ہے۔اس میں انہوں نے یہ رکھ دیا کہ ہمارے رسول نے تو بقول تمہارے یہ کہا تمہارے خدا کی شہادت کی بنا پہ یہ کہا کہ میں نہیں آنا

چاہتا تمہارے رسول ﷺ نے (معاذ اللہ) کہا کہ میں اگر یوسفؑ کی جگہ ہوتا تو جب یہ بات ہوئی تھی تو فوراً وہاں چلا جاتا۔

غلط اور وضعی روایات کے انکار کرنے پر علامہ پرویزؒ اور مولانا اسلم جیراجپوریؒ کا باآواز بلند اعلانِ عام

عزیزانِ من! کلیجہ پھٹ جاتا ہے' کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہیں وہ حدیثیں اور روایتیں جن کے انکار کے اوپر مجھ پہ کفر کے فتوے لگتے ہیں۔ عزیزانِ من! اگر یہ کفر ہے تو شانِ رسالت مآب ﷺ کے تحفظ کے صدقے میں میں ہزار مرتبہ کافر بننے کے لئے تیار ہوں۔ میں اس کفر کے صدقے میں حضور رسالت مآب ﷺ کی بارگاہ میں سرخرو جاؤنگا۔ عزیزانِ من! سن رکھئے زندگی کا اعتبار نہیں ہے میں کسی ایسی حدیث کو جو قرآن کے خلاف ہو یا جس سے حضورِ رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ اقدس پہ کسی قسم کا طعن پڑتا ہو' میں اس کو جعلی' وضعی' کذب' افترا مانتا ہوں' انکار کرتا ہوں' سو دفعہ انکار کرتا ہوں۔ اور میرے استاد مولانا اسلم جیراجپوریؒ نے آگے لفظ کہا تھا وہ بہت بلند مقام پہ ہے' کہتے ہیں تم کہتے ہو کہ اس حدیث کے راوی بڑے ثقہ ہیں' وہ کہتے تھے اگر یہ حدیث ہے یہ جو رسول اللہ ﷺ کی ذات کے اوپر طعن پڑتا ہے' قرآن کے خلاف ہے' تم اگر کہو کہ اس کے راویوں میں جبریل بھی شامل ہے' میں پھر بھی انکار کرتا ہوں۔ عزیزانِ من! ناموسِ رسالت مآب ﷺ۔ کیا کیا بتاؤں کہ کیا کیا سازشیں آپ کے ہوئی ہوئی ہیں' دیکھ رہے ہیں۔ کہا جاؤ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ (12:50) جاؤ اپنے آقا کی طرف فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ط (12:50) اور جا کے اس سے پوچھو کہ وہ جنہوں نے' ان عورتوں نے' اپنے ہاتھ زخمی کئے تھے' ان کی کیا سازش تھی۔ اس مقدمے کی تحقیق کراؤ۔ اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ (12:50) اس میں شبہ نہیں کہ میرا رب تو ان کی سازش سے واقف ہے' تمہارا معاشرہ تو اس سے واقف نہیں ہے یعنی میں اپنے خدا کے حضور تو بے گناہ اور معصوم چلا آ رہا ہوں آج بھی ہوں مجھے وہاں' اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اپنی سچائی کو معاشرے کی حد تک واضح کرنا نہایت ضروری ہے

انسانوں کے معاشرے کو تو اس کا علم نہیں ہے۔ اس کے لئے چاہتا ہوں کہ وہاں تحقیق کراؤ۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہا وہ تو جانتا ہے۔ تو اب عزیزانِ من! یہاں سے یہ بھی بات ثابت ہوئی کہ صرف اتنی سی بات اپنے دل میں یہ سمجھ لینا کہ صاحب! میرا اللہ تو جانتا ہے میں سچا ہوں ''دنیا جو کچھ کہندی اے کہن دیو جی'' بالکل غلط ہے یہ بات' سچے کو اس معاشرے میں اپنی سچائی کو ثابت کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ سچائی اور جھوٹ کا تعلق انسان کی ذات تک محدود نہیں رہتا' معاشرے میں یہ انفیکشن کی چیز ہوتی ہے' متعدی مرض کی طرح یہ چیز پھیلتی ہے۔ کیوں یہ عام ہوگئی آپ کے ہاں کی یہ جھوٹ اور بدمعاملگی اور کرپشن؟ جس سے کہو وہ کہتا ہے جی! سارے کرتے ہیں۔ یہ چیز ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی پاک دامنی اور حقانیت کو سامنے لانے کے سلسلہ میں ایک حدیث کا ذکر

سچے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی سچائی کو لوگوں کے اندر بھی ثابت کرے۔ اور میں مانتا ہوں کہ وہ حدیث یقیناً صحیح ہوگی جس میں یہ ہے کہ شام کے جھٹپٹے میں حضور ﷺ باہر تشریف لے جا رہے تھے۔ ساتھ ایک عورت تھی اِدھر سے کوئی آدمی گذر رہے تھے آپ نے وہاں سے آواز دی کہ بھئی! دیکھنا یہ میرے ساتھ میری بیوی صفیہؓ ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ کہیں ضرورت تھی اس وقت یہ کہنے کی حضور ﷺ کے متعلق، وہ تو امہات المؤمنین تھیں یہ حضور ﷺ کے متعلق ہے لیکن حضور ﷺ نے یہ ایک اسوہ نمونہ ہمارے لئے قائم کیا کہ معاشرے کے اندر ایسا رہنا بڑا ضروری ہے کہ اپنی صداقت کو، اپنی پاکبازی کے متعلق کسی قسم کا کوئی شبہ تک نہیں آنے دینا، ایسے حالات نہ پیدا ہونے دینا کہ جی! کوئی پرواہ نہیں ہے جو کچھ کہتا ہے کہنے دو، بالکل نہیں! صداقت کو ثابت کرو۔ یہ حضرتِ یوسفؑ نے کہا میں کہتا ہوں کہ یہ حضور ﷺ کا جو یہ فرمان تھا کہ بھئی! میرے ساتھ میری بیوی ہے یہ ہے وہ چیز، یہ ہے سچی حدیث۔

بادشاہ کی طرف سے حضرت یوسفؑ کے مقدمے کی ازسرِنو سماعت کرنے کا حکم

بادشاہ نے پھر وہ نئے سرے سے مقدمے کی سماعت کرائی۔ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ (12:51) بادشاہ نے خود اس کی سماعت کی۔ نظر آیا کہ بہت بلند شخص ہے، علم اور رشد کی کیفیت تو یہ کہ وہ اس قسم کی تعبیر بتائی ہے کہ جس سے کہ میرے ہاں کے نورتن عاجز آ گئے، کریکٹر اور کردار کی یہ کیفیت ہے کہ میں بلا رہا ہوں اور اعزاز و اکرام دینے کے لئے بلا رہا ہوں اور وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! جب تک میری بے گناہی عدالت سے ثابت نہیں ہوگی، باہر نہیں آؤں گا، کتنا بڑا اثر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس مقدمے کی سماعت ہم خود کریں گے۔ یہ ہوتا ہے کریکٹر کا اثر، ہم خود اس مقدمے کی سماعت کریں گے اور سماعت اس نے بلا لیا ان کو۔ ان سے کہا کہ ہاں ذرا بتاؤ کیا بات تھی۔ اب دیکھئے صاحب! اس مقام پہ کہا قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ط (12:51) انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم نے کوئی برائی اس کے اندر نہیں دیکھی۔ یہ تو ان عورتوں کی بات ہوگئی اور یہ ان سب سے بڑی الزام لگانے والی تھی۔ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ (12:51) آہاہا! کیا لفظ قرآن نے کہا ہے حَصْحَصَ : آپ اندر بیٹھے ہوئے ہوں، پرندہ اس طرح سے اترے کہ اس کے پروں کے پھڑ پھڑاہٹ کی آواز آئے، تو وہ اس کا آنا ایسا نمایاں ہو جاتا ہے کہ چھپ نہیں سکتا، پرندہ اگر پر سمیٹ کے آتا ہے تو پتہ ہی نہیں چلتا اور اگر اس کے پروں کی آواز جو ہے، وہ اس طرح سے سرسراہٹ کے ساتھ فضا میں گونجتی ہے پرندہ نہ بھی نظر آئے تو معلوم ہوتا ہے کہ پرندہ کہیں ہے۔ یہ لفظ یہاں استعمال کیا ہے قرآن نے۔ اس نے کہا کہ اب جو صداقت اس طرح سے سرسراہٹ کے ساتھ، پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ آسمان سے نیچے اتر آئی ہے تو میں بھی کس طرح سے انکار

کرسکتی ہوں۔ حَصۡحَصَ الۡحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدۡتُّهٗ عَنۡ نَّفۡسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيۡنَ (12:51) ہم نے اس کو پھسلانا چاہا اس کے ارادے سے' یہ تو بڑا ہی نیک بخت انسان ہے۔ یوسفؑ بھی کھڑے ہو گئے۔

حضرت یوسفؑ کی جانب سے نبوت کی بلند ظرفی کی ایک لاجواب مثال

سنئے کہ یہ حضرت یوسفؑ وہاں کیسے گئے ہیں۔ کہا کہ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں انہیں ذلیل کرنا چاہتا تھا کہ آ کے اس کا اعتراف کریں کہ میں بے گناہ تھا اور انہی کی وہ سازش تھی' میرا مقصد یہ نہیں تھا۔ ذٰلِکَ لِيَعۡلَمَ اَنِّىۡ لَمۡ اَخُنۡهُ بِالۡغَيۡبِ (12:52) صرف یہ بتانا تھا کہ وہ جس نے مجھ پہ احسان کیا تھا' میں نے اس کے خلاف خیانت نہیں کی ہے' آ ہاہاہا۔ عزیزانِ من! یہ ہے سورۃ یوسف۔ اس قسم کے سخت دشمن آپ کے سامنے ہو' جس نے ایسا الزام لگایا' کتنے سال قید خانے میں ڈال دیا' باہر آئے ہیں تو انہوں نے اعتراف کیا ہے کوئی اور اس مقام پہ کھڑا ہوتا' عدالت کے اندر بادشاہ کے سامنے' خود بادشاہ نے دیکھ لیا کہ یہ کچھ اس نے سب کچھ اس طرح سے کیا ہے' یہ پوچھو نہیں کس طرح چلا اٹھتا ''تہاڈی ایسی دی تیسی'' اور حق بجانب تھا جو سینے سے یہ انتقام کے جذبے بھڑ کتے' یہاں تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہاں ان سے کہا گیا ہے کہ میں نے یہ اس لئے نہیں کیا کہ تمہیں ذلیل کیا جائے' مقصد صرف اتنا تھا وہ کہ جس نے مجھ پہ احسان کیا تھا اس پر اس طرح ثابت کر دیا جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس سے خیانت نہیں کی۔ کیوں خیانت نہیں کی تھی؟

لفظ 'خیانت' کا لغوی اور قرآنی مفہوم

پھر لفظ سنئے' ٹھیک ہے ہم تو یہی کہیں گے کہ خیانت کرنا بری بات ہے' میں اس بحث کی بات نہیں کرتا جس کو بری اور اچھی کہتے ہیں آپ کو معلوم نہیں ہے کہ فلسفے اور ETHICS کی دنیا کے اندر کتنا اہم سوال ہے یہ GOOD & EVIL کا کہ یہ اچھی بات ہے یہ بری بات ہے' یہ کسے کہتے ہیں اچھی بات' کسے کہتے ہیں بری بات؟ آپ کے ہاں کسی کو دھوکہ دینا' مار دینا انتہائی درجے کا ظلمِ عظیم ہے' ٹھگوں کے ہاں ان کا مذہب یہ تھا صبح نکلتے تھے تو دیوی کے ہاں یہ منت مان کے جاتے تھے کہ آج ہم جس کو گلا گھونٹ کے لائیں گے پانچواں حصہ تیرے حضور آ کے چڑھائیں گے' یہ کامیاب ہوتا تھا تو انتہائی نیکی کا کام اسے شمار کرتا تھا' لڑکے کی شادی نہیں ہوتی تھی جب یہ نہ کر لے' اتنا اچھا سمجھا جاتا تھا۔ تو یہ جو فلسفے میں یا وہ ETHICS جسے کہتے ہیں اس میں یہ سوال جو ہے' ہزار سال سے چلا آ رہا ہے کہ اچھا کس کو کہتے ہیں اور برا کس کو کہتے ہیں اور ان کے ہاں یہ چیز ہے کہ اچھائی اور برائی RELATIVE TERMS ہیں' اضافی چیزیں ہیں۔ ایک حالت کے اندر ایک ہی چیز اچھی ہو جاتی ہے' دوسرے وقت میں وہی چیز برائی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے آ کے کہا

کہ اچھے اور برے کا GOOD & EVEIL کا فیصلہ تمہارا ذہن نہیں کرسکتا' خدا کا میزان اسے بتائے گا جسے وہ GOOD کہے۔ جسے اس نے EVIL قرار دیا' وہ EVIL اور ہمیشہ کے لئے ہر حالت میں ہر زمانے میں غیر متبدل طور پر اچھے اور برے کی تمیز دیدی قرآن نے۔ یہ بات جو کہی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے محسن سے خیانت کروں تو اس لئے کہ وَ اَنَّ اللّٰہَ لَا یَھۡدِیۡ کَیۡدَ الۡخَآئِنِیۡنَ (12:52) اس لئے کہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں کو خدا کبھی کشادگی کی راہ نہیں دکھاتا' اس لئے میں نے یہ کیا۔ مقصد بھی یہ بتادیا کہ کیوں یہ کیا گیا۔ اب پھر وہ عزیز کی بیوی نے کہا وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ (12:53) یہاں پھر ہمارے ہاں کے مفسرین کہتے ہیں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں اپنی ذات کو معصوم نہیں ٹھہراتا' بری الذمہ نہیں ٹھہراتا' نفسِ امارہ تو آدمی کو برائی کی طرف مائل کرتا ہی رہتا ہے بس جس پہ خدا رحم کرے۔ یعنی یہ کہتے ہیں کہ وہ حضرتِ یوسفؑ نے یہ بات کہی تھی کہ میں اپنے آپ کو بے گناہ نہیں ٹھہراتا۔ ارے! تو یہ سارا کچھ جو کچھ یہ کرایا گیا' یہ سارا یہ کاہے کے لئے کرایا گیا' وہ تو اس لئے انہوںؑ نے کہا تھا کہ وہاں مقدمہ دوبارہ اس کی تفتیش ہوتا کہ میری صداقت عدالت میں ثابت ہوجائے کہ میں بے گناہ ہوں۔ اب یہاں یہ چیز کہی کہ نہیں صاحب! کہتے ہیں جی! ازراہِ انکسار فرمایا تھا آپؑ نے۔ یہ اسی عزیزِ مصر کی بیوی کا قول چلا آرہا ہے جس نے کہا کہ ہاں! یہ ٹھیک بات ہے کہ اس میں کوئی برائی نہیں تھی ہم نے ہی کیا تھا اور کہا کہ بات یہ ہے کہ اس وقت تو میں یہ کہتی تھی' پہلا جب مقدمہ ہوا ہے کہ میں بالکل مظلوم ہوں' میں اب اقرار کرتی ہوں کہ میں بری الذمہ نہیں تھی۔ میں نے یہ جرم کیا ہے اور اس کے بعد یہ کہ یہ انسان کے اندر ایک نفسِ امارہ ایسا کرتا ہی رہتا ہے۔ بات لمبی ہوجائے گی۔ قرآن نے بھی یہاں نفسِ امارہ کہا ہے ایک جگہ نفسِ لوامہ کہا ہے اور آخر میں اہلِ جنت کے لئے نفسِ مطمئنہ کہا ہے۔ تو ہمارے ہاں بھی نفس کی یہ تین تفصیلیں کی جاتی ہیں تین CATEGORIES بیان کی جاتی ہیں ہمارے ہاں بھی یہ ایک مسئلہ اہم سا ہوگیا ہے کہ وہ نفسِ امارہ تو ہر انسان کے ساتھ لگا ہی ہوا ہے اور اس کے بعد جیسے یہ ہے کہ ہر برائی کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ صاحب! شیطان نے یہ کچھ کرایا یعنی یہ بری الذمہ ہے۔ اس نے کرایا ہے لے جاؤ جہنم میں اس کو' شیطان نہیں کہا جاتا تو نفسِ امارہ کہا جاتا ہے کہ جی! وہ تو دیکھئے نفسِ امارہ ساتھ لگا ہوا اس کی وجہ سے یہ ہوا یعنی میری وجہ سے یہ نہیں ہوا یعنی نفسِ امّارہ جیسے کہیں باہر کھڑا ہوتا ہے۔ تو یہ بات جو ہے اس کی تشریح پھر ذرا اور لمبی ہے' اخلاقیات کی دنیا میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے اس کے اوپر بڑی ڈسکشن ہے اور چونکہ قرآن نے بھی یہ تین اصطلاحیں استعمال کی ہیں اس کی وضاحت ہوجائے اور اس کی وضاحت جو ہے پھر اگلے درس پہ ہم اٹھا رکھتے ہیں کیونکہ ساڑھے نو بج گئے۔ ہم آج سورۂ یوسف کی آیت یوں کہئے کہ 52 تک پہنچے یہ 53 ویں آیت ہے جسے آئندہ ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

پانچواں باب: **سورۃ یوسف** (آیت 53)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1974ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یوسف کی آیت 54 سے ہوگا۔

حضرت یوسفؑ کے خلاف استغاثہ دائر کرنے والوں کی طرف سے اپنی الزام تراشی، غلطی تسلیم کر لی گئی

آپ کو یاد ہوگا کہ یہ سورۃ یوسف میں داستانِ حضرتِ یوسفؑ مسلسل چلی آ رہی ہے۔ پچھلے درس میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ فرعون نے، بادشاہِ مصر نے حضرتِ یوسفؑ کے متعلق جب سنا تو اپنا قاصد بھیجا اور کہا کہ میں انہیں باعزت مقام دینا چاہتا ہوں۔ جیل خانے سے انہیں نکال لائیے۔ اس پیغام ملنے پہ انہوںؑ نے یہ کہا تھا کہ میں اس طرح سے ترحّم خسروانہ کی بنا پر MERCY کی بنا پر جیل خانے سے باہر نہیں آنا چاہتا۔ بادشاہ سے کہو کہ میرے مقدمے کی ازسرِ نو تفتیش کرائے اور اگر میں اس میں بے گناہ ثابت ہوں تو پھر میں جیل خانے سے باہر آؤں گا۔ اس سلسلے میں پھر بادشاہ نے نئے سرے سے تحقیق کرائی اور اس میں جو وہ عورتوں کی محفل تھی انہوں نے بھی آ کے اسے تسلیم کیا کہ ہماری وہ سازش تھی، اس شخص میں تو ہم نے کوئی برائی نہیں دیکھی تھی۔ اور پھر خود عزیزِ مصر کی بیوی نے کہ جو اس میں استغاثہ کرنے والوں میں اول نمبر پہ تھی اس نے پھر یہ اعتراف کیا کہ ہاں! واقعی یہی تھا ہم نے ہی مل کے اس کے خلاف سازش کی تھی، میں نے اس کے خلاف الزام لگایا تھا اس میں تو کوئی بھی برائی کی بات میں نے نہیں دیکھی۔

ہمارے ہاں نفسِ انسانی کے متعلق پایا جانے والا تصور اور اس کی حقیقت

اس میں ایک بات آئی تھی کہ اس نے یہ کہا وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (12:53) اس نے کہا کہ میں اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دیتی اصل میں یہ ہے کہ کچھ انسانی نفس ہے ہی ایسا کہ وہ اسے برائی پر اکساتا رہتا ہے حکم دیتا رہتا ہے برائی کا۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو یہاں آیا ہے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ

(12:53) ہمارے ہاں اس کے متعلق کچھ ایک عام غلط فہمی پائی جاتی ہے اس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نفس عطا کیا ہے اس کی تین قسمیں ہیں یا تین قسم کے نفس انسان کو دئے ہیں انسان کی ذات میں یہ چیزیں ہیں: نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ، نفسِ مطمئنہ۔ یہ ہر جگہ عام طور پہ کہا جاتا ہے ایک مسلمہ کی حیثیت سے بیان کر دیا جاتا ہے اور اس کی یہ نفسِ امارہ جو ہے اس کی سند یہاں سے، اس آیت سے لائی جاتی ہے۔ حالانکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قول ہی عزیز مصر کی بیوی کا ہے، خدا کا ارشاد نہیں، خدا کے کسی نبی کا قول نہیں، یہ اس عورت کا یہ بیان تھا۔ اور پھر ہمارے ہاں یہ دیکھئے اصطلاح کیسے ہوتی ہے نفسِ امارہ یعنی اس نے کہا کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (12:53) نفس جو ہے انسان کا یہ برائی کا حکم دیتا رہتا ہے، امارۃ حکم دینے والا۔ تو نفسِ امارہ کے لفظی معنی اگر لئے جائیں کہ وہ نفس (نفس تو میں نے کہا ہے کہ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ کیا چیز ہے) جو برائی کا حکم دیتا ہے، اگر بالسوء بھی اس کے ساتھ آئے تو وہ پھر تو وہ امارہ کے معنی ہوں گے **امارۃ بالسوء** برائی کا حکم دینے والا لیکن یہ نرا لفظِ امارہ اگر ہم کہیں گے تو اس کے تو معنی ہونگے انسانی نفس جو حکم دیتا ہے، وہ بھلائی کا حکم دیتا ہے یا برائی کا حکم دیتا ہے، خیر کا حکم دیتا ہے یا شر کا حکم دیتا ہے، نرا لفظِ امارہ جو ہے اس کے تو معنی ہی ہیں۔ لیکن نفسِ امارہ کے معنی ہمارے ہاں یہ سمجھے جاتے ہیں کہ وہ جو انسان کو برائی پر اکساتا رہتا ہے یہی ایک نفسِ امارہ ہوتا ہے اور پھر آگے لوامہ اور پھر نفسِ مطمئنہ۔ لوامہ اور مطمئنہ نفس جو قرآن کی آیتوں میں ہے وہ میں آگے چل کے عرض کروں گا۔

ہمارے ہاں کی تفاسیر پر اسرائیلیات اور عیسائیت کی گہری چھاپ کے اثرات کی نوعیت

پہلی چیز یہی ہے کہ نفسِ امارہ جو ہمارے ہاں ذہن میں رکھا جاتا ہے وہ کہ انسان کے اندر یہ چیز ہے کہ وہ ہمیشہ اسے برائی کی طرف اکساتا رہتا ہے۔ گویا ایک چیز یہ سمجھنے کی ہوگئی کہ خود خدا نے انسان کے اندر ایک اس قسم کی ذات، نفس، کوئی چیز ایسی رکھی ہے وہ ہمیشہ اسے برائی کی طرف لے جاتی ہے، یہ تو بڑا غلط تصور ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی تفاسیر پر یا یہ جو اس قسم کے تصورات قائم ہوئے ہیں اس پر اسرائیلیات کا، عیسائیت کا بڑا گہرا اثر ہے اور ان معاملات میں تو عیسائیت کا بڑا گہرا اثر ہے۔ عیسائیت کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ، آدم اور حوا کی معصیت یا گناہ کا بوجھ لئے ہوئے پیدا ہوتا ہے اسے ORIGINAL SIN کہا جاتا ہے اور یہ ہر انسان کے اندر ہے۔ ہر انسان پیدائشی گناہگار ہوتا ہے، یہ عیسائیت کا تصور ہے اور اس تصور کو پیدا انہوں نے کیا ہے اگلی بات کے لئے، پہلی چیز یہ کہ ہر انسان یا انسانی بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے، دوسری چیز یہ کہ یہ اس کے بس میں ہی نہیں ہے کہ اپنے اس پیدائشی گناہ کے دھبے کو دھو سکے، یہ کسی صورت میں ممکن ہی نہیں ہے، یہ ہزار اچھے کام کرے وہ اس دھبے کو نہیں دھو سکتا۔ اب اگلی چیز پھر یہ ہوگئی کہ یہ دھو ہی نہیں سکتا کہ یہ کیا کیا اللہ تعالیٰ نے! انسان کو پیدائشی گناہ گار پیدا کیا جو اس کے اختیار کی بات نہیں، اختیار میں اس کے یہ تھا

کہ یہاں اچھے کام کرے تا کہ یہ دھبہ دھل سکے' دھبہ یہ ایسی وہ ان مٹ سیاہی سے لگا ہوا ہے کہ یہ کسی طرح سے دھل ہی نہیں سکتا۔ان کا عقیدہ ہے(سینٹ پال کے الفاظ میں) کہ یاد رکھئے نجات اعمال کے ذریعے سے ممکن ہی نہیں ہے۔تو اب یہ دھبہ لگا بغیر اس کے اختیار و ارادے کے پیچھے سے ہی' اس کے اختیار میں تھا کہ اچھے اعمال سے ان کو دھوڈالتا وہ ممکن نہیں تو پھر کیا کیا جائے؟ کہا کہ جب یہ چیز (ان کے الفاظ میں) اللہ تعالیٰ کو اس کا احساس ہوا کہ یہ ہو کیا گیا اور احساس ہوا ابتدائے آفرینش سے یا جب سے نوعِ انسانی کی تخلیق ہوئی اس وقت سے یہ ہوتا چلا آیا تو حضرتِ عیسیٰؑ کے زمانے میں آ کے' یہ احساس ہوا کہ یہ تو بڑی زیادتی ہوئی یہ تو سارے انسان جہنم میں چلے جائیں گے۔تو اس کے لئے پھر یعنی یہ کچھ ایسے ہے جیسا کہ اوپر مشورہ ہوتا ہو۔وہ تو حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔تو جیسے وہاں مشورہ ہوا ہو کہ اس پریشانی کا پھر علاج کیا ہے۔تو بہر حال علاج یہ سوچا گیا یا SUGGEST کیا گیا حضرتِ عیسیٰؑ کی طرف سے (یہ ان کے عقائد میں بیان کر رہا ہوں) کہ اس کا طریقہ پھر یہ ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیج دیا کہ اسے صلیب دیا جائے اور اس کا خون کفارہ بن جائے انسانوں کے اس گناہ کا اس طرح سے یہ گناہ مٹیں اور لوگ جنت میں جا سکیں ورنہ جنت تو بالکل خالی رہ جاتی ہے۔ ہر انسان پیدائشی گناہگار' اپنے عمل سے اس دھبے کو دھو نہیں سکتا تو جنت میں جانے کا تو مستحق ہو ہی نہیں سکتا تھا تو حضرتِ مسیحؑ کی صلیب اور اس کفارے پر جو ایمان ہے' اس سے یہ گناہ دھل سکتا ہے۔تو گویا یہ ایمان اتنا بنیادی اور انہوں نے اس قدر اہم قرار دیدیا کہ اس کے بغیر کسی صورت میں انسان کتنے ہی اچھے اعمال اس کے کیوں نہ ہوں' کوئی جا ہی نہیں سکتا جنت میں۔ یہودیوں نے تو یہ کہا کہ جو بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا نہیں ہوتا وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔عیسائیت نے کہا جو حضرتِ مسیحؑ کے صلیب اور کفارے پر ایمان نہیں رکھتا' وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔ یہ تھا وہ بنیادی عقیدہ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پہ ایمان لانے کے لئے عیسائیت کا کہ ORIGINAL SIN کا انہوں نے عقیدہ وضع کیا اور یہ ORIGINAL SIN جو ہے کہ خدا کی طرف سے ہر بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے یہ ہوا وہ نفسِ امارہ۔

ہمارے ہاں نفسِ امارہ کے مروجہ تصور کی نوعیت اور پھر ابلیس اور شیطان کے عقیدہ کے علاوہ زندگی کے ارتقا کی کہانی

ہمارے ہاں کے عام مروجہ تصور کے مطابق کہ انسان کے اندر خدا نے ایک نفس ایسا رکھا ہے وہ اسے حکم ہی برائی کا دیتا ہے لے جاتا ہی برائی کی طرف ہے۔تو گویا یہ تصور بنیادی طور پر وہاں سے آیا یا وہ لوگ جو ہیں وہ یہ تصور لے کے آئے انہوں نے اسلام میں اس تصور کو داخل کیا۔ یہ ہے وہ بنیاد جو نفسِ امارہ کی اصطلاح ہم روزیوں دیتے ہیں کہ جیسے انسان کے اندر ایک ایسی چیز رکھ دی گئی اس نے تو لے جانا ہی اس کو برائی کی طرف ہے۔ یہ برائی کی طرف لے جانے والا INDUCE کرنے والا' اس کی ترغیب دینے والا۔ایک تصور ہمارے

ہاں بھی ہے جسے قرآن نے شیطان یا ابلیس کہہ کر پکارا ہے' یہ ہے کیا؟ یہ تو ابلیس کی بحث میں میں نے پہلے بھی کئی دفعہ بتایا۔ آگے بات آئے گی بتاؤں گا۔ دو لفظوں میں دہرا دوں کہ یہ زندگی جس طرح سے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی چلی آ رہی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ جس منزل میں بھی یہ آتی ہے اس سے پہلی منزل کی بہت سی چیزیں اپنے ساتھ لاتی ہے' البتہ اگلی منزل' پچھلی منزل سے اونچی ہوتی ہے۔ انسانیت کے پیکر میں جب یہ زندگی پہنچی تو یہاں بھی یہ پچھلی جو حیوانیت کے تقاضے تھے' ان میں سے بیشتر کو اپنے ساتھ لائی ہے لیکن اس سے یہ اونچی واقع ہوئی ہے۔ اب یہ کیا ہے' وہ تقاضے کیا ہیں' یہ اونچی واقع ہوئی ہے' اس کے معنی کیا ہیں؟ تقاضے تو وہی ہیں جو حیوانی زندگی کے تقاضے ہیں کھانے پینے سے یہ زندہ رہتا ہے' کھانا' پینا' سونا' تحفظِ نفس' اپنی حفاظت کرنا' دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرنا اور اس کے ساتھ افزائشِ نسل۔ یہ چیزیں تمام حیوانات میں مشترک ہیں یہ چیزیں انسان کے اندر بھی مشترک ہیں۔ یہ زندگی کے حیوانی تقاضے ہیں اس کی طبعی زندگی یا PHYSICAL LIFE ان تقاضوں کے اوپر جیتی ہے۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے سے یہ زندہ رہتا ہے لیکن یہ زندہ رہتا ہے جو حیوان' انسان ہے۔ وہ تو میں نے کہا ہے کہ اگلی منزل میں جب زندگی آئی پیکرِ انسانیت میں تو یہاں یہ (ارتقا کے معنی ہی ہیں' اونچا ہو جانا) اس کا اونچا ہو جانا یہ ہے کہ یہ قوتِ اختیار و ارادہ اس کو دے دی گئی اور اس کا اختیار دیا گیا کہ یہ جی چاہے تو ان برائیوں کی طرف جائے اور جی چاہے تو ان سے مجتنب رہے۔ اب برائی کیا ہوئی؟

انسان کے لیے ارتقائی منزل کے تقاضوں کی اہمیت حلال و حرام سے متعلق ہے

یہ جتنی چیزیں پہلے گنائی گئی ہیں ان کے سہارے تو زندگی جیتی اور آگے چلتی ہے تو ان تقاضوں کا پورا کرنا یہ برائی ہوئی؟ اگر یہ برائی ہو تو وہ تو پہلے دن انسان مر جائے' ان کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔ تو برائی کیا ہوئی' بھلائی کیا ہوئی؟ یہ ہے سارا پوائنٹ جہاں آ کے اسلام ان پہلے ادیان یا مذاہب سے مختلف ہو جاتا ہے' قرآن کی تعلیم ان سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ ان تقاضوں کا پورا کرنا ضروری ہے لیکن یہاں پہنچ کے کچھ شرائط اور کچھ حدود ہیں' ان کے ساتھ ان کا پورا کرنا ضروری ہے۔ کھانے سے انسان زندہ رہتا ہے کھانے سے حیوان بھی زندہ رہتا ہے۔ حیوان کے لئے حلال اور حرام کھانے کی تمیز نہیں ہے اس کے لئے ہر چارہ حلال ہے خواہ وہ اپنے مالک کا ہو یا دوسرے کے کھیت سے وہ کھائے لیکن انسان کی سطح پہ کھانا تو نہایت ضروری ہے اس کے لئے تمیز دے دی گئی ہے' رزقِ حلال میں اور رزقِ حرام میں' یہ جو تمیز ہے یہ انسانیت کی زندگی کا خاصا ہے زندگی حیوانیت سے اونچی چلی گئی۔ وہاں یہ نہ اختیار و ارادہ تھا نہ اس کے اندر کوئی تمیز تھی۔ نہ کوئی اس قسم کی حدود تھیں۔ طبعی حدود تو وہاں تھیں جیسا میں کئی دفعہ کہا کرتا ہوں کہ بکری بھوکے مر جائے' گوشت نہیں کھائے گی' شیر پورے جنگل کا بادشاہ بھوکا مر جائے' یہ خواہ انگور کے خوشے کیوں نہ لٹک رہے ہوں وہ ان سے اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا' نہیں

بھرے گا گوشت ہی چاہئے یہ طبعی پابندیاں تو وہاں لگی ہوئی ہیں ان کو توڑنے کا انہیں اختیار بھی نہیں ہے۔

انسانیت کی خاطر حدود کے تعین کا اختیار صرف خالقِ کائنات کو ہی ہے

یہ جنہیں اخلاقی پابندیاں عام طور پہ کہتے ہیں' یہ جو حدود ہیں انسانیت کی زندگی میں آئی ہوئیں حرام اور حلال' کھانا اس کے لئے بھی ضروری ہے لیکن اس کو کہا گیا کہ رزقِ حلال تیرے لئے جائز ہے۔ رزقِ حرام تمہارے لئے حرام ہے۔ یہ ہے اگر انسان اپنے اختیار و ارادے سے رزقِ حرام کی طرف جائے گا تو یہ ہے وہ چیز کہ جسے کہا جائے گا کہ اس نے برائی کی ہے۔ برائی یہ ہے ان حدود کو توڑ کے ان تقاضوں کا پورا کرنا جو اس کے اوپر عائد کی گئی ہیں۔ یہ حدود جو ہیں وہ وحی نے عائد کی ہیں' انسان نے خود نہیں ان کو تراشا۔ اس کی عائد کردہ حدود تو آج کچھ قانون بنائے گا' کل اس قانون کو خود بدل دے گا۔ ان کے ہاں کی حدود روز بدلتی رہتی ہیں۔ آج ایک چیز قانوناً جائز ہوتی ہے' کل ناجائز ہوتی ہے۔ آج ناجائز ہوتی ہے' کل اس کو اکیاون ووٹس دینے والے جائز قرار دے دیتے ہیں۔ تو یہ حدود جو ہیں غیر متبدل نہیں ہیں' جو انسان وضع کرتے ہیں۔ وحی نے ان حدود کو وضع کر دیا اور یہ حدود غیر متبدل قرار پا گئیں کہ کوئی ان کو توڑ نہیں سکتا لَامُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ(6:34)۔ تو غیر متبدل حدود جو ہیں یہ ہے اصل شے جو انسانی زندگی کے اندر جس کا اضافہ ہوا' یہ حیوانی زندگی تک بات نہیں تھی۔

انسانیت کی غیر متبدل حدود کو توڑنے کا نام سرکشی ہے

اس چیز کو یاد رکھئے! جب انسان اپنے اختیار و ارادے سے ان حدود کو توڑتا ہے' اصطلاح میں اس کا نام شیطانی عمل رکھا گیا ہے۔ شیطان کہتے ہی سرکش کو ہیں۔ سرکشی برتتا ہے ان حدود کو توڑنے میں' توڑتا ہے اپنے اختیار و ارادے سے۔ تو بات یوں ہوئی کہ انسان جب اپنے اختیار و ارادے سے خدا کی متعین کردہ حد کو توڑ کے سرکشی اختیار کرتا ہے اسے قرآن کی اصطلاح میں شیطانی عمل کہا جاتا ہے' یہ اس کا اپنا ہی ہوتا ہے سرکشی کا عمل اس کو کہئے۔ لیکن ان حدود کو توڑنے کے بعد جب یہ ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے اس سے خود اس کی اپنی ذات کے اندر بھی ایک کمی واقع ہوتی ہے اور معاشرہ بھی تباہ ہوتا ہے اور اس کے جب نتائج سامنے آتے ہیں تو پھر یہ مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا' یہ جو مایوسی ہے اس کا نام ابلیس ہے ابلیس کے معنی ہی مایوسی ہیں۔ تو یہ شیطان و ابلیس دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی باہر کی چیز ہی نہیں ہے انسان کے اپنے اختیار و ارادے کی چیز ہے اور اس میں یہ ہے کہ جب یہ سرکشی برتتا ہے تو اس وقت اس فعل کو شیطنت قرار دیا جاتا ہے اور جب اس کے نتائج اور عواقب کے بعد پھر یہ مایوس ہو کے بیٹھ جاتا ہے تو پھر یہ ابلیسیت ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہوا کہ یہ اس کو اختیار و ارادہ تو یہ دیا گیا ہے کہ یہ چاہے تو ان حدود کو توڑ کے ان تقاضوں کو پورا کرے' اسے گناہ کہا جائے گا جرم

کہا جائے گا' سوء کہا جائے گا' برائی کہا جائے گا' شر کہا جائے گا یہ تو ہے۔

اختیار وارادہ کے تحت کیا گیا عمل ہی نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کے اندر ایسی چیز وہ ہے کوئی طاقت کہ وہ اسے اس چیز سے روک دے؟ خود اس نے اپنے اندر سے یہ سب چیزیں کرنی ہیں' یاد رکھئے! خارج سے کوئی چیز اس کے اوپر ایسی نہیں ہے کہ جو اس کو زبردستی ان حدود کے توڑنے کی طرف لے جائے یا زبردستی اس کو روک کے رکھے کہ تو نے نہیں توڑنا۔ عزیزانِ من! زبردستی کی کی ہوئی نیکی تو نیکی نہیں ہوتی۔ پستول کے زور سے اگر آپ سے کوئی ہزار روپیہ خیرات میں لے لے تو وہ آپ کا عملِ خیر کا ہوگا؟ خیر کا تو لفظ ہی اختیار اور خیر کے تو بنیادی معنی ایک ہیں مادہ ایک ہے دونوں کا' خیر تو ہے وہ جو اختیار کے ساتھ کیا جائے۔ مجبور کی نیکی کوئی نیکی ہوتی ہے! جب مجبور کی برائی' جرم' جرم نہیں ہوتا۔ عدالت بھی اس کو مجرم قرار نہیں دیتی اگر ثابت ہو جائے کہ مجبوراً اس سے یہ کرایا گیا ہے تو مجبوراً جرم یا گناہ جو ہے اسے گناہ گار نہیں بنا دیتا تو مجبور کی نیکی اسے نیکوکار کیسے بنا دے گی۔ تو گویا یہ چیز خود انسان کے اندر ہے کہ اگر ایک تقاضا اس کا ایسا ہے کہ اس کو رزقِ حرام کی طرف وہ چلا جائے تو اس کے ساتھ ہی انسان کے اندر یہ چیز موجود ہے کہ وہ اس کو خود روک دے اس کو' یہ ہے وہ چیز جو اسلام میں آ کے متمیز طریقے سے آئی۔

جنت کے حصول کے لیے تو یہودیوں کے گھر میں پیدا ہونا ہی کافی ہے

میں نے عرض کیا کہ یہودیت کے ہاں صرف بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا ہونے سے جنت ہے' انسان کے اختیار کی بات ہی نہیں۔ کسی بچے کے اختیار کی بات ہی نہیں کہ وہ کس گھر میں پیدا ہو گیا' اسرائیل کے گھر میں پیدا نہیں ہوا' تو بے اختیار جہنم میں' ان کے گھر میں پیدا ہو گیا تو بے اختیار جنت میں۔ عیسائیت میں ہر انسان گناہ گار پیدا ہوا بے اختیار جہنم کے اندر' عمل سے کچھ نہیں ہو سکتا حضرتِ مسیحؑ کی صلیب اور کفارے پہ ایمان لانا پڑے گا۔ قرآن نے آ کے یہ بات بتائی کہ یہ ٹھیک ہے انسانی زندگی جو ہے اس کے حیوانی تقاضے' وہ اسے اکساتے ہیں کہ جس طرح سے بھی کچھ حاصل ہوتا ہے حاصل کرو لیکن اسی کے اندر یہ چیز موجود ہے جو اس سے یہ کہتی ہے کہ نہیں! یہ غلط ہے۔ یہ ابھی دو منٹ میں میں یہ عرض کروں گا جو میں نے کہا ہے کہ اس کے اندر وہ موجود ہے۔ یہ ایک قوت ایسی ہے یوں اس وقت یہ سمجھئے کہ ایک ایسی قوت ہے کہ اگر یہ حیوانیت کے تقاضے اس کو اس کے اوپر ترغیب اس کی دیتے ہیں' اس کی طرف مائل کرتے ہیں' اس کی طرف آمادہ کرتے ہیں کہ اس چیز کو جس طرح بھی ہو سکتا ہے' حاصل کر لو' چوری کر لو' اس وقت دیکھنے والا کوئی نہیں ہے' اٹھاؤ اور جیب میں ڈال لو لیکن اس کے اندر ہی یہ چیز بھی دی گئی ہے یہ صلاحیت اس کے اندر موجود ہے کہ وہ اس چوری سے رک سکتا ہے۔ بیل کو بھوک لگی ہوئی

ہواور اپنے مالک کے علاوہ دوسرے کا کھیت ہواس کے اندر یہ چیز نہیں ہے کہ وہ اس کو اس سے روک دے' انسان کے اندر یہ چیز ہے۔

قرآن حکیم نے اپنے اندر قصہ ابلیس وآدم کو ایک محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے

تو میں نے یہ کہا تھا کہ قرآنِ کریم نے جہاں اس چیز کو یہ کہا ہے کہ اس کے اندر یہ حیوانی تقاضے جو ہیں وہ برائی کی طرف لے جاتے ہیں' اسے اس نے شیطان کہا ہے' ابلیس کہا ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ساتھ ہی کیا کہا ہے؟ قرآن کی رو سے ابلیس کا تصور بڑا اہم موضوع ہے میرے ''لغات القرآن'' میں آپ کو یہ چیزیں مل جائیں گی۔قرآن اپنے محاکاتی انداز میں تشبیہی انداز میں قصۂ ابلیس وآدم بیان کرتا ہے۔سورۃ الحجر میں آپ دیکھئے بڑی تفصیل سے یہ چیزیں دی گئی ہیں مثلاً اسی میں سے یہ 35-34 آیت سے بات شروع ہوتی ہے' وہ پیچھے سے میں پورا قصہ نہیں لا رہا کہ وہ اس موضوع سے متعلق نہیں' بات تو یہاں جب ہوگئی کہ اس نے جب خدا کے حکم سے نافرمانی برتی' وہی سرکشی والا جس کو شیطان کہا جاتا ہے' تو اس سے کہا پہلی بات جو تھی جو میں کئی دفعہ دہرایا کرتا ہوں' سرکشی کے معاملے میں ہی کہ اس کا امکان ہے کہ انسان سے غلطی ہوجائے اور فرق قرآن نے آدم میں اور ابلیس میں یہ بتایا ہے کہ آدم سے یہ جب کہا گیا کہ تم نے ہمارے حکم کے خلاف کیوں کیا؟ تو آدم نے نگاہیں جھکالیں اور کہا کہ **ربنا ظلمنا** ہم سے غلطی ہوئی' ہم نے اپنے آپ پہ زیادتی کی' معافی کے خواستگار ہیں۔کہا کہ ہاں! جس کو غلطی کا احساس ہوجاتا ہے' برائی پہ نادم ہوجاتا ہے' اس کی اصلاح ممکن ہے' بہت اچھا! جاؤ تم ہماری طرف سے یہ جو راہنمائی آئے گی اس کا اتباع کرتے رہو گے تو پھر اس قسم کی غلطی تم سے نہیں ہوگی۔ابلیس سے یہ کہا گیا کہ تو نے معصیت کیوں کی؟ اس نے کہا کہ میں کون ہوں معصیت کرنے والا' تیرے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا' میں تو اس کا ذمہ دار نہیں۔ کہا کہ جو اپنی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا اور اپنی خطا پہ نادم نہیں ہوتا' اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔یہ جو کہتے ہیں قیامت تک کے لئے اس کو کہہ دیا' جا تو راندۂ درگاہ ہے' وہ راندۂ درگاہ کے معنی کیا ہیں؟ وہ یہ ہے کہ تیری اصلاح نہیں ہوسکتی' کس کی نہیں ہوسکتی؟ ہر اس شخص کی نہیں ہوسکتی جو غلطی کی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا' غلطی ہونے کے بعد جو کوشش یہ کرتا ہے کہ کسی دوسرے کو ذمہ دار کیا جائے' اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کس کے سر تھوپی جاسکتی ہے۔اسے اور کوئی وہاں نظر نہیں آیا تو اس نے وہی جو آپ کے ہاں' یہ تقدیر کا عقیدہ ہے کہ صاحب! میں کون ہوں یہ کرنے والا' تیرے حکم کے بغیر اس کائنات میں پتا نہیں ہل سکتا' تیرے ہی حکم سے یہ چیز ہے جو میں نے کیا ہے۔اس نے کہا کہ تیری اصلاح نہیں ہوسکتی' تو اپنے آپ کو ذمہ دار قرار نہیں دیتا۔

قصہ آدم کو بیان کرنے کا قرآنی انداز

اس نے کہا کہ بہت اچھا! مجھے راندۂ درگاہ تو بنایا جارہا ہے اور اس آدم کے مقابلے میں لا کے بنایا جارہا ہے اب اسے بھی دنیا میں

بھیج اور مجھے بھی بھیج (میں نے کہا ہے کہ یہ بات کرنے کا تشبیہی انداز ہے) اور پھر دیکھ کہ میں اس کو کس طرح سے ناکوں چنے چبواتا ہوں اس کو کیسے نچاتا ہوں تھیا تھیا کر کے۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے بھیجتے ہیں۔ کہنے لگا کہ ایک شرط ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ جب یہ وہاں آدم ہوں' اس وقت تک مجھے بھی مہلت دی جائے یہ نہ ہو کہ راستے میں میرا ٹینٹوا دبا دیا جائے۔ اللہ میاں نے کہا کہ نہیں! ہم کسی کی رعی نہیں کریں گے' تمہیں بھی اجازت ہوگی۔ یعنی اب دیکھئے کس انداز سے قرآن بیان کرتا ہے۔ یہاں تک تو یہ چیز آئی کہ آدم کے ساتھ ہی ساتھ سٹیج کے اوپر یہ شیطان نمودار ہوتا ہے اور قیامت تک کے لئے کہتا ہے ساتھ بھی رہنا ہے۔ یعنی آدم کے اندر یہ چیز ہے کہ وہ حدود شکنی کر سکتا ہے۔ یہی تو چیز ہے کر سکنے کے بعد نہ کرنا' یہی چیز تو ہے جو CREDITABLE ہوگی۔ اس نے کہا کہ ہاں صاحب! بھیجئے اور پھر دیکھئے تماشا' کس طرح سے ان کو میں گمراہ کرتا ہوں۔

خدا کی محکومیت اختیار کرنے والے اپنے سرکش جذبات (شیطان) کے سامنے کبھی سرنگوں نہیں ہوں گے

اس نے کہا تھا وَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ (15:39) تمام انسانوں کو میں گمراہ کروں گا۔ اب یہ چیز وہ آ گئی وہی عیسائیت والی کہ تمام انسان جو ہیں' وہ غلط راستے کے اوپر چلیں گے۔ قرآن ہے! اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ (15:40) قرآن نے کہا کہ نہیں! ہمارے مخلص بندے جو ہیں اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (15:42) ہمارے مخلص بندے جو ہیں ان پر تیرا کوئی غلبہ نہیں ہوگا۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن نے کہی کہ کتنی ہی بڑی قوت کیوں نہ ہو شرکی' خواہ وہ خارجی معاشرے کے اندر ہو' خواہ وہ استبداد کے اندر ہو' خواہ انسان کے اپنے اندر کی خواہشات ہوں' کتنی ہی زیادہ طاقتور کیوں نہ ہوں' قرآن نے کہا ہے کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (15:42) میرے بندوں کے اوپر تیرا کسی قسم کا غلبہ نہیں چل سکے گا' تمہاری کوئی قوت اس پہ غالب نہیں آ سکے گی۔

قدرت نے انسان کے جذبات پر تا قیامت کوئی پابندی نہیں لگائی اس کا اختیار تو انسان کے پاس ہے

یہاں عبادی کہا ہے' عام انسان مراد ہوں تو اس میں تو سارے ہی آ جاتے ہیں لیکن اس خوبصورت لفظ میں یہ کہا ہے جو ہماری محکومیت اختیار کرے گا' اس پہ تیرا غلبہ نہیں ہوگا بشرطیکہ وہ ہمارا غلبہ قبول کر لیں۔ یہ عبادی بڑی چیز ہے۔ ان پہ تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ تو گویا قرآنِ کریم نے یہ بات یہیں بتا دی کہ وہ بھی غلط ہے کہ ہر بچہ پیدائشی گناہگار پیدا ہوتا ہے' یہ بھی غلط ہے کہ شیطان کی قوت اتنی بڑی ہے کہ کوئی اس سے بچ ہی نہیں سکتا۔ یہ چیز کہ انسان کا نفس اس کو ہمیشہ برائی کی طرف لے جاتا ہے اور اس سے بچنے کی کوئی قوت ہی اس کے پاس نہیں ہے' قطعاً غلط ہے' غیر اسلامی ہے۔ یہ بنیادی تصور تھا کہ انسان کا نفس جو ہے' یہ لے جاتا ہی اس کو برائی کی طرف ہے کہ ہمارے ہاں پھر یہ جو تصوف آپ کے ہاں آیا وہی آپ کے ہاں کا غیر اسلامی تصوف' اس نے یہ کہا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ نفس کو مارو۔ ارے مارو

کیسے؟ اس کا نام اگر شیطان ہے تو اس نے تو خدا سے مہلت لے رکھی ہے قیامت تک کے لئے' خدا نے کہا ہے کہ قیامت تک کے لئے ہم تمہیں زندہ رکھیں گے' یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم پہلے ہی مار کے بتا دیں گے۔ سوال اس کے مارنے کا نہیں ہے۔

ایک حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے شیطان کو مسلمان کر لیا تھا

وہی بات جو دہرایا کرتا ہوں نبی اکرم ﷺ نے فرما دیا تھا' بار بار دہراتا ہوں کہ اس کا نقش کر لینا بڑا ضروری ہے' بڑی گہری ہے بات ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا شیطان ہوتا ہے' ابلیس ہوتا ہے۔ صحابہؓ کو تعجب ہوا انہوں نے کہا کہ کیا آپ ﷺ کا بھی ابلیس ہے؟ کہا ہاں! میرا بھی ابلیس ہے۔ جھرجھری آ گئی ہوگی۔ کہنے لگے پھر؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیا ہے۔

علامہ پرویزؒ کی سوانح عمری کا ایک ورق

عزیزانِ من! یہ ہے ساری بات۔ وہ ہے تو سہی' اسے مارنا جو ہے یہ بڑا غلط تصور ہے۔ کس چیز کو مار رہے ہو! تمہارے اندر ایک اختیار و ارادے کی صلاحیت ہے کہ تم برائی کی طرف بھی جا سکتے ہو' اس سے رک بھی سکتے ہو' مارنا اس کا کیا' ارادے کو ترک کرنے کی بات کہہ رہے ہو' پھر وہ انسانیت باقی رہے گی' حیوان ہو جاؤ گے۔ نفس کو مار رہے ہیں' مر سکتا ہی نہیں ہے۔ میں نے کئی دفعہ لکھا ہے' کہتے ہیں نفس مارنے کا طریقہ یہ ہے کہ ترکِ خواہشات یعنی خواہش پیدا نہ ہو۔ میں ان وادیوں میں سے گذرا ہوں یہ ساری چیزیں پہلے پرچار کرتا رہا پھر ان کے اوپر جب غور کیا' تنقید کی تو بات قرآن کی روشنی میں سمجھ میں آئی۔ کہتے ہیں کہ صاحب! خواہش ہے اصل جو انسان کے اندر برائی اور شیطان ہے ان خواہشات کا ترک کر دینا نفس کو مارنا ہے۔ تو میں نے یہ کہا تھا کہ صاحب! یہ چیز خواہشوں کو مار دینا چاہئے یہ خواہش ہے یا نہیں ایک؟ عزیزانِ من! کبھی یہ آئے گی سوانح عمری تو وہاں دیکھیں گے کہ میں پھر یہاں سے کس طرح سے نکلا تھا۔ آدھی عمر انہی میں گذری تھی۔ یہ چیز تھی کہ ترکِ خواہش یہ تم مقصودِ حیات بتاتے ہو' قربِ الٰہی ہوتا ہے' اس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے یہ چیز کہ ہمیں خواہشات کو ترک کرنا ہے' یہ تو خود ایک خواہش ہے اور جتنی یہ خواہش زیادہ طاقتور ہوگی اتنا ہی اس میں کامیاب تم کہتے ہو ہوگا تو ترکِ خواہشات کا تو اصول ہی تمہارے ہاں غلط ہو گیا۔ کبھی کبھی یونہی یہ پرانے شعر نازل ہو جاتے ہیں

وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری
چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی

ترکِ خواہشات' تو کیا یہ خواہش نہیں ہے ترکِ خواہشات۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے قرآن سے ہٹ کے جب بھی

آپ کوئی ردار کھیں گے ''تا ثریا می رود دیوار کج'' آسمان تک وہ دیوار ٹیڑھی جاتی ہے۔اور جب یہ بات یوں سامنے آتی ہے وہ سم سم والا کھلنے والا جو تالا ہوتا ہے حرفوں والا' ٹکریں مارتے رہو' وہ کھلتا ہی نہیں ہے لیکن آپ کی سمجھ میں جب آ جائے کہ اگر وہ یوں ملایا اور کھلا۔ عزیزانِ من! قرآن تو یہ تالے کی چابی دیتا ہے' ایسی کنجی دیتا ہے' وہ تین حرف اس کے ملایئے تالا کھل جاتا ہے۔

ہزار برس سے تصوف پر صوفیا کرام کی طرف سے پیش کردہ لٹریچر کی نوعیت ترکِ خواہشات پر ہی ہے

اب آپ کے سامنے یہ پیش پا افتادہ سی بات نظر آئے گی کہ واقعی یہ بھی تو ایک خواہش ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں ہزار برس سے آپ کے ہاں کا صوفیا کرام کا لٹریچر چلا آ رہا ہے۔بس اس نقطے کے اوپر کتابوں کے کمرے بھرے ہوئے ہیں کہ صاحب! ترکِ خواہشات اصل چیز ہے۔عزیزانِ من نہیں! ترک کی بات نہیں ہے' ابلیس کو مسلمان کرنے کی بات ہے یعنی اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (15:42) جنہوں نے میری محکومیت اختیار کر لی اس پہ تیرا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔یہ خدا کی عبودیت اختیار کرنا جو ہے یہ بھی تو انسان کے اپنے اختیار و ارادے سے ہی ہوتا ہے' جبر سے تو کوئی مسلمان کیا ہی نہیں جاتا' ہو ہی نہیں سکتا۔مسلم کے تو خود معنی یہ ہیں اپنے اختیار و ارادے سے سرِ تسلیم خم کرنے والا۔زبردستی کسی کا سر جھکایا جائے' عربی قاعدے کی رو سے' اس کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا۔

لفظ اسلام' مسلم' اطاعت قرآن حکیم کے عجیب الفاظ ہیں

تو جیسا میں کہا کرتا ہوں زبان عجیب ہے' انتخاب قرآن کے عجیب ہیں ان معنی میں۔یہ اسلام کے معنی آپ نے دیکھ لئے' سَلَم کے معنی ہی ہیں جبر کے بالکل ضد ہے یہ لفظ عربی لغت میں۔جس طرح اطاعت کا لفظ ہے' خود لفظِ اطاعت کے اندر یہ چیز ہے' جبر سے کسی کا کوئی حکم مانا جائے اس کے لئے عرب لفظ اطاعت کا استعمال نہیں کرتا۔وہ طاعِ نخل کہتا ہے یہ پھل جو ہیں جب تک یہ کچے ہوتے ہیں تو ان کو زبردستی وہاں سے توڑنا پڑتا ہے جب وہ پک جاتا ہے تو پھل خود نیچے گرتا ہے' کھجور کا پک کے از خود جو گرنا تھا اس کے لئے وہ اطاعت کا لفظ استعمال کرتے تھے۔خدا کی محکومیت سے اس قدر اندر پختگی آ چکی ہو کہ پکے ہوئے پھل کی طرح یہ خود گرے' یہ اطاعت ہے یہ ہے اسلام' یہ ہے ابلیس کو مسلمان کرنا جسے حضور ﷺ نے کہا تھا۔اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ(15:42) اس کے چیلنج کا کتنا بڑا جواب ہے۔اس نے یہ کہا تھا وَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ (15:39) مجھے بھیج اور یہ مہلت دے پھر دیکھ میں کس طرح ان سب کو گمراہ نہیں کرتا' یہ تھا بہت بڑا چیلنج۔کہا کہ یہ ٹھیک ہے تمہارا یہ ہے' اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ(15:42) جاؤ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لو' جو یہ طے کر لیں گے کہ انہوں نے ہمارے احکام کے تابع رہنا ہے' کوئی غلبہ تمہارا نہیں ہو سکتا۔

تصوف کی دنیا میں نفس امارہ کو خواہشات کے نام سے نفس کشی کی اصطلاح میں استعمال کیا جانے لگا

عزیزانِ من! پہلی بات میں نے عرض کیا تھا جو یہاں سے آئی تھی اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (12:53) سے' نفسِ امارہ جو ہمارے ہاں چلا بس وہ چلا تو وہ نفسِ امارہ صاحب! انسان کے اندر ہے۔ وہ نفسِ امارہ پہلے چلا اور اس کے بعد پھر وہ نفس ہی وہ جس کا نام خواہشات ہو گیا۔ آپ نے تصوف میں سنا ہو گا نفس کشی ان کی اصطلاح ہے یعنی خود پھر وہ نفس جو تھا وہی ایسا ہو گیا کہ اس کو مار ہی دینا چاہئے۔ یہ نفسِ امارہ سے بات آگے چلی تھی۔ یہ ابلیس کا تغلب نہیں ہو سکتا خدا کے بندوں پر' یہ کئی مقامات پہ آیا ہے دو تین حوالے لکھ لیجئے (15:40-42, 16:99-100, 17:65)۔ بڑی عظیم چیز ہے۔

لفظ امارہ کے بعد نفس لوامہ کی اصطلاح کی وضاحت

اب دوسرا ہمارے ہاں نفسِ لوامہ ہے یہ آیت ہے (75:2)' یہ چیز بھی بڑی ضروری سمجھنے کی ہے۔

انسانی ذات کی نشو ونما کا تعلق مکمل طور پر مکافاتِ عمل سے وابستہ ہے

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝(75:1-2-3) بات ہی یہاں سے شروع ہوئی ہے کہ نہیں! بات یوں نہیں ہے جیسا تم اپنے ذہن میں سمجھے ہوئے ہو (قرآن کا انداز بڑا عجیب ہوتا ہے) بات دوسری ہے جو ہم کہتے ہیں اور پہلے جو کہا گیا ہے اس سے پہلے شہادت پیش کی جا رہی ہے' ہم اس میں شہادت پیش کرتے ہیں' ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل اور اس کے نتائج جو ہیں اسے اور شہادت پیش کرتے ہیں اس شے کو کہ جو انسان کو اس کے اندر سے ملامت کرتی ہے اور آگے یہ چیز ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ بس! انسان کا جسم یہاں مر گیا اور انسان ختم ہو گیا! غلط بات ہے۔ مکافاتِ عمل کے راستے میں یہ تمہاری طبعی موت حائل نہیں ہوتی ہے جس شے کو انسان کہا گیا ہے یا اس کا نفس کہا گیا ہے وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے اپنے ان تمام اعمال کو ساتھ لئے ہوئے جو یہاں اس نے کئے ہوتے ہیں۔

ضمیر کی آواز کے متعلق پایا جانے والا تصور بنیادی طور پر ہی غلط ہے

یہاں نفسِ لوامہ ہے' لوامہ کے معنی ملامت کرنے والا ہے۔ یہ کونسی چیز ہے؟ ہمارے ہاں ایک اور غلط تصور ہے اور وہ ہے ضمیر کی آواز' نفسِ لوامہ جسے کہتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کے اندر یہ چیز ہے کہ وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کر دیتی ہے اور یہ چیز کہ جو برائی ہوتی ہے اس پہ ملامت کرتی ہے' بھلائی کو اچھا سمجھتی ہے۔ یہ انسان کی ضمیر کہلاتی ہے۔ ضمیر کے معنی چھپی ہوئی چیز۔ یہ آپ دیکھتے ہیں کہ اسے پیش کر دیا جاتا ہے ایک مسلّمے کی طرح کہ یہ بالکل حقیقت ہے اور پھر نفسِ لوامہ قرآن نے کہہ ہی دیا ہے سند بھی ہے' یہاں امارہ کہا'

یہاں سند ہوگئی' وہاں لوامہ کہا وہاں سند ہوگئی۔ پھر سوچ رکھئے کہ یہ تصور عام کیا جاتا ہے کہ انسان کے اندر یہ چیز ہے وہ برائی اور بھلائی میں خود تمیز کر دیتی ہے۔ بکری کے اندر یہ چیز ہے کہ وہ اپنے اس چارے میں جو اس کے لئے حلال ہے' گھاس پھوس اور اس میں کہ جو حرام ہے یہ گوشت وغیرہ' تمیز کر دیتی ہے۔ مرغی کے چوزے کے اندر یہ چیز ہے کہ وہ پانی کی طرف نہیں جاتا' خشکی پہ رہتا ہے۔ بطخ کا بچہ پانی کی طرف جاتا ہے' ان کے اندر یہ چیز ہے کہ بلی کی میاں یا چیل کا سایہ دیکھتے ہیں تو جھٹ سے ماں کے پروں کے نیچے چلے آتے ہیں۔ یہ طبعی زندگی کی چیزیں ہیں۔ بات انسانی زندگی کی تو آگے آئے گی۔ میں پوچھتا ہوں کہ انسان کے بچے کے اندر بھی یہ چیز ہے؟ اس کے اندر تو اتنی سی چیز بھی نہیں جو مرغی کے چوزے کے اندر ہو۔ مرغی کے چوزے کو ہزار اِدھر سے اُدھر گھیر کے لاؤ اور آگے پانی ہو وہ بھاگ کے اِدھر سے اُدھر نکل جائے گا' کبھی پانی کی طرف نہیں جائے گا۔ اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہاں بیٹھے ہیں او! دیکھنا دیکھنا وہاں ٹب ہے وہاں بچہ گیا ہے'' جدوں بچہ رڑن لگ پینداائے' مصیبت آ جاندی اے' اواگ اچ ہتھ پا دیتا' مرچاں کھان ڈیا ہیگا اے' اکھیاں نوں لایا ہو یا ہیگا' ٹب وچ گریا ہو یا ہیگا'' یعنی اس کی تو کیفیت یہ ہے کہ طبعی زندگی میں اس کے اندر یہ چیز نہیں' قدم قدم کے اوپر روکنا پڑتا ہے۔ طبعی زندگی میں یہ نہیں ہے تو انسانیت کی زندگی کے اندر کیا ہوگا۔

خیر و شر کے امتیاز کو واضح کرنے کے لیے ہی تو انبیائے اکرام کی بعثت ہوئی تھی

عزیزانِ من! سیدھی سی بات ہے میں عرض کرتا ہوں کہ ایک غلط چیز جب چل نکلتی ہے تو پھر وہ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ کوئی کھڑا ہو کے سوچتا نہیں۔ اگر ہر انسان کے اندر یہ چیز موجود ہے غلط اور صحیح کا امتیاز' خیر اور شر کا امتیاز' GOOD & EVIL کا امتیاز اس کے اندر تو موجود ہے تو یہ سلسلۂ رشد و ہدایت' یہ انبیائے کرامؑ کا بھیجنا' جبریل کا آنا' کتابیں آنا' رسولوں کا آنا' یہ کاہے کے لئے!! خدا نے بکریوں کی یا شیروں کی طرف تو کوئی پیغمبر نہیں بھیجا جو آ کے بکری کو تبلیغ کرے گھاس کھانا' گوشت نہ کھانا' جنت میں چلی جاؤ گی' سوال ہی نہیں۔ اگر اس کے بھی اندر یہ چیز تھی تو یہ خارج سے اس کو ہدایت دینے کا اتنا بڑا سلسلہ یہ کاہے کے لئے کیا۔ نظر آتا ہے کہ بنیادی طور پہ یہ چیز غلط ہے' تجربے کے خلاف ہے' فکر کے خلاف ہے۔ اس کے اندر یہ چیز ہے نہیں' ہوتی تو اس کی ضرورت نہیں تھی اس کی تو ضرورت ہی اس لئے پیش آئی کہ اس کے اندر یہ چیز نہیں تھی۔

دراصل انسانوں کی اکثریت غلط تصورات کے الفاظ میں الجھی ہوئی ہے

پھر جب ان سے کہئے کہ صاحب! اس کے اندر چیز ہے تو یہ سارے کے سارے لوگ آپ دیکھتے ہیں جنہیں آپ شر یا خرابی یا برائی یا سوء کہتے ہیں' بددیانتی' چوری چکاری' جھوٹ' بے ایمانی' یہ سارا کچھ پھر کیوں ہو رہا ہے؟ کہ جی! وہ ضمیر مردہ ہو جاتی ہے۔

یعنی خدا کی دی ہوئی یہ قوت اس بکری کے اندر مردہ نہیں ہوتی حالانکہ سب سے کمزور تر چیز آپ بزدل کہتے ہیں وہ جو چوزہ ہے اس کے اندر تو مردہ نہیں ہوتی انسان کے اندر ہو جاتی ہے' جس نے مردہ ہی ہو جانا تھا تو اس کو دینے کا فائدہ کیا یعنی اس نے کام کیا دیا۔ میں کیا عرض کروں کہ الفاظ کے کیا کیا غلط تصورات چلتے ہیں کوئی کھڑا ہو کے سوچتا نہیں ہے۔

انسان کے پاس اختیار وارادے کا ملکہ تو ہوتا ہے البتہ بکری کی طرح فطرت نہیں ہوتی

انسانی فطرت صاحب' اندازہ لگایئے! فطرت تو وہ شے ہوتی ہے جو بدل ہی نہیں سکتی' کونسی اس کی فطرت ہے جو بدلتی نہیں ہے' انسان کے متعلق تو یہ کہ یہ اس قدر UNPREDICTABLE جانور پیدا ہوا ہے آپ کہہ ہی نہیں سکتے کہ دوسرے قدم پہ یہ کیا کرے گا۔ فطرت تو پانی کی ہے کہ پتہ ہے کہ جب بھی اس کو چھوڑا' نشیب کی طرف جائے گا' فطرت تو سورج کی ہے جب پتہ ہے ہزار سال پہلے کہ سورج گرہن فلاں وقت پہ لگے گا اتنا لگے گا۔ فطرت تو مجبور کی ہوتی ہے جس کو اختیار وارادہ دیا گیا ہے اس کی فطرت کیا۔ بہرحال !! میں نے عرض کیا کہ یہ تصورات غلط ہیں۔ یہ ضمیر کی بات جو میں کہہ رہا تھا کہ انسان کے اندر یہ چیز ہے' ہم نے دیکھا کہ یہ اندر چیز نہیں ہے اندر ہوتی تو باہر سے ہدایت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اندر اس کے صرف اس کا اختیار وارادہ ہے جس طرح جی چاہے' اسے استعمال کرے۔

حضرت انسان کو خارج سے وحی کی نعمت سے نوازا گیا اور یہی خیر وشر کا معیار ہے نہ کہ عقل انسانی

اب انسان کو خارج سے یہ چیز دی گئی اس کو جسے آپ وحی کہتے ہیں' یہ غلط ہے یہ صحیح ہے' یہ خیر ہے یہ شر ہے' یہ نیکی ہے یہ بدی ہے' یہ حدود ہیں جو کھینچی گئی ہیں' یہ دیا گیا اس کو۔ اب وہ جو چیز ہے اندر سے یہ تو ہمارا تجربہ ہے کہ ایک شے اندر سے ملامت کرتی ہے وہ شے کس چیز پہ ملامت کرتی ہے؟ جس چیز کو آپ برا سمجھتے ہیں وہ فعل بھولے سے اگر آپ سے سرزد ہو جاتا ہے' سہواً ایسا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اس سے احساس آپ کو ہوتا ہے۔ وہ جسے آپ غلط سمجھ رہے تھے وہ اگر ارتکاب ہوتا ہے تو اس کے اوپر آپ کے اندر سے آواز آتی ہے کہ غلط کیا تم نے۔

انسانی جذبات کی کیفیت

پہلی شرط یہ ہے کہ اسے آپ نے پہلے غلط سمجھا ہوا تھا جسے آپ نے غلط سمجھا ہوا نہیں ہے' اس کے کرنے کے اوپر اندر سے آواز ہی نہیں آتی آپ کو۔ یہ جینیوں کا بچہ جو گوشت کو حرام سمجھتے ہیں یا ہندوؤں کے ہاں کے بھی یہ لکشمی بھگتنے ان کے ہاں گوشت حرام ہے' ان کا بچہ یا ان کے بڑے کے سامنے گوشت کا نام لے لیجئے آپ دیکھئے ان کو قے آنے لگ جاتی ہے اس قدر نفرت ہوتی ہے اس بچے کے اندر۔

اور ہمارے ہاں کا بچہ ابھی دانت بھی نہیں نکلتے ذالقے کے بارے میں ہے۔ کہتے یہ تھے کہ صاحب! وہ باورچی ایسا آنا چاہئے کہ وہ روز دال ہی تو کھاتے تھے بھاجی ہی کھاتے تھے تو وہ روز باورچی کو نکال دیتے تھے' ایک باورچی آ گیا اس نے کہا کہ صاحب! میرا بھی تجربہ کر کے دیکھئے اس نے ان کو وہ دال اور بھاجی کھلانا شروع کی وہ ایسی لذیذ پکاتا تھا کہ انگلیاں چاٹتے تھے۔ کسی بات پہ وہ غصے ہوئے اس کو نکالا دوسرا باورچی آیا وہ ویسی پکا ہی نہیں سکتا تھا' منتیں کر کے پھر اس کو لائے اس نے پھر پکانا شروع کیا۔ ایک دن کہیں غلطی اس کی ہوگئی وہ چھلنی خراب تھی یا ذرا سا تساہل ہوگیا تو انہوں نے جو لقمہ منہ میں لیا تو کوئی چیز کٹکنے والی آئی۔ وہ دیکھا تو اتنی سی ہڈی تھی تو وہ یخنی میں پکایا کرتا تھا اب وہ جو ہڈی نظر آئی تو سارا گھر رام رام رام اور یہ ہو رہا' قے ہو رہی ہیں سب کچھ ہو رہا ہے اور بنارس جانے کے پروگرام بن رہے ہیں صاحب! یہ کیا ہوگیا ہماری تو ساری دنیا ہی ختم ہوگئی' تباہی آئی۔ یہ اندر سے کس چیز نے یہ آواز دی ہے اس ہڈی کے احساس سے کہ جب تک وہ کھاتے رہے بغیر ہڈی کے یخنی میں اس وقت تک تو کوئی اندر سے آواز اس نے نہیں دی۔ یہ بھی مزے لیتا رہا یہ جو اس دن یہ پتہ چلا کہ ہڈی ہے' یہ کس چیز نے آواز دی؟ وہ جو شروع سے ان کو کہا جا رہا تھا کہ گوشت قابلِ نفرت' گوشت قابلِ نفرت' گوشت قابلِ نفرت۔ مسلمان کو تو یہ آواز اندر سے نہیں آتی وہ تو ہڈیاں بھی چبا لیتا ہے ایسی لذیذ بعض اوقات ہوتی ہے۔ کیا چیز ہے؟

بچپن کے عقائد اور تصورات کی پیدا کردہ تاثیر بڑی دوررس ہوتی ہے

عزیزانِ من! بڑی اہم چیز ہے جس چیز کو آپ بچپن سے کہتے چلے آئیں۔ بچوں کے ذہن میں ڈال دیں کہ یہ غلط ہے وہ چیز اگر بڑے ہونے کے بعد سرزد کہیں ہو یا سامنے آئے تو اس سے نفرت ہوتی ہے۔ ٹھگوں کے بچے کو بچپن سے ہی سکھایا جاتا تھا کہ پہلی نیکی جو دیوی نے تمہارے ہاں کالی دیوی نے مقرر کی ہے وہ یہ ہے کہ پہلا کام جوان ہونے کے بعد کسی مسافر کو لوٹنا اور اسے مارنا ہے۔ جس دن وہ یہ کر آتا تھا بہت بڑا مہاپن تھا۔ آ کے اپنی اس دیوی کے حضور لا کے وہ پانچواں حصہ رکھتا تھا اور وہاں وہ کہتا تھا کہ میں آج سبکدوش ہوا ہوں اپنے فریضے سے اور اس دن اس قبیلے کے اندر جشن منایا جاتا تھا۔ یہ کیا چیز تھی؟ اس کی ضمیر تو اسے یہ نہیں کہتی تھی کہ مسافر کا لوٹنا ہی نہیں بلکہ وہ گلا گھونٹ کے مارا کرتے تھے' مار دینا کوئی بری چیز ہے' بچپن سے اس کو یہ تعلیم دی جاتی تھی۔ تو یہ جسے آپ ضمیر کہتے ہیں جسے آپ اندر کی آواز کہتے ہیں یہ وہ چیز ہوتی ہے جس کی آپ تعلیم بچپن سے دیتے چلے آتے ہیں۔ تربیت کرتے چلے آتے ہیں۔ خیال راسخ کرتے چلے جاتے ہیں کسی کے ذہن کے اندر۔ یہ از خود کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو غلط اور صحیح میں تمیز کرے بلکہ جسے آپ غلط سمجھتے آ رہے ہیں اس کے ارتکاب سے یہ اندر سے آواز آتی ہے کہ غلطی کی۔ جسے آپ صحیح سمجھتے ہیں اس کے کرنے کے بعد اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

کچھ بچپن سے گزرے ہوئے لمحات کی یادیں

تو یہ بات جو ہے غلط اور صحیح کی تمیز یہ انسان کے اندر کی چیز نہیں ہے' یہ باہر کی چیز ہے اور باہر میں اب دو تین چیزیں ہیں۔ یا تو سوسائٹی کسی چیز کو یہ کہہ دے کہ یہ غلط ہے' معاشرے کا بڑا اثر ہوتا ہے' یہ جواب آپ کی آنے والی نسل بے شمار ان چیزوں کو کہ جو اس سے ذرا پہلے آپ کے ہاں بے حد معیوب قرار دی جاتی تھیں' اب ان کے ہاں وہ معیوب ہیں ہی نہیں یعنی تصور ہی نہیں رہا کہ یہ قابلِ نفرت شے ہے' یہ کس بات کا اثر ہے؟ کہ بچپن سے ہماری نئی نسل جو ہے اس کو یہ بتایا ہی نہیں گیا' اس کو یہ تربیت ہی نہیں دی گئی کہ یہ چیز معیوب ہے۔ یعنی میں بنفسہٖ ہی نہیں کہہ رہا کہ جسے میں مثال دونگا کہ یہ معیوب تھی یا نہیں تھی' ہم ہی جو ہیں یہ پچھلی نسل والے جنہیں ہم کہتے ہیں سوال ہی نہیں تھا صاحب! کہ ہم گھر سے باہر ننگے سر نکل سکتے' سوال ہی نہیں تھا۔ معاشرہ بھی وہ تھا کہ باہر نکلنے میں پہلا دوکاندار روک دیتا تھا اور کسی بزرگ کے سامنے ننگا سر ہو جانا تصور میں نہیں آتا تھا۔ کیا بات بتاؤں اس زمانے کی وہ پھر آپ کہیں گے کہ ہاں! پرانے زمانے کو یہ لوگ یاد کرتے ہیں' زمانے کو نہیں بات مثال میں میں دیتا ہوں۔ دوسری تیسری چوتھی جماعت کے بھی ماسٹر وہیں رہا کرتے تھے' وہیں ہم ہوتے تھے نہایت اچھا لڑکا وہ فرسٹ سٹینڈ کرنے والا کام بھی بڑا اچھا کرتا تھا وہ آگے ہے اور ایک دن اس نے چھڑی لی ہوئی ہے ماسٹر جی نے اور وہ آ گیا اس کے سامنے' وہ لگا اس کو پیٹنے تو اس نے کہا کہ جی! میں نے تو کام ٹھیک کیا ہے' کہنے لگے کام وام سب ٹھیک تھا میں نے دیکھا کل بازار میں تو ننگے سر جا رہا تھا۔ یہ چیز تھی اور اس کے بعد آج تو ٹوپی پہن کے چلنے والا' اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ میں کیا بن کے چلا آ رہا ہوں۔ یعنی معاشرہ میں کہہ رہا ہوں معاشرہ آپ کو کوئی چیز جسے ABSOLUTE GOOD & ABSOLUTE EVIL کہتے ہیں شرِ مطلق' خیرِ مطلق جو ہر حالات میں ہر زمانے میں خرابی ہو' ہر حالات میں اچھائی ہو اسے کہتے ہیں شرِ مطلق اور خیرِ مطلق (ABSOLUTE GOOD & ABSOLUTE EVIL) معاشرہ جو آپ کو دیتا ہے وہ RELATIVE GOOD & RELATIVE EVIL دیتا ہے' اضافی جسے کہتے ہیں ایک وقت میں معاشرہ ایک چیز کو اچھا قرار دیتا ہے وہ اچھا ہوتا ہے' دوسرے ہی وقت میں وہ معاشرہ یا سوسائٹی جو ہے اس چیز کو غلط قرار دیتی ہے تو وہ غلط ہو جاتی ہے۔ ABSOLUTE کے معنی ہوتے ہیں کہ اگر وہ GOOD ہے تو کبھی بھی EVIL نہ ہو سکے اگر وہ EVIL ہے تو کبھی بھی GOOD نہ ہو سکے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس تمیز کو نہیں بدل سکتا جو GOOD & EVIL میں وحی نے کی ہے یہ ہے وہ تمیز جو وحی کے ذریعے سے ملتی ہے۔ تو سوسائٹی کے ذریعے سے جو آپ کو تمیز ملی اچھائی اور برائی میں وہ تو ہم نے دیکھا خود سوسائٹی اس کو روز بدلتی چلی جاتی ہے۔

یورپ کی سوسائٹی اور سیاست کے میدان کی بے لگام جمہوریت کا نتیجہ

یہ تو میں نے چھوٹی چھوٹی سی باتیں آپ کو بتائی ہیں یہ نہج جو ہے رہنے سہنے کا۔ یہ جنسیات کے تعلقات کے متعلق دیکھئے یورپ کی سوسائٹی کیا کرتی چلی جارہی ہے' کہاں تک اس کے اندر تبدیلیاں پیدا کررہی ہے۔اور پھر اس میں تو اب کوئی لمبی چوڑی بحث اور دلائل کی ضرورت نہیں ہے' اس ڈیموکریسی نے تو تباہ کردیا انسان کو' جونہی اکیاون نے ایک چیز کے متعلق فیصلہ کیا کہ ہاں! یہ غلط ہے وہ LAW بن گیا کہ غلط ہے۔جس نسل کی آپ نے جس طرح پرورش کی ہے کہ یہ جنسیات کوئی شے ہی نہیں ہے حیوانی زندگی میں آپ دیکھتے ہیں BIOLOGICAL INSTINCT ہے اور تقاضا ہے بس اللہ اللہ خیر سلا۔ یہ بچے جن کی یوں تربیت کی جائے کل کو یہی کیبنٹ میں یا پارلیمنٹ میں جانے ہیں آپ ان کی اکاون کہتے ہیں یہ تو سو فیصد ووٹ سے یہ چیزیں کہیں گے کہ ہاں صاحب! اس سے ساری پابندیاں اٹھادیجئے۔اٹھادی ہیں پابندیاں۔

عقلِ انسانی' زندگی کے کسی شعبہ کے لیے بھی مستقل اقدار دے ہی نہیں سکتی

میں کہہ یہ رہا تھا کہ سوسائٹی آپ کو RELATIVE GOOD & RELATIVE EVIL دیتی ہے۔اضافی دیتی ہے' مستقل مطلق نہیں دیتی ہے۔اب جو چیز سوسائٹی نے معیوب قرار دی ہے' اس سوسائٹی کے بچوں کے دل میں وہ چیز موجود ہوگی۔ بڑے ہونگے تو وہ اسی کو معیوب سمجھیں گے اس کی خلاف ورزی کریں گے تو اندر سے ایک چیز جو ہے وہ کہے گی کہ خرابی کرتے ہو۔ہم جب اس زمانے میں ننگے سر باہر نکلتے تھے تو واقعی اندر سے ایک آواز آتی تھی آج ہم ننگے سر چلتے ہیں تو وہ آواز نہیں آتی۔

Conscious انسان کے اپنے اپنے اندر ہی کی آواز ہوتی ہے جو بعد میں سوسائٹی کا قانون بن جاتی ہے

تو یہ آواز کیا تھی؟ وہ علامہ اقبالؒ نے تین لفظوں میں اس بات کو کہا ہے اور میں پہلے بھی کہا کرتا ہوں کہ یہ جسے آپ CONSCIOUS کہتے ہیں جسے آپ ضمیر کہتے ہیں یہ کچھ نہیں NOTHING BUT SOCIETY سوسائٹی اندر داخل ہوگئی ہوتی ہے۔سوسائٹی جب باہر رہتی ہے تو وہ قانون کہلاتی ہے' سوسائٹی اندر داخل INTERNALIZED ہوجاتی ہے تو ETHIC بن جاتی ہے' اخلاق کا ضابطہ بن جاتی ہے۔عزیزانِ من! اسے کہتے ہیں جسے ضمیر کہا جاتا ہے یا نفسِ لوامہ کہا جاتا ہے۔اب خدا کے عبد کے اندر نفسِ لوامہ کیا کرے گا؟ بچپن سے اس کو بتایا گیا ہے کہ وحی نے اس چیز کو جائز قرار دیا ہے اسے ناجائز قرار دیا ہے اندر اس کے یہ چیز پختہ ہے۔غلطی ہوسکتی ہے' سہو ہوسکتا ہے۔اس سے اگر غلطی سے کسی وقت بھی حدود شکنی ہوجاتی ہے اس کے فوری بعد اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ شے جو اندر پختہ آپ کے ہوئی ہوئی ہے وہ یہ کہتی ہے کہ یہ برائی ہے جو تو نے یہ کی ہے یہ موجود ہے

اسے کہتے ہیں نفسِ لوامہ۔

سوسائٹی کا دوسرا نام عام معاشرے کا ضمیر ہوتا ہے جو ماں کی آغوش میں پرورش پاتا ہے لہٰذا جیسی ماں ویسا معاشرہ

تو دو باتیں واضح ہوگئیں جن کا واضح ہونا نہایت ضروری ہے کہ خود انسان کے اندر کوئی ایسی قوت یا صلاحیت نہیں ہے جو ABSOLUTE GOOD & ABSOLUTE EVIL میں تمیز کر سکے مطلق شر اور مطلق خیر میں تمیز کر سکے کہ وہ جو ہر زمان اور ہر حالت میں خراب ہو' نہ' جسے خراب کہا جاتا ہے گھروں کی تربیت اسی لئے ضروری ہے' یہ ضمیر بنتی ہے۔ علامہ نے تو سوسائٹی کا کہا ہے عام معاشرے کا' یہ ضمیر بنتی ہے ماں کی آغوش میں' علامہ نے کہا ہے کہ SOCIETY INTERNALIZED ' قرآن کہتا ہے جسے آپ سوسائٹی کہتے ہیں وہ بنتی کیسے ہے؟ سوسائٹی کے لئے امت کا لفظ ہے آپ کے ہاں عربی میں بھی اور قرآن میں بھی اور امت تو ام بناتی ہے۔ ام کے معنی ماں ہیں قرآن کہتا ہے ماں امت بناتی ہے۔ عزیزانِ من! بڑی چیز ہے۔ یہ جسے آپ ضمیر کہتے ہیں جسے آپ نفسِ لوامہ کہتے ہیں یہ جو اندر سے بولنے والی چیز ہے' یہ ماں کی آغوش میں پرورش پاتی ہے۔

امت کی تشکیل کے لیے ماں کی عظمت نشان راہ بنتی ہے

عزیزانِ من! ماں کو بڑی اہمیت ہے اور ماں کی بڑی ذمہ داری ہے۔ قوم کی تشکیل ماں کے ہاتھوں میں ہے' معاشرہ ماں متشکل کرتی ہے' نفسِ لوامہ ماں بنا کے دیتی ہے' بڑی ذمہ داری ہوتی ہے جس قسم کی جی چاہے وہ ماں بنائے۔ اسی لئے تو اس نے کہا ہے کہ

درخطِ سیمائے او تقدیرِ تست

ماں کی پیشانی کے شکن میں قوم کی تقدیر ہوتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ خوبصورت لفظ ہیں۔

سیرتِ اقوام را صورت گر است' ماں

قوموں کے کریکٹر کو متشکل کرنے والی' صورت دینے والی جو ہے ماں ہوتی ہے۔ ماں ہے ضمیر کی خالق' ماں ہے قوم کی سیرت کی صورت گر' ماں کی پیشانی کے خط میں مستقبل کی تقدیریں وابستہ ہوتی ہیں' اُم امت کی تشکیل کرتی ہے۔

نوخیز بچے کے کان میں باہر کی دنیا سے پہلی آواز اللہ اکبر' اشہدان محمد رسول اللہ' دراصل ضمیر کی ہی تشکیل ہے

عزیزانِ من! کوئی چھوٹی بات نہیں تھی کہ پیدائش کے بعد پہلا لفظ جو بچے کے کان میں باہر کی دنیا میں پڑے وہ پڑے اللہ اکبر اشہدان محمدً ارسول اللہ' کوئی چھوٹی بات نہیں ہے یہ تو اس ضمیر کی تشکیل کا بیج تھا وہ پہلی اینٹ تھی جو رکھ دی گئی۔ یہ کوئی چھوٹی باتیں نہیں

تھیں کہ سلانے کے لئے اللہ ھو اللہ ھو ''اللہ کا کے دا'' کوئی چھوٹی باتیں نہیں تھیں۔آج داستانِ پارینہ ہوگئیں۔اب بچے کو ماں کی آغوش ہی نصیب نہیں ہوتی' اس نے اس کے ضمیر کو بنانا کیا ہے۔

مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں انسان اپنے کیے گئے عمل پر پردہ پوشی کے لیے سوسائٹی کے قانون کا سہارا اختیار کرتا ہے

یہ نفسِ لوامہ ہے یہ اندر کا احساس' یہی چیز ہے' یہی جو میں نے (75:2) میں یہ بات کہی ہے اسی میں قرآن آگے لئے چلا جا رہا ہے وہ مکافاتِ عمل کی تشریح جسے قیامت کہا جاتا ہے' لئے چلا جا رہا ہے' لئے چلا جا رہا ہے اور اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ وہاں کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں ہوتی۔قانونِ مکافاتِ عمل کے نتائج کے اعتبار میں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (75:14) اور اگلی آیت ہے وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (75:15) آج تو اس کی صورت یہ ہے کہ غلط کام کرتا ہے تو اس کے لئے ہزار EXCUSES اور بہانے تراش لیتا ہے۔سب سے بڑی معذرت اس کے پاس سوسائٹی کا قانون ہوتی ہے۔قانون جس چیز کو جائز قرار دیتا ہے اس کے بعد اس کو کسی اور مزید معذرت پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے اور پھر ایک فرد ہزاروں بہانے تراش لیتا ہے کہ ہاں صاحب! اس کی یہ ضرورت تھی اور یہ ایسا ہو جاتا اور پھر یہ تو آج عام ہے' ساری دنیا یہ کچھ کرتی ہے۔لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ اگر یہ چیز وہ بنیادی طور پہ جس چیز کو مطلق شر اور مطلق خیر کہہ دیا تھا اگر وہ سامنے ہے تو پھر اس قسم کی بہانہ سازی' معذرت' EXCUSES جو ہیں کسی کام میں نہیں آ سکتیں پھر غلط غلط ہی ہے خواہ تمہاری عقلِ خود بیں اسے کتنا ہی جائز کیوں نہ قرار دیدے۔

قوتِ ارادہ کے ہوتے ہوئے نفس امارہ ہو' یا نفسِ لوامہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو اسے ہمیشہ برائی کی طرف لے جائے

بات نفسِ لوامہ کی ہو رہی تھی۔پہلی چیز نفسِ امارہ میں نے کہی تھی' وہ تصور غلط ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ اسے برائی کی طرف لے جاتی ہے' یہ عیسائیت کا تصور ہے۔قرآن نے جو نفسِ لوامہ کہا ہے اس میں بھی یہ بات غلط ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی قوت ہے جو ABSOLUTE GOOD & ABSOLUTE EVIL میں تمیز کر لیتی ہے۔جس چیز کو تربیت' تعلیم' عام معاشرے کی فضا میں غلط کہا جائے گا' ہر فرد کے اندر ضمیر اس کو غلط کہے گی' جسے وہ صحیح کہہ دے گا اس کی ضمیر اسے صحیح کہے گی۔اندر یہ قوت تو ہے جیسے قوتِ ارادی ہے اس شخص کی کہ وہ لے جاتی بھی ہے' باز بھی رکھ سکتی ہے اسی طرح سے یہ چیز ہے کہ جسے برا کہا جاتا ہے اسے برا وہ کہہ دیتی ہے۔یہ ہے وہ نفسِ لوامہ۔

بات ساری انسان کی اپنی تربیت کی ہے جیسی تربیت ویسا اس کا عمل

عزیزانِ من! یہ اتنی سی چیز ہے کوئی مستقل شے خیر اور شر کی تمیز کرنے والی نہیں ہے لیکن اس سے آگے ایک چیز ہے۔ یہ کشمکش تو اس کے اندر رہے گی اگر وہ صحیح معنوں میں تربیت ہوئی ہے' خیر اور شر کا امتیاز بتایا گیا ہے' حدود کھینچی ہوئی ہیں' ان کا علم بھی ہے۔ اب حیوانی زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ جھپٹ لے اس کو' ان حدود کا تقاضا یہ ہے کہ نہیں! یہ چیز شر ہے' برائی ہے' سوء ہے' ممانعت ہے۔ یہ نہیں کرنی' یہ کشمکش بھی رہتی ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر اس کشمکش میں تم ایسا کرلو کہ یہ حدودِ خداوندی ہر وقت تمہاری نگاہوں کے سامنے رہیں اوجھل نہ ہونے پائیں اور تم اپنے آپ کو ہمیشہ اس پہ آمادہ رکھو کہ اس سے تجاوز نہیں کرنا' حدود شکنی نہیں کرنی اگر تم زندگی میں یہ پختگی حاصل کرلو اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) جو ان حدود کو صحیح تسلیم کرلیں اور پھر ان کے اوپر جم کے کھڑے ہو جائیں تو اس کے بعد اس نے کہا ہے تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ان کے اوپر فرشتے نازل ہوتے ہیں' کیا کرتے ہیں؟ وہ اسے ایک اطمینان دلاتے ہیں' ایک خوشخبری دلاتے ہیں۔ قرآن نے یہ کہا تھا۔

اطمینانِ قلب سے ہمکنار ہونے کا غیر متبدل اصول اقدارِ خداوندی کو پیش نظر رکھنے میں ہے اور اسی کا نام تو ذکر ہے

قرآنِ حکیم نے یہ کہا کہ یہ کشمکش جو اس قسم کی ہوتی رہتی ہے اس میں اگر یعنی یاد رکھئے! کشمکش کو مار دینے والی بات جو ہے وہ نہیں کہ نفس کو مار دینا' وہ کہتا یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ؕ (13:28) یہ اطمینان کا لفظ یاد رکھئے جو آ رہا ہے سامنے' یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ تمہارے سامنے ہر وقت خدا کا قانون رہے' اسے ذکر اللہ کہتے ہیں۔ آج کل تو دیکھتے ہیں کتنا ذکر ہوتا ہے ''نہ آپ سوندے نیں نہ لوکاں نوں سون دیندے نیں'' ذکر اللہ ہو رہا ہے ظاہری اور خفی اور ضربوں والا اور کیا کیا' ذکر اللہ ہو رہا ہے۔ ہر وقت سامنے رہے خدا کا ذکر' اس سے ہوتا کیا ہے؟ اطمینان کے معنی ہیں کہ یہ جو کشمکش ہر وقت تمہیں رہتی تھی کہ ہر قدم میں فیصلہ کرنا' کروں نہ کروں' کروں نہ کروں۔ کہا کہ یہ تو اضطراب کی زندگی ہے' کشمکش کی زندگی ہے۔ اس کشمکش سے سکون حاصل ہو جانا اسے عربی زبان میں اطمینان کہتے ہیں۔ وہ جو شے شروع سے ہی جامد ہے جس میں حرکت نہیں ہے اس کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں کرتے تھے' کسی متحرک شے کا ساکن ہو جانا' اس کے لئے لفظ اطمینان استعمال کرتے تھے۔ ہو تو وہ متحرک لیکن آپ اس کو ذکرِ خدا سے قانونِ خداوندی کو سامنے رکھ کے' اپنے اوپر کیفیت یہ طاری کرلیں کہ کشمکش آپ کے اندر پیدا نہ ہو' یہ وہ چیز ہے جسے اطمینانِ قلب کہتے ہیں۔

تصوف کی دنیا میں اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لیے تصورِ شیخ کو ہر آن سامنے رکھنا ہوتا ہے

عزیزانِ من! اطمینانِ قلب بھی ہر ذہنی کیفیت کا نام نہیں ہے۔ایک ہندو کو بت کے سامنے پرستش کرنے سے ایسا اطمینان ہوتا ہے کہ ان دیکھے خدا کے سامنے جھکنے سے تو بڑی دیر میں جا کے یہ بات پیدا ہوگی' اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے خدا کو محسوس شکل میں رکھا اس لئے ہے کہ اس سے بڑی آسانی رہتی ہے۔یہی چیز ہے جو ہمارے ہاں تصوف میں بچپن میں سکھائی گئی۔ایسے پختگی حاصل نہیں ہوگی' تصورِ شیخ سے پختگی حاصل ہوتی ہے اس کے لئے مراقبے ہوتے ہیں کہ تصور کے اندر ہر وقت وہ آپ کا جو پیر ہے وہ رہے۔اور پھر وہ آگے جب پختگی ہوتی ہے تو یہ فنافی الشیخ ہوتا ہے پھر وہ کہتے ہیں' فنافی الرسول ہوتا ہے پھر آگے فنافی اللہ ہے۔یہ باتیں جب تک محسوس شے نہ ہو آپ تصور میں اس کو لا نہیں سکتے۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ صرف اطمینان جسے کہتے ہیں' فریب کا نام بھی تو اطمینان ہے' مذہب میں اطمینان فریب سے ہوتا ہے آپ کچھ کر کے خود ہی اپنے اندر یہ کہہ لیتے ہیں کہ ہاں صاحب! ہم نے فلاں اچھا کام کر لیا۔یہ تو ہندو کو بھی حاصل ہوتا ہے۔کرسچن کو حاصل ہوتا ہے۔ہر مذہب پرست کو حاصل ہوتا ہے جس طریق سے اپنی وہ بھگتی پوجا پرستش کرتا ہے' اسے حاصل ہوتا ہے۔ایک ٹھگ کے بچے کو حاصل ہوتا ہے جس دن وہ پہلے دن کسی کو مار دیتا تھا کہ پُن کا کام کیا ہے اس نے دیوی کو راضی کرنے کا کام کیا ہے۔تو کیا ہر اطمینان کو اطمینان ہی آپ کہیں گے؟

ایک مومن کی زندگی کے خدوخال کو سامنے لانے کے لیے قرآن حکیم حضرت یوسف کی مثال پیش کرتا ہے

قرآن نے بذکر اللہ کہا ہے صرف اس سے اطمینان حاصل ہوسکتا ہے۔قرآن نے یہ کہا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ اگر گھومتے پھرتے کبھی اس قسم کا کوئی خیال آ جائے حدود شکنی کا برائی کا جسے آپ کہتے ہیں' گھومتے پھرتے بھی یہ خیال اس کے سامنے آ جائے فوراً خدا کا قانون اس کے سامنے آتا ہے تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۚ (7:201) اس کے سامنے ایک روشنی ہو جاتی ہے وہ دیکھ لیتا ہے۔عزیزانِ من! یہ ابھی جو اسی سورۃ یوسف میں ہم نے یہ کہا وہی منظر کہ کمرے کے اندر عزیز مصر کی بیوی نے اپنی رعنائیوں دل ربائیوں کے ساتھ اس کو آمادہ کرنا چاہا اس نے کہا ہے کہ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۭ (12:24) وہ بالکل اس کے اوپر آمادہ ہوگئی کہ حدود شکنی کرے اور آگے ہے وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ (12:24) یوسفؑ بھی اگر خدا کے قانون کو سامنے نہ لے آتا تو وہ بھی یہ کچھ کر گذرتا۔عزیزانِ من! اسے ذکر اللہ کہتے ہیں۔

انسانی زندگی کو Balanced کرنے کے لیے اپنی ہر خواہش کو خدا کے قانون کے سامنے پیش کرنا ہوگا

یہ جو چیز ہے جہاں یہ کیفیت حاصل ہو جائے آج کی سائیکولوجی میں BALANCED PERSONALITY ایک چیز

کہی ہے' کچھ بہتر اصطلاح ہے اگر چہ وہ مطمئنہ تک نہیں ابھی وہ چیز آ رہی' BALANCED تو ہے ابھی' اس میں بھی ڈگمگاہٹ نہیں ہوتی' شخصیت متوازن ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ کشمکش چھوٹ جائے۔ نفس کے مارنے سے نہیں' خواہشات کے ترک کرنے سے نہیں' میں نے کہا ہے کہ وہ تو ہو ہی نہیں سکتا' ہر پیدا ہونے والی خواہش کے بعد یہ چیز کہ خدا کے قانون کے مطابق مجھے اس خواہش کو کس طرح سے پورا کرنا ہے اور اس کے بعد اس کے مطابق عمل یہ ہے جس سے اس کشمکش سے انسان نجات پا لیتا ہے اور یہ ہے وہ نفس جس کے متعلق کہا سورۃ الفجر میں' کیا بات ہے آیت ایک سامنے آتی ہے اور جی چاہتا ہے پیچھے سے چلتا چلا جاؤں چلتا جاؤں' وہاں یہ ہے کہ وہ کہ جس نے اسی زندگی کو زندگی سمجھا ہوا تھا' اُس زندگی کو زندگی نہیں سمجھا تھا' کیا خوبصورت الفاظ ہیں!

Balanced Personality کی نعمت سے لطف اندوز ہونے والی زندگی ہی قابل رشک مطمئنہ زندگی ہوگی

وہ ان زندوں کو دیکھ کے یہ کہے گا کہ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ ۚ(89:24) زندہ ہے وہاں' کہتا ہے اے کاش! میں نے بھی اپنی زندگی کے لئے کچھ پہلے بھیج دیا ہوتا۔ یہ تو اس کا ہے جس نے کچھ نہیں بھیجا تھا دوسری طرف یہ ہے کہ یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُo ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (89:27-28) آواز ہوگی کہ اے نفسِ مطمئنہ آ' بڑھ اپنے خدا کی طرف' بلا رہا ہے تجھے' ہم آہنگی تم نے کر لی تھی اس کے قوانین سے' اس کے قوانین نے تمہاری ذات سے ہم آہنگی کر لی تھی۔ یہ جو ہے راضی برضا جسے آپ کہتے ہیں۔ یہ جبر کا عقیدہ نہیں ہے' یہ ہم آہنگ ہو جانا ہے خدا کے احکام کے ساتھ۔ آ جا تیرا خدا تجھے بلا رہا ہے' نفسِ مطمئنہ سے کہا جا رہا ہے۔ تو گویا یہ جو رضا مندی ہے CONSENT سے خدا کے احکام کی اطاعت کرنا اور اس سے سرکشی نہ برتنا یہ ہے جس سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اے نفسِ مطمئنہ! آ جا۔ ٹھیک ہے مذہب کے اندر تو یہ اطمینان جیسا میں نے عرض کیا ہے ہر فرد اپنے طور پہ حاصل کر سکتا ہے' ایشور کی بھگتی سے' پرستش سے' WORSHIP سے' اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا اور آج مذہب کی دنیا میں بھی اپنے مصلے پہ' اپنی تسبیح کے ساتھ اکیلا' مذہب میں یہ شے ہی انفرادی ہوتی ہے۔

مطمئنہ زندگی کا حصول اجتماعی معاشرے کا متقاضی ہوتا ہے

دین میں یہ جو نفسِ مطمئنہ ہے یہ جو اطمینان کی چیز جو قرآن قرار دے رہا ہے' یہ انفرادی نہیں ہے۔ یہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہونے والی بات ہے۔ جنگل میں ایک شخص گیا ہوا ہے' وہ تو نہ نیک ہوتا ہے نہ بد ہوتا ہے۔ برائی کرے گا کس سے' نیکی ہوگی کس کے ساتھ' کشمکش ہی وہاں کوئی نہیں ہے' معاملہ کسی سے نہیں پڑتا' معاشرہ کوئی نہیں ہے۔ یہ تو کسی دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ

پڑتا ہے تو وہاں برائی اور اچھائی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ جو مذہب کی دنیا میں اطمینان بزعمِ خویش حاصل کر لیا جاتا ہے پُن کے کام کرنے سے' بھگتی اور ایشور کے کام کرنے سے' گیان دھیان سے یہ انفرادی طور پر اطمینان حاصل کر لینے والی بات ہو جاتی ہے' یہ نہیں۔

نفسِ مطمئنہ کی زندگی اجتماعیت کے ماحول سے لطف اندوز ہوگی

عزیزانِ من! سنئے بڑی اہم چیز ہے جو قرآن کہتا ہے اے نفسِ مطمئنہ! آ جا' بلایا تو جاتا ہے ایک فرد کو ہی اس لئے ماحصل تو فرد ہے لیکن یہ فرد کو اطمینان کیسے حاصل ہو سکتا ہے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۙ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۙ (89:29-30) میرے بندوں کے گروہ میں شامل ہو اور یوں جنت میں آ جاؤ سارے۔ یہاں اکیلا اکیلا جنت میں نہیں جا سکتا۔ جنگل میں رہنے والا' حیوان کی سطح کے اوپر تو رہ سکتا ہے جنت میں جانے کا سوال جب تک اس کے بندوں میں شامل نہیں ہو جاتا۔ یہ ہے جسے ہم کہیں گے کہ نظام ایسا ہونا چاہئے' معاشرہ ایسا ہونا چاہئے۔ عبادی تم میں سے ہر فرد جو ہے خدا کی محکومیت اختیار کئے ہوئے ہو اور یہ تو اجتماعی زندگی کے اندر ہی ہو سکتا ہے انفرادی زندگی میں یہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔

نفسِ مطمئنہ کا دوسرا نام ہی تختِ جنت ہے

نفسِ مطمئنہ کے لئے پہلی چیز شرط ہے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۙ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۙ (89:29-30) اور یوں جنت میں آ جا۔ نفسِ مطمئنہ ہی کا تو نام جنت ہے لیکن یہ انفرادی طور پہ حاصل نہیں ہوتی۔ خدا کے بندوں میں' وہی عبد کی جمع عبادی' بات وہی عبدیت کی ہے۔ اسی سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے جسے قرآنِ کریم نے نفسِ مطمئنہ کہا ہے۔ بات آج نفسِ امارہ سے شروع ہوئی تھی میں نے ضروری سمجھا تھا کہ ہمارے ہاں یہ جو تین چیزیں مشہور چلی آ رہی ہیں نفسِ امارہ' نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ قرآن کریم کی روشنی میں اس کی وضاحت ہو جائے کہ یہ تصورات کیا ہیں قرآن سے ان کا مفہوم کیا ہے۔ درس میں تو ہم اگلی آیت تک بھی نہیں پہنچے یعنی اس آیت تک بھی نہیں جہاں سے آج درس شروع ہونا تھا یہ پچھلی آیت میں لفظ آیا تھا۔ درس کا وقت ختم ہو گیا۔ خدا کرے کہ میں ان تین اصطلاحات کا مفہوم قرآن کی روشنی میں سمجھا سکا ہوں۔ عزیزانِ من! یہ بڑی بنیادی چیز تھی۔ وقت آج ہو گیا اگلا درس پھر سورۃ یوسف کی 54 آیت سے ہی شروع ہوگا جہاں سے آج شروع ہونا تھا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

چھٹا باب: **سورۃ یوسف** (آیات 54 تا 65)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1974ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یوسف کی آیت 54 سے ہو رہا ہے (12:54)۔

تجدید یادداشت

پچھلے درس میں وہ جو ہمارے ہاں اصطلاحات ہیں: نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ، نفسِ مطمئنہ جو پورا درس انہی اصطلاحات کی تشریح اور تبویب میں گذر گیا تھا ہم آگے نہیں بڑھے تھے۔ آج اسی سلسلۂ زریں کی اگلی کڑی ہمارے سامنے آتی ہے۔ تجدیدِ یاداشت کے لئے عرض کر دوں کہ بات یہ ہوئی تھی حضرتِ یوسفؑ قید میں تھے وہاں بادشاہ کے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لئے ان کا وہ قید کا ساتھی گیا تھا

جسے انہوں نے قید خانے میں ہی وعظ کہا تھا' پند و نصیحت کی تھی۔ اگلی بات پھر جو اس میں اہم تھی کہ اسے سن کے جب بادشاہ نے کہا کہ اتنے بڑے جوہروں کا ایک شخص قید میں پڑا ہے' جاؤ اور اسے لے آؤ' میں اسے معزز اور مقرب بناؤں گا۔ تو وہاں سیرتِ یوسفؑ اپنی بلندیوں پہ آئی اور آپؑ نے یہ کہا کہ میں بادشاہ کے رحم و کرم سے قید سے باہر نہیں آنا چاہتا اس سے کہو کہ میرے مقدمے کی از سرِ نو تفتیش کرائے اور اگر میں بے گناہ ثابت ہوں تو پھر میں قید خانے سے باہر آؤں گا۔ تحقیق کرائی گئی حضرتِ یوسفؑ بے گناہ ثابت ہوئے۔ ایسے ثابت ہوئے کہ وہ جو پورا عورتوں کا جمگھٹا یا وہ محفل تھی انہوں نے بھی اس کا اقرار کیا کہ وہ ساری ہماری سازش تھی اور یہ تو بہت ہی معزز' مکرم انسان ہے' اس کی جوانی بے داغ ہے۔ خود عزیز مصر کی بیوی نے بھی اس کا اقرار کیا کہ میں ہی اپنے آپ کو ملامت کرتی ہوں۔ اور یہ جو قول تھا اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (12:53) یہ اسی کا قول تھا کہ انسان کی یہ بے باک خواہشات تو اسے برائیوں کی طرف اکساتی رہتی ہیں میرے ساتھ بھی یہی ہوا' یہ بے گناہ ہے۔

حضرت یوسفؑ کے کردار کی بلندی اور ذہانت نے انہیں تخت نشین بنا دیا

اس طرح سے جب ان کی بے گناہی ثابت ہوگئی تو پھر اب آگے بات چلتی ہے۔ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْٓ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ط (12:54) کہا کہ اب لاؤ اسے بلا کے کہو کہ اب تو تمہاری شرط بھی پوری ہوگئی۔ اس نے کہا کہ میں اسے مخصوص کرلوں گا' خصوصیت سے اپنے لئے مخصوص کرلوں گا۔ اب یہ دو چیزیں ہمارے سامنے یہاں آتی ہیں ایک تو وہ حضرتِ یوسفؑ کی پہلے جو ذہنی' علمی صلاحیتیں تھیں وہ اس کے سامنے آئیں اور اس کے بعد ان کے کردار کی یہ بلندی اس کے سامنے آئی تھی تو دونوں چیزیں جمع ہوگئیں تو اس نے کہا کہ اس سے بہتر اور کونسا مقرب اور معزز ہوسکتا ہے کہ جس کی زیرکی اور فطانت' خردمندی اور دانش مندی کی یہ کیفیت کہ جن خوابوں کے متعلق میرے یہ نورتن عاجز آ گئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ یونہی بکواس ہے' اس نے نہایت صاف صاف انداز میں ان کے مطالب مجھے بتائے اور دوسرے یہ کہ جس کے کردار کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ وہ جیل خانے میں بے گناہ پڑا سڑ رہا ہے بادشاہ اس کو بلا رہا ہے' کہہ رہا ہے میں تمہیں مقرب بناؤں گا اور وہ یہ کہتا ہے کہ نہیں! میں ترحمِ خسروانہ کی بنا پہ باہر نہیں آنا چاہتا' عدالت مجھے اگر بے گناہ ثابت کرے گی تو پھر قید خانے سے نکلوں گا۔ عزیزانِ من! غور کیجئے کہ اگر کہیں پوری مملکت میں ایک انسان بھی ان خوبیوں والا' ان بلندیوں پر' ان معیاروں کے اوپر پورا پہنچنے والا نکل آئے اس کے تو سپرد پوری مملکت کر دینی چاہئے۔ اور اس نے فرعون نے بھی یہی کیا تھا۔ نظر آتا ہے کہ وہ بھی بڑا ہی جوہر شناس تھا اس نے یہ کہا ہے۔

حضرت یوسفؑ کے لیے بادشاہ کی طرف سے ایک اعلان عظیم

اَسۡتَخۡلِصۡهُ لِنَفۡسِیۡ ۚ(12:54) اور یہ ہے وہ بلندترین حقیقت جو قرآن سامنے لانا چاہتا ہے کہ انسان میں ایک تو ذہنی صلاحیتیں اتنی بلند ہونی چاہئیں اور ساتھ اس کے کردار اتنا پاکیزہ ہونا چاہئے۔ دو چیزیں یہ جمع ہو جائیں تو پھر اس جوہر کی قدر ہوتی ہے۔ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الۡيَوۡمَ لَدَيۡنَا مَكِيۡنٌ اَمِيۡنٌ(12:54) کیا بات ہے صاحب! آج کے دن سے تم ہمارے مقرب ہو لَدَيۡنَا(12:54) ''تم ہمارے ہو'' جیسے کہا جاتا ہے۔ 'ل' تو یہاں اس کے لئے آیا ہے یہ لدینا بہت عجیب چیز ہے۔ آج کے دن سے تم ہمارے ہو۔ اور اس کے بعد ہے مَكِيۡنٌ اَمِيۡنٌ (12:54) تمکن تمہیں حاصل ہوگا۔ تمکن اختیارات کو کہتے ہیں' اقتدارات کو کہتے ہیں یہ چیز بھی حاصل ہوگی اور اس کے ساتھ ہی تم بے حد TRUST WORTHY ہو مجھے تم پر اعتماد بھی پورا پورا ہے اختیارات بھی دے رہا ہوں' اعتماد کے ساتھ اختیارات دے رہا ہوں۔ تمہیں اختیارات دینے کے بعد میں خود امن میں آ گیا ہوں یوں اس کے معنی آئیں گے۔ اور بڑی چیز ہے اس قسم کا اگر کوئی بھی ذی اقتدار کسی کو مل جائے تو واقعی وہ اقتدار سونپنے والا بھی امن میں آ جاتا ہے۔ امانت کے تو معنی یہ ہیں کہ کسی کے سپرد کوئی شے کر کے خود امن میں آدمی چلا جائے۔ تمکن تمہیں میں نے دیا ہے اور اس سے میں مطمئن ہو گیا امن میں آ گیا' ملک بھی امن میں آ گیا۔ کتنی بڑی چیز ہے جس کی میں نے تلاش کی جس کا میں نے انتخاب کیا ہے۔ حضرتِ یوسفؑ آ گئے' بے گناہ ثابت ہو گئے تھے بادشاہ نے ان چیزوں کو پہچان بھی لیا تھا انہوںؑ نے OFFER کو ACCEPT کر لیا جسے کہتے ہیں پیشکش کو قبول کر لیا۔

حضرت یوسفؑ نے زمین کے خزانے کا شعبہ اپنے ہاتھ میں لے لیا

قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِيۡظٌ عَلِيۡمٌ (12:55) عزیزانِ من! داستان ہی نہیں ہے ایک ایک لفظ غور طلب ہے۔ یہاں حضرتِ یوسفؑ نے کہا ہے کہ ٹھیک ہے اب سوال یہ ہے آج کی اصطلاح میں وہ PORT-FOLIO کونسا میرے پاس ہونا چاہئے کونسا کام ہے اتنا بڑا جسے میں سمجھتا ہوں کہ میں کر سکتا ہوں خود ہی اس کے لئے کہا۔ اب یہاں خزائن الارض آیا ہے قرآنِ کریم میں یہ الارض' مملکت یا COUNTRY یا ملک کے لئے بھی یہ پورا لفظ آتا ہے اور صرف LAND جسے آپ زمین کہتے ہیں اس کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ معنی اس کے دونوں ہو سکتے ہیں مملکت کے خزائن جو ہیں مملکت کے FINANCES جو ہیں وہ میرے سپرد کر دو' یہ چیز بھی ہو سکتی ہے جسے آج کی اصطلاح میں FINANCE MINISTER آپ کہتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین کا جتنا کاروبار ہے اس کے خزائن زمین پہ جو ہیں وہ میرے سپرد کر دو یہ معنی زیادہ ترجیح دئے جانے کے قابل ہیں اس لئے کہ وہاں قحط پڑ رہا تھا خشک سالی تھی یہی پرابلم تھی وہ جس کے لئے تلاش ہوئی تھی کسی ایسے شخص کی کہ جو اس مسئلے کو حل کر دے۔ تو میں سمجھتا ہوں

کہ یہ معنی زیادہ مرصع ہیں کہ زمین کے خزانے میرے حوالے کردو۔ وہ دبے ہوئے ہیں تم لوگوں کو علم نہیں کہ اسے کیسے نکالا جائے اور اگر علم ہوتا ہے تو پھر اگلی بات یہ ہے کہ ان کی حفاظت کیسے کی جائے۔ اور میں اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ (12:55) میں یہ جانتا ہوں کہ زمین کے دبے ہوئے خزانے کس طرح نکالنے چاہئیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ پھر ان کو محفوظ کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ دو چیزیں نہایت ضروری ہیں کہ یہ TECHNICAL KNOWLEDGE جسے آج ہم کہتے ہیں یہ بھی معلوم ہو کہ زمین کے دبے ہوئے خزانے باہر کیسے آتے ہیں اور پھر اگلی چیز یہ ہے کہ جو باہر لایا جائے اس کا وہ محافظ اور پاسباں ہونے کے قابل بھی ہونا چاہئے اور پھر یہ بھی کہ ان کو محفوظ کیسے رکھا جاسکتا ہے کہ آئندہ کے لئے بھی وہ کام آئیں دیر تک وہ چلیں یہ ساری چیزیں اس کے اندر آجائیں گی۔

حضرت یوسفؑ کا فرعون کی حکومت میں شامل ہونے پر اٹھایا جانے والا ایک سوال اور اس کا جواب

دو باتیں یہاں قابلِ غور ہیں۔ سطح بیں نگاہیں یہ کہا کرتی ہیں کہ صاحب! ایک نبی اور وہ فرعون تو بہرحال اس زمانے کے بت پرست تھے توحید پرست نہیں تھے اس قسم کے بادشاہ کی ملازمت اختیار کرلینا یہ کہاں جائز ہوسکتا ہے' یہ بڑی سطحی سی بات ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اگلی ہی آیت میں یہ کہا ہے کہ وَ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنۡهَا حَیۡثُ یَشَآءُ (12:56) ہم نے اس طرح سے اس ملک کا اقتدار یوسفؑ کے سپرد کردیا اور اقتدار کی کیفیت یہ تھی کہ ساری مملکت میں اس کا حکم چلتا تھا۔ تو ملازمت کے یہ معنی نہیں تھے جو آج ہم یوں لیتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے' قرآن نے اس کی تشریح تو نہیں کی نہ وہ ان تفصیلات میں جاتا ہے کہ یہ کیسے تھا لیکن بہرحال ٹھیک ہے بادشاہت تو اس کی تھی لیکن اس کی بادشاہت میں مقام یہ تھا جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ تمکن فی الارض اس کو ملا اور اس قسم کا تمکن وہ تھا کہ پوری مملکت میں اختیار یوسفؑ کا چلتا تھا۔ اور یہی چیز ہے جو ذرا آگے چل کے حضرتِ یوسفؑ نے جب شکریہ ادا کیا ہے بارگاہِ خداوندی میں' سجدۂ شکرانہ ادا کیا ہے تو وہاں کہا تھا رَبِّ قَدۡ اٰتَیۡتَنِیۡ مِنَ الۡمُلۡکِ (12:101) یہاں تو پورا الملک کہا ہے' بارگاہِ خداوندی میں میرا سرِ نیاز تشکر سے یہ جھکتا ہے کہ گھر سے اس طرح سے نکلا' بھائیوں نے یہ کچھ کیا' کنویں میں ڈالا گیا' مصر کے بازار میں نیلام ہوا' ایک غلام کی حیثیت سے ایک گھر کے اندر رکھا گیا' اس کے بعد اس قسم کے الزامات لگے' قید کاٹی اور اس کے بعد پھر کیفیت یہ کہ اس نے الملک مجھے عطا کردیا۔ اختیارات تو کہئے تو یہ پوری کی پوری مملکت کہئے۔ الملک جو ہے۔ اس کے ساتھ ہے بڑا COMPREHENSIVE اور جامع یہ چیز ہے کہ اتنا بڑا اقتدار اور اختیار اس نے مجھے عطا کردیا اس کی کتنی بڑی رحمت ہے۔ اور میں کہتا ہوں اگر یہ چیز نہ بھی ہو ذرا اس کو HUMANITY کے POINT OF VIEW سے دیکھئے انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھئے پورے ملک کے اندر قحط پڑ رہا ہو لوگ بھوک سے مر رہے ہوں اور اس کا کوئی حل وہاں دریافت نہ ہو رہا ہو ایک شخص

جانتا ہو کہ اس کا حل کیا ہے اس مصیبت سے میں کس طرح سے اتنے انسانوں کو نجات دلا سکتا ہوں۔ پوری مملکت کے باشندے بھوک سے مر رہے ہیں اور ایک شخص اس TECHNOLOGY کو جانتا ہے کہ میں کس طرح سے اس کو حل کر سکتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مقام' یہ اختیار' یہ اقتدار' یہ مملکت نہ بھی ملے وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ (5:2) کے لئے اس کا فریضہ ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کو پیش کرے کہ میں اس مسئلے کو حل کر دوں گا۔ کسی کی مملکت ہو سوال ہی نہیں وہاں اس سوال کا۔ انسان اتنے تباہ ہو رہے ہیں لاکھوں کی تعداد میں بھوک سے مر رہے ہیں ایک شخص کو یہ ٹیکنالوجی پتہ ہے کہ اس کا انتظام کیسے کیا جا سکتا ہے اور اعتماد ہے اتنا بڑا جسے وہ کہہ رہا ہے ایسے وقت میں تو اسے خود پیش کر دینا چاہئے کوئی شرط ہی نہیں ہونی چاہئے' سوال ہی نہیں ہے کہ مجھے کیا بنایا جائے گا مجھے کیا اختیارات دئے جائیں گے' میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ وہ قرآن تو کہتا ہے کہ جس نے کسی ایک شخص کی جان بچا دی یوں سمجھو گویا اس نے انسانیت کی جان بچا دی۔ وہ تو ایک شخص کی جان بچانے کے لئے ایک جان کو اتنی اہمیت دیتا ہے اور جہاں لاکھوں انسان مر رہے ہوں اور ایک شخص کو یہ معلوم ہو کہ میں انہیں کیسے بچا سکتا ہوں ''اگر خاموش رہے'' ایسے میں تو اگر یہ شخص جو جانتا ہے کہ میں کر سکتا ہوں اپنے آپ کو پیش نہیں کر رہا تو یقیناً یہ جرم ہے' یہ مجرم ہو جائے گا۔ سوال ہی نہیں ہے کہ صاحب! اس نے ملازمت اختیار کر لی گئی جیسے کہا کریں۔ اور پھر کس شخص کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے؟ ابھی ابھی ایک ورق پیچھے ہم دیکھ چکے ہیں کہ جو قید خانے کی کوٹھڑی میں اپنے ساتھیوں کو یہ وعظ کہہ رہا ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ تو کیا خیال ہے آپ کا کہ جو یہ وعظ کرنے والا خدا کا نبی ہوگا وہ آ کر ایک بت پرست کے ساتھ اس کی بت پرستی میں شریک ہو جائے گا (معاذ اللہ)۔

قرآن حکیم تو ہمیشہ انسانیت کے حوالے سے بات کرتا ہے

یہ جو انسانیت کی خدمت' رفاہِ عامہ ہے یا انسانیت کی جان بچانا ان کے کسی دکھوں کا مداوا کرنا اس میں تو کافر اور مومن کی کوئی تمیز نہیں ہونی چاہئے۔ ڈاکٹر کے لئے یہ نہیں زیبا دیتا کہ وہ یہ کہے کہ یہ جو اس وقت جاں بلب مریض آیا ہے اور دیکھو اس کے سر پہ بودی ہے یا مسلمان ہے۔ انسانیت کی حیثیت سے اس کے سامنے آ رہا ہے' انسانیت کا تقاضا ہے کہ اگر اس کی جان بچا سکتے ہو' اسے کوئی آرام پہنچا سکتے ہو' یہ پہنچاؤ۔ قرآن نے یہ حکم دیا ہے کہ تعاون کرو بر و تقویٰ کے کاموں میں' کشاد کے کاموں کے اندر' ایسے کاموں کے اندر کہ جس میں انسانیت کی فلاح و بہبود مضمر ہو (5:2)۔ تعاون کا تو حکم ہے تو کیا تعاون میں یہ شرط ہوگی کہ نہیں صاحب! ہم تو اگر ایک مسلمان مرتا ہوا ہوگا تو اس کی جان بچائیں گے پانی خواہ ہمارے پاس ہو ہی' اس سے پہلے پوچھیں کہ بت پرست تو نہیں ہو۔ یہاں اس نے کہا کہ ایک جان بچائی اس نے وہاں کفر اور اسلام کا امتیاز نہیں کیا صرف جان کہا ہے جس نے کسی ایک جان کو تلف کر دیا اس نے گویا پوری

انسانیت کوتلف کر دیا اور جس نے کسی ایک جان کو بچالیا اس نے گویا پوری انسانیت کی جان بچالی (5:32)۔ یہاں تو جان کہا گیا ہے نفس کہا گیا ہے یہ تمیز نہیں ہے۔ اگر یہ چیز نہ بھی ہوتی جو قرآن نے اس کا جواب دے دیا کہ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ (12:56) اور پھر حضرتِ یوسفؑ نے الملک کہہ کر پکارا ہے (12:101)۔

انسانیت کے تصور سے ہٹ کر بات کرنا تو بہت بڑا جرم ہے

یہ نہ بھی ہوتا تو میں کہتا ہوں صرف وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى (5:2) کے خدائی حکم کی تعمیل میں اس تعاون کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دینا بھی ضروری تھا۔ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ (12:55) جو جانتا بھی ہے کہ کیسے خزائن باہر لائے جائیں گے' جانتا ہے کیسے ان کی حفاظت کی جائے گی' اس کی آنکھوں کے سامنے لاکھوں انسان بھوکے مر رہے ہیں میں کہتا ہوں اگر ایسے وقت میں وہ اپنے آپ کو پیچھے رکھتا ہے خود آفر کر کے آگے نہیں بڑھتا' بارگاہِ خداوندی کے اندر مجرم ہوگا۔ ایک نبی تو کبھی بھی ایسے وقت میں پیچھے نہیں رہتا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا قرآنِ کریم نے حضرتِ یوسفؑ کی داستان کو محدود رکھا ہے ان ہی واقعات کو' یہاں سے وہاں تک وہ جاتے ہیں لیکن دوسرے مقام پہ ایک ایسی آیت بھی ہمارے سامنے آتی ہے جہاں یہ نظر آتا ہے کہ وہ وہاں بحیثیت رسول کے رہے تھے وہ فریضۂ رسالت ادا کر رہے تھے۔ اور وہ تو نہ بھی آتی تو یہ باور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ خدا کا ایک رسول ہو اور وہ فریضۂ رسالت ادا نہ کرے۔ سورۃ المومن میں ہے حضرتِ موسٰیؑ کی داستان ہے۔

فرعون کے دربار میں ایک مردِ مومن کی وہ حق گوئی کہ جسے قرآن حکیم نے قیامت تک کے لیے اپنے ہاں محفوظ کر لیا

وہ آپ کو معلوم ہے شاہی محلات میں ان کی پرورش ہوئی تھی اور اس کے بعد پھر وہ واقعہ ہوا تھا ایک آدمی کے مرنے کا اور اس کے بعد یہ معاملہ پیش ہوا تھا کہ کیا کیا جائے اس شخص کے ساتھ۔ کیبنٹ میں یہ سوال پیش ہوا یوں نظر آتا ہے یا ان کی پارلیمان میں سوال پیش ہوا تھا۔ عزیزانِ من! سورۃ مومن میں عجیب چیز ہے۔ ان کے اندر سے ایک شخص جسے قرآن صرف مردِ مومن کہہ کر پکارتا ہے وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ اب اندازہ لگایئے کہ بہرحال دربارِ فرعون کا مردِ مومن ہے وہ اٹھ کے ایک تقریر کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کس قدر خوش نصیب تھا یہ شخص کہ اس کی پوری تقریر کو قرآن نے ہو بہو اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا' قیامت تک کے لئے محفوظ ہو گئی اس شخص کی تقریر قرآن کے اندر۔ یہ انسان بڑا ہی خوش بخت ہے۔ اور خوش بختی یونہی نہیں تھی قرآن تو یوں کسی کو دیتا ہی کچھ نہیں ہے بڑا بخیل ہے اس معاملے میں' یعنی وہ DESERVE اتنا کرتا تھا اس کی تقریر' اس کے خیالات جو اس نے دئے تھے۔ تو قرآن نے اس کی اہمیت کے

پیشِ نظر یہ ضروری سمجھا کہ اس کو محفوظ کر دیا جائے' پورا رکوع ہے اس کی تقریر کا اور بڑی ہی جاندار تقریر ہے۔ فرعون جیسا بادشاہ' اس کے درباری' مقرب' مصاحب جسے کہتے ہیں انہی کی وہ پارلیمان اس کے اندر اتنا بڑا ایشو پیش ہو رہا ہے کہ ایک شخص جو ہے وہ تو نظر آتا ہے کہ بغاوت پہ اُتر آئے گا سرکشی پہ اُتر آئے گا اس کا مسئلہ پیش ہو رہا ہے کہ اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔ نظر آتا ہے وہ ساری پارلیمان حضرتِ موسٰیؑ کے خلاف تھی اس میں یہ ایک شخص اٹھ کے کھڑا ہوتا ہے اور اس کی وہ تقریر دیکھئے اس جرآت اور بے باکی کے ساتھ انؑ کی وکالت کرتا ہے ان کی غیبت کے اندر اور انہیں بتاتا ہے کہ کس قدر تباہیاں آ جائیں گی تمہارے اوپر اگر تم اس قدر حق اور صداقت والے انسان کے خلاف ہاتھ اٹھاؤ گے۔ بڑی جاندار تقریر ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے چار سو سال پہلے حضرت یوسفؑ کی طرف سے تخت نشینی کے فرائض کی ادائیگی کا ذکر

وہ تو جب سورۃ آئے گی تو آپ دیکھئے گا میں نے کہا ہے کہ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن جیسا جس کا ایک ایک لفظ جو ہے وہ کھول کر بیان کرتا ہے پوری تقریر اس نے اپنے ہاں اس کو محفوظ کر لیا ہے۔ اس میں وہ ایک بات کہتا ہے اس قوم سے کہ تمہاری تو کیفیت یہ ہے' یہ سن لیجئے کہ کب کہہ رہا ہے؟ حضرتِ یوسفؑ تاریخ کے بیان کے اعتبار سے حضرتِ موسٰیؑ سے قریباً چار سو سال پہلے ہوئے ہیں تو گویا قریباً چار سو سال بعد کی یہ بات ہے جب وہ شخص وہ پارلیمان میں یا فرعون کے دربار میں تقریر کر رہا ہے۔ وہاں یہ کہہ رہا ہے کہ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ (40:34) تمہاری یہ کیفیت ہے کہ یوسفؑ جیسا عظیم رسول تمہارے پاس آیا واضح دلائل لے کر' تم اس قسم کی بدبخت قوم کو فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ (40:34) تم نے تو اس کے پیغام میں بھی ہمیشہ یہی کہا کہ شکوک ہیں شبہات ہیں۔ تمہاری تو کیفیت ہی یہ ہوتی ہے۔ یعنی وہ کہہ یہ رہا ہے کہ اگر اس قسم کے انسان کے خلاف تم ہو گئے ہو جس نے یہ پیش کیا ہے تو یہ تمہاری کوئی نئی بات نہیں ہے' تمہارا تو وطیرہ ہی یہ ہے۔ اور دیکھئے اس کی مثال میں وہ چار سو سال پہلے کے حضرتِ یوسفؑ کا ذکر کرتا ہے کہ تمہارے ہاں تو یوسفؑ جیسا رسول بھی آیا تھا اور تم نے اس کے پیغامات میں بھی شکوک و شبہات پیدا کرنے شروع کئے تھے اور پھر جب حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ (40:34) اور جب وہ فوت ہو گیا قُلْتُمْ (40:34) تو تم نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا (40:34) صاحب! اللہ کا شکر ہے اس کے بعد تو کوئی ایسا نہیں آئے گا جو قدم قدم پہ روکے کہ ہمیں چلنے ہی نہ دے۔ یعنی یہ نظر آتا ہے کہ وہ وہاں صرف وہ خزائن الارض کے FINANCE MINISTER بن کے نہیں رہے ہوئے تھے۔ یہاں وہ رسولاً خود کہتا ہے انہوں نے اپنا فریضۂ رسالت ادا کیا اور اس طرح ادا کیا وہ ٹھیک ہے جرائم تو اس معاشرے کے اندر عام ہو

رہے تھے فریضۂ رسالت کی صورت یہ تھی کہ یہ قدم قدم کے اوپر ان کو روکتے ہونگے۔ اور یہ جو انداز ہے قرآن کے کہنے کا کہ تمہاری تو حالت یہ ہے کہ ''یوسفؑ جیسا پیغمبر بھی تمہارے پاس آیا'' تو آپ دیکھئے چار سو سال میں اس نے اگر مثال کوئی دی ہے حضرتِ یوسفؑ کی دی ہے کہ ان کی رسالت اتنی زیادہ بلند پایہ تھی' چمکتی تابندہ و درخشندہ' چار سو سال کے بعد وہ اٹھ کے کھڑا ہو کے جو مثال دیتا ہے تو ان کی مثال دیتا ہے کہ تم نے تو یوسفؑ جیسے پیغمبر کے ساتھ بھی یہ کیا تھا اور کیفیت تمہاری یہ تھی ناشکروں کی کہ ان کی وفات کے بعد بجائے اس کے کہ تمہیں تاسف ہوتا کہ ایسا عظیم انسان ہم سے چلا گیا' تم نے کہا ہے کہ اچھا ہے صاحب! چلا گیا اب تو کوئی رسول نہیں آئے گا اب تو راوی عیش لکھتا ہے تمہاری تو یہ کیفیت ہے۔

رسول کو تو اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کا احساس تو بدرجہ اتم ہوتا ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ حضرتِ یوسفؑ صرف یہی فریضہ لے کے وہاں نہیں بیٹھ گئے تھے' فریضۂ رسالت ادا کر رہے تھے۔ اس شان سے انہوں نے ادا کیا کہ کم از کم چار سو سال بعد تک اس کی آواز یا آوازہ تھا' وہ فضا کے اندر گونج رہا تھا۔ اس کی شہادت تو خود قرآن دے رہا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں تھا کہ وہ جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! انہوں نے ایک بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ کیفیت ان کی یہ تھی۔ **مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ** (12:56) اختیارات کی یہ کیفیت کہ ساری مملکت میں حکم انہی کا چلتا تھا اور پھر رسالت کی یہ کیفیت کہ چار سو سال بعد تک بھی اس کا چرچا ہوتا تھا ان کے ہاں کہ ایسا رسول آیا تھا۔ رسول اپنے فریضۂ رسالت سے تو باز رہ ہی نہیں سکتا۔ سوال ہی نہیں ہے کہ سورج ہو اور روشنی نہ دے۔ یہ تو اس کی جیسے فطرت میں داخل آپ کہتے ہیں یہ چیز ہوتی ہے۔ وہ جو قید خانے کے اندر یہ فریضہ ادا کر رہا تھا جب اس کو مملکت کے اندر اقتدارات تھے تو پھر یہ فریضہ ہی ادا نہیں کرتا؟؟ اگلی بات یہ ہے **خزائن الارض** میں نے عرض کیا ہے کہ چونکہ وہاں قحط سالی تھی اس لئے اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے زمین کا بندوبست جو تھا یہ سنبھالا کہ اس کے دبے ہوئے خزانے کو باہر کیسے لایا جائے۔ قرآنِ کریم میں تو اس کی تشریح نہیں آئی لیکن تورات میں ایک چیز ملتی ہے جس سے یہ نظر آتا ہے کہ انہوں نے یہ انتظام کیسے کیا تھا۔

وحی کی روشنی میں حضرت یوسفؑ کے نزدیک قحط سالی کو ختم کرنے کا علاج زمین کو مملکت کے زیر انتظام لانا تھا

عزیزانِ من! غور کیجئے کہ کب کی یہ بات ہے اور آج بھی آپ دیکھئے کہ جہاں یہ زمین کی پیداوار کا مسئلہ بگڑتا ہے اس کا حل آج کیا سوچا جاتا ہے۔ آخری حل یہی سوچا گیا ہے کہ یہ زمین جو ہے یہ مختلف افراد کی ذاتی ملکیت میں نہیں ہونی چاہئے۔ ذاتی ملکیت میں'

علاوہ دوسری چیزوں کے ایک بڑا نقص یہ بھی ہوتا ہے کہ پورے خزانے اس کے باہر نہیں آتے۔

مملکتِ پاکستان میں ایک ایک زمیندار تو دس دس ہزار ایکڑ کا مالک بنا بیٹھا ہے

یہ جو آپ کے ہاں سسٹم چلا آتا تھا بڑے بڑے زمینداروں کے ہاں۔ ایک ایک زمیندار جناب دس دس ہزار ایکڑ زمین کا مالک چلا آ رہا ہے۔ اسے ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ محنت کرے وہ اس میں سے اتنا آ جائے کہ اس کے خاندان کی ضرورت ہی نہیں بلکہ عیاشیوں کے لئے کافی ہوا گر وہ کافی ہو گیا ہے تو اس کو ضرورت نہیں تھی کہ آنکھ اٹھا کے بھی دیکھے کہ زمین میں ہو کیا رہا ہے' کتنی پیداوار ہونی چاہئے' کتنی ہو رہی ہے' پوری محنت بھی ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی۔ اور اگر وہ مزارعے ہیں تو مزارعوں کو جو ہر وقت دھڑکا لگا رہے کہ پتہ نہیں اب کے ہے کھیت' اگلے سال ہو گا یا نہیں وہ بھی ''جنوں کیندے نیں دب کے واہ'' وہی میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا داب کا لفظ جو ہے یہ تو عربی کا لفظ ہے۔ یہی قید خانے میں وہ تعبیر بتاتے وقت حضرتِ یوسفؑ نے کہا تھا کہ یہ سات سال جبکہ یہ بارش ہوتی ہے تو اس زمانے میں تو تم زمین کو دب کے وہاؤ۔ کبھی بات ہو گی تو عرض کروں گا اس پنجابی زبان میں عربی زبان کے بڑے لفظ ہوتے ہیں۔ تو بات یہ تھی کہ زمین کے متعلق انہوں نے کیا انتظام کیا تھا۔

اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کی معاشی بدحالی کا علاج ایک واحد سٹیٹ پراپرٹی بنانے میں نہیں بلکہ اسے سٹیٹ کے انتظام میں لانے میں ہے

میں نے کہا ہے کہ آج ہم اپنے دور میں یہ معاشین کا بہت بڑا کارنامہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے یہ بات سوچی کہ زمین ذاتی ملکیت میں نہیں ہونی چاہئے' اس کا انتظام مملکت کے سپرد ہونا چاہئے۔ یقیناً حضرتِ یوسفؑ نے بھی یہ اس لئے نہیں کہ پرائیویٹ ذاتی ملکیت والوں سے اس کو چھین کے سٹیٹ پراپرٹی بنا دیا ہو کہ چھوٹے چھوٹے زمینداروں کو یوں توڑو پھر اس سے جو بڑے بڑے وڈیرے ہیں ان کو بھی بے دخل کرو اور ایک واحد مالک اس کا ہو جائے اس سے بدتر تو ملکیت اور کوئی ہوتی ہی نہیں ہے۔ سٹیٹ کی مملکیت کے اندر نہیں آ جائے' سٹیٹ کے انتظام کے اندر آ جائے' کا ہے کے لئے؟ بات صاف ہے کہ قحط پڑ رہا تھا تو ان قحط زدہ لوگوں کی ضرورت کے لئے ایسا کیا گیا تھا اور یہی وہ چیز ہے جو قرآن کہتا ہے کہ مملکت کا فریضہ ہوتا ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) مملکت کے اندر کوئی متنفس ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ جس کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری مملکت نہ لے کہ یہ ضرورت جو ہے سب سے پہلی ضروریاتِ زندگی میں روٹی کا آتا ہے' پیٹ بھرنے کا آتا ہے۔ یہ مملکت اپنا فریضہ کیسے ادا کرے اگر ذرائع پیداوار جو ہیں وہ دوسروں کی ذاتی ملکیت میں ہوں۔ اگر ملکیت میں آپ دیتے ہیں تو آپ یہ بھی نہیں کسی کو مجبور کر سکتے کہ ضرور دو اپنی سٹیٹ کو' وہ کہے جاؤ

جاؤ میری ملکیت ہے' جیسے اپنا مکان ہے وہ خالی رکھے کرائے پہ دے' اس میں بسے' تالا لگا دے' کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ ملکیت قرار دینے کے بعد آپ حقِ ملکیت میں INTERFERE نہیں کر سکتے۔ جی چاہے زمین کو جوتے اور پھر جی چاہے نہ بیجے' ضرورت ہے ملک گیہوں کے مارے مرر ہا ہے' باہر سے منگانا پڑ رہا ہے' اتنا اربوں روپیہ' کروڑوں روپیہ آپ کا اس پہ جا رہا ہے' ذاتی ملکیت والا کیش کروپ مانگتا ہے کہ صاحب! اس میں بڑا منافع ہوتا ہے آپ اسے یہ نہیں کہہ سکتے اگر آپ نے ذاتی ملکیت دے رکھی ہے کہ نہیں صاحب! تمباکو نہیں اس میں گیہوں ہونا چاہئے' وہ اس میں گنا بوئے گا' تمباکو نہیں بوئے گا۔ یعنی یہ جو چیز ہے انتظام کے اندر آنا تو پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ یہ چھوٹا سا مالک چھوڑ کر ایک بڑا سا مالک بنانا نہیں ملکیت کا تو سوال ہی قرآن کی رو سے پیدا نہیں ہوتا خواہ آپ فرد لے لیں یا مملکت کیوں نہ لے لیں۔ انتظام کا سوال پیدا ہوتا ہے زمین کا انتظام اس حیثیت سے کہ مملکت کے اندر کوئی شخص (حضورﷺ کے الفاظ میں) رات کو بھوکا نہ سوئے۔ اب یہ دیکھئے کہ اس دور میں حضرتِ یوسفؑ نے ان حالات میں جو وہاں اس طرح سے وارد ہو رہے تھے مملکت کے اوپر' زمین کا انتظام کیا سوچا۔ یہ انجیل یا تورات اس کی DESCRIPTION کچھ بڑی مبہم سی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ترجمہ در ترجمہ در ترجمہ اور پھر آخر میں آ کے جب وہ اردو کا بھی ترجمہ ہوا ہے تو وہ بھی آج سے کوئی دو سو سال پہلے کی بات تھی' اس میں ہوا لیکن بہر حال اس میں سے کچھ بات پلے پڑ جاتی ہے۔ تورات میں ہے (تورات کتابِ پیدائش' باب 47)۔

تورات' بائبل' اور تحقیق کی تاریخی حیثیت

آپ کو معلوم ہے موجودہ بائبل جسے کہتے ہیں اس کے دو حصے ہیں ایک OLD TESTAMENT (عہد نامہ عتیق) ایک NEW TESTAMENT (عہد نامۂ جدید)۔ عہد نامۂ جدید میں تو حضرتِ عیسیٰؑ کی تعلیم ہے ان کی کتاب نہیں ہے وہ روایات ہیں جو ان کے حواریوں نے بیان کیں اور مدون کیا ہے حضرتِ عیسیٰؑ کی اپنی کتاب کوئی نہیں NEW TESTAMENT اسی میں ان کی تعلیم کو بیان کیا ہے دوسروں نے اپنے الفاظ میں اور اس کے ساتھ کچھ خطوط ہیں سینٹ پال وغیرہ کے۔ اور عہد نامۂ قدیم وہ ہے کہ جس میں حضرتِ عیسیٰؑ سے پہلے انبیائے بنی اسرائیل بلکہ حضرتِ نوحؑ سے شروع کر کے ان تمام کی کتابیں وہ ساری اس مجموعے کے اندر ہیں۔ اور یہ یاد رکھئے اس پورے مجموعے کو تورات کہتے ہیں اس میں پانچ چھوٹے چھوٹے صحیفے ہیں جن کو صحفِ موسیٰؑ کہتے ہیں۔ تو یہ تصور غلط فہمی ہمارے ہاں عام ہے کہ تورات حضرتِ موسیٰؑ کی کتاب ہے' یہ غلط ہے۔ تورات اس مجموعۂ کتب کا نام ہے جو حضرتِ عیسیٰؑ سے پہلے مختلف انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوب ہیں اور اس مجموعے کو اکٹھا کر دیا ہے عہد نامۂ عتیق کے اندر' عہد نامۂ عتیق کا نام تورات ہے اس میں صرف پانچ چھوٹی چھوٹی کتابیں صحیفے ہیں وہ' صحفِ ابراھیم و موسیٰ قرآن کہتا ہے۔ موسیٰؑ کی کتاب کا نام تورات' قرآن میں کہیں نہیں

ہے۔صحفِ ابراھیم وموسٰی ۔تو بہر حال وہ تورات ہے۔

مصر اور کنعان کی معاشی تباہی کے حل کے سلسلہ میں حضرت یوسفؑ کی طرف سے طبقات کا خاتمہ اور زمین کی آبادکاری کا پروگرام

تورات کی کتابِ پیدائش' پہلی کتاب ہے وہ اس میں یہ لکھا ہے کہ حضرتِ یوسفؑ نے کیا انتظام کیا خزائن الارض کا۔اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی (یہ وہی ان کی اردو ہے) اس لئے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہوگئی تھی۔ یوسفؑ نے ساری نقدی جو ملکِ مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی اس غلہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا جمع کی۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ وہ بڑے بڑے لوگوں کے پاس جو سرمایہ جمع ہوا تھا ان سے وہ سرمایہ نکالا۔ٹھیک ہے تمہیں گیہوں دیتا ہوں' لائیے۔پہلے تو یہ سارا نکالا اس طرح سے۔اس نے اس پورے معاشرے کو ہموار کیا' یہ طبقات جو تھے یوں ختم کئے۔اور یوسفؑ اس نقدی کو فرعون کے گھر لایا اور جب ملکِ مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آ کر یوسفؑ سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے کیوں مریں۔کیونکہ نقدی کم ہوگئی تھی یوسفؑ نے کہا کہ اپنے چوپائے دو اگر نقدی کم ہوگئی ہے تو میں تمہارے چوپاؤں کے بدلے تمہیں روٹی دونگا اور وہ اپنے چوپائے یوسفؑ کنے لائے اور یوسفؑ نے گھوڑوں' بھیڑ' بکریوں' گائے' بیل اور گدھوں کے بدلے میں ان کو روٹیاں دیں۔اب دوسری چیز یہ تھی کہ یہ جتنے مال مویشی جن سے وہ زراعت کرتے تھے وہ ان سے سارے لے لئے۔ اس طرح کہ ان سب چوپائیوں کے بدلے میں انہیں اس سال پالا جب وہ سال گذر گیا اور دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چکاتے کہ ہمارا نقد خرچ ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہمارے چوپاؤں کے گلے بھی لے لئے تو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بندوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے اور جب تک ہم جئیں ورنہ ہم مر جائیں گے ۔ یوسفؑ نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لئے مول لے لی۔ یہ اسی انداز سے لکھ سکتے تھے ''فرعون کے لئے مول لے لی'' یعنی وہ پرائیویٹ ملکیت کے اندر نہ رہنے دی' دیکھا کس طرح سے آہستہ آہستہ یہ کیا کہ وہ ساری زمین آج کے الفاظ میں میں کہوں گا کہ وہ اپنی تحویل میں لے لی کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے ان کو نقد تنگ کیا تھا۔پھر زمین فرعون کی ہوئی۔رہے لوگ تو اس نے انہیں شہروں میں مصر کے اطراف کے ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ان کو تو لے آیا شہری زندگی کے اندر کہ آؤ MAN POWER جتنی ہے اس سے تو معلوم نہیں کتنے اور کام لئے اور زمین جو تحویل میں لی ہوئی تھی وہاں ان کھیتی کرنے والوں کو وہاں

بسائے گا۔خزائن الارض کا یہ امین تھا۔

فرعون اور لشکرِ ہامان کے سامان کی اجارہ داری کا ذکر

جہاں کوئی انتظامات ہونے لگتے ہیں مذہبی پیشوائیت اس کے اندر ضرور دخیل ہوتی ہے۔اس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انہیں دی تھی' کھاتے پیتے تھے۔اس لئے انہوں نے اپنی زمینوں کو سنبھال رکھا۔یہ کوئی نئی بات نہیں ہے شروع سے یہ چیز چلی آ رہی ہے ایک ہی EXCEPTION ہے۔اور ان کا تواتر جو تھا ان کاہنوں کا' مذہبی پیشوائیت کا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن نے فرعون اور اس کے ساتھ ہامان جو گنایا ہے **هامان و جنودهم** ہامان اور اس کے لشکر۔اور ان کا اثر اس زمانے میں یعنی یہ بادشاہ ان کے سامنے کوئی شے ہی نہیں ہوتے تھے۔کل تک ابھی یورپ میں چرچ کا جو ہولڈ تھا' بادشاہ کانپتے تھے اپنے محلوں کے اندر' یہ تو یہ بلا ہوتی ہے اس لئے کہ بادشاہ بھی اپنے ہی نام سے کچھ کرتا ہے۔یہ سارا ظلم وستم خدا کے نام پہ کرتے ہیں۔صرف ان کاہنوں نے زمین نہ دی کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے۔ تب یوسفؑ نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو! لو یہ بیج تمہارے لئے ہے کھیت بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے چار حصے کھیت میں بیج بونے کو اور تمہاری خوراک کو اور ان کو جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لئے ہونگے۔

حضرت یوسفؑ کی نگاہ بصیرت سے مصر آج تک مستفید ہو رہا ہے

کیا بات ہے!!! یہ حصہ تمہارا ہوگا تمہارے اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لئے اور اس کے بعد باقی جو ہے جمع کراؤ آ کر آئندہ کے لئے۔وہ بولے کہ تم نے ہماری جانیں بچائیں ہم اپنے خدا کی نظر میں مورد رحم ہوئے اور ہم فرعون کے خادم ہونگے۔اور یوسفؑ کے سارے مصر کی زمین کے لئے یہ آئین جو آج تک مقرر ہے اندازہ لگائیے یہ ان کے دن تک جب یہ تورات مرتب ہوئی ہے' وہ کہتے ہیں کہ آج کے دن تک یوسفؑ کا آئین ہمارے ہاں چل رہا ہے کہ فرعون پانچواں حصہ لے گا۔صرف کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔باقی یہ تھا وہ علاج جو حضرتِ یوسفؑ نے کیا خزائنِ ارض کے برآمد کرنے کا اور ان کے محفوظ رکھنے کا۔تمہارے اور تمہارے بچوں کی روٹی کے لئے جتنا چاہئے وہ رکھو' یہ ہے ٹکڑا اصل میں۔اور جتنے یہ بڑے بڑے لوگ تھے کہ جو وہاں بیٹھے ہوئے ان سب کو شہروں کے قریب آ کے بسایا اور پھر ان سے یہ کچھ کام لیا۔ادھر اس آبادی میں کام کرنے والے پیدا کئے اُدھر انتظام یہ سارا کیا کہ سرکاری انتظام کے تابع زمین بوئی گئی وہاں سے وہ پیداوار ہوئی اس کو تقسیم کیا ان کے اور ان کے بچوں کی روٹی کے لئے اور اس کے بعد جو کچھ بچا وہ لایا گیا فرعون کی تحویل میں۔عزیزانِ من! یہ تھا تورات کی رو سے جو انتظام کیا تھا حضرتِ یوسفؑ نے۔آپ دیکھئے کہ یہ کب کی بات ہے۔اور میں سمجھتا

ہوں کہ یہ چیزیں جو تھیں وحی کی رو سے تھیں' وحی یہ انتظام کرسکتا تھا' ایک رسول ہی یہ انتظام کرسکتا تھا۔ یہ چیز ایک رسول ہی پھر آ کر رسولِ خاتم النبیین ﷺ کہہ سکتے تھے کہ جس بستی میں ایک شخص بھی رات کو بھوکا سو گیا اس بستی سے خدا نے اپنی حفاظت کا ذمہ اٹھالیا۔ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ (12:56) اتنا اختیار اتنا اقتدار اور واقعی وہ جو محاورے میں کہتے ہیں کہ وہ رعایا تو ان کی پرستش کرتی ہوگی ایسے شخص کی جس نے یہ انتظام کیا تھا ہُن برس رہا ہوگا اس سرزمین کے اندر۔ یہ اختیار کیوں نہ ان کو ملتا' یہ اقتدار کیوں نہ ملتا!!۔ اس اقتدار اور اس اختیار کے بعد قرآن کہتا ہے نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ ط (12:56) اسے خدا نے اپنی رحمت قرار دیا ہے اقتدار اور اختیار کا مل جانا کسی قوم کو یہ خدا کی رحمت ہے۔

وحی کی راہنمائی کے باوجود ہماری کوتاہ نظری کی کیفیت اور پھر اس آیت کا حقیقی مفہوم

یہاں سے تو الفاظ کے ترجمے سے یہ ہوگا کہ ہم اپنی اس رحمت کو پہنچاتے ہیں اس تک جسے ہم چاہتے ہیں۔ تو آ گئی اگلی بات وہ ہمارے ہاں فسانے کی کہ صاحب! یہ تو پھر خدا کی مشیت پہ ہے' جسے وہ چاہتا ہے' یہ دیتا ہے۔ بس پھر اس چیز کے اوپر بنیادی اینٹ پہ اٹھی عمارت لیکن فقرہ ابھی آدھا ہے اور آپ کے ہاں جتنے یہ باطل کے عقائد اور غلط نظریے قائم ہوتے ہیں' یہ آدھی آدھی آیت کو پیش کرنے سے ہوتے ہیں اور اس کا حل ہے پوری آیت پیش کر دینا' کہیں باہر سے حل لینے کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں سے پیش کر دیجئے یا اس کے بعد کہیں دوسرے مقام کے اوپر آیت اس کی تشریح میں دی ہوئی ہے' اس کو پیش کر دیجئے یعنی حل وہیں قرآن کے اندر ہے۔ اور ایسے مقام پہ تو قرآن دیر ہی نہیں لگاتا اسی سانس میں بات کہہ دیتا ہے۔ یہاں یہ تھا کہ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ ط (12:56) یہ ہماری بہت بڑی رحمت ہے ہم پہنچاتے ہیں اس تک جس تک (لفظی ترجمہ جو لوگ کرتے ہیں) مَنْ نَّشَآءُ (12:56) جس کو ہم چاہتے ہیں۔ ترجمہ ہے: ''ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اسے دیتے ہیں'' اور قانونِ مشیت کیا ہے؟ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (12:56) جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے ہم اس کی محنت کو ضائع نہیں جانے دیا کرتے۔ خدا کی طرف سے اتنی بڑی رحمت کے ملنے کا اصول' قانون اور معیار یہ ہوگیا۔ وہیں یہ بات کہہ دی ہے لیکن یہاں تو یہاں تک ہی بیان کریں گے نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ ط (12:56) بندہ بشر کیا کرسکتا ہے۔ قرآن آگے یہ بھی تو کہتا ہے وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (12:56) اجر' محسنین' توازن بدوش خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے والا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک حقوق طلبی کو ذمہ داری کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے

عزیزانِ من! لفظ اجر ہے' ہم اس کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ یہ ہے وہ چیز۔ضمناً یہاں سے اور بات بھی سامنے آ گئی وہ تو قرآن کے ایک ایک لفظ سے بات سامنے آتی ہے۔اس دور میں جو اس قدر یہ عالمگیر فسادات' ہنگامے' شورانگیزیاں' LABOUR کا QUESTION جو پیدا ہوا ہوا ہے آجر اور مستاجر کا' اتنی بڑی یہ پرابلم ہے کسی ایک ملک تک محدود نہیں رہی سارے ممالک میں یہ پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کیا چیز ہے' کیوں اس کا حل نہیں مل رہا؟ یہاں جتنے بھی کام کرنے والے ہیں ان کے حقوق گنتے ہیں وہ اپنے حقوق مانگتے ہیں اور یہ چیز گویا تسلیم کی جاتی ہے یا اعتراف کیا جاتا ہے کہا یہ جاتا ہے کہ ہاں صاحب! ان کے RIGHTS ہیں۔حقوق اور RIGHTS یہ عام چرچا ہوتا ہے ان کی ذمہ داریاں اور فرائض (RESPONSIBILITIES & OBLIGATIONS) اس کا کہیں ذکر نہیں آیا یہ ساری مصیبت اسی سے ہے۔ جہاں آپ چرچا سمجھ لیں وہاں یہی چرچا ہوگا صاحب! حقوق ہیں' حقوق ہیں۔

وحی اپنے ہاں ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے خدوخال واضح طور پر متعین کرتی ہے

قرآنِ کریم کی طرف ہم آتے ہیں تو وہ ہر حق متعین کرتا ہے کسی ذمہ داری کے پورا کرنے تک۔اور وہ حق متعین نہیں کرتا' اس ذمہ داری کے پورا کرنے کا یہ نتیجہ یا اجر ہوتا ہے اسی کو اس کا حق کہتا ہے۔سارے قرآن میں دیکھئے یہ ہے ''یہ کرو گے تو یہ ملے گا' یہ کرو گے تو یہ ہوگا'' سارے قرآن میں پہلے یہ ہے ''یہ کرو گے تو پھر یہ ملے گا'' تو یہ کرو گے والی بات ذمہ داری کی ہوگئی RESPONSIBILITY کی ہوئی OBLIGATION کی ہوئی۔اب حق اور انصاف پر مبنی معاشرہ وہ ہوگا کہ جو کہے گا کہ یہ کرو گے یہ ملے گا تو وہ مل جائے اس کو۔اور ہنگامہ خیزیاں یہ ہونگی کہ کریں گے نہیں ملے گا یہ ضرور' کیوں؟ یہ ہمارا حق ہے۔جونہی آپ نے RIGHTS کا تصور عام کیا بغیر RESPONSIBILITIES کے اور بغیر OBLIGATION کے فساد برپا ہوگا۔اگلی کلاس میں چڑھنا ہمارا حق ہے محنت کرنا یہ کم بختی میں لوگ بستے ہیں' یہ ان کا کام ہے۔حق ہے RIGHT ہے یہ ایک وبا چلا دی گئی ہے دنیا کے اندر۔

تھیوکریسی یا مذہبی پیشوائیت جو اپنے اختیارت کو ہمیشہ خدا کا حکم کہہ کر منواتی ہے

ابھی حال ہی میں میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا اس شخص کا ایک فقرہ ہے' بڑی اونچی کتاب ہے جو اس نے لکھی ہے۔اس مسئلے کو وہ بیان کرتا ہے' کہنے لگا کوئی نئی باتیں نہیں ہیں یہ جو آتی ہیں وہی جو اقبالؒ نے یہ کہا تھا وہی مرجی وہی عنتری' اس نے کہا کہ اس سے پیشتر DIVINE RIGHTS یہ ایک تصور تھا حقوقِ خداوندی' خداوندی اختیارات یا حقوق' کبھی تو یہ حاصل ہوئے تھیوکریسی میں مذہبی پیشوائیت کو' خدائی اختیارات: اس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ جب انہوں نے کہہ دیا کہ خدا کے حکم سے ہم تمہیں یہ کہتے ہیں ہم اس کے

نمائندے ہیں پھر اس کے لئے اس کے بعد نہ اعتراض کیا جاتا ہے نہ تنقید کی جاسکتی ہے سرکشی کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ حکمران اور بڑے فخر سے آپ کہتے ہیں کہ ہم نے وہ ملوکیت اٹھادی DIVINE RIGHTS کا تصور جو تھا وہ ختم کیا' کہنے لگے آپ نے دیکھا ہے کہ اب وہ کس بھیس میں آیا ہے۔ اس کا فقرہ ہے THE DIVINVE RIGHTS OF THE MASSES (عوام کے حقوقِ خداوندی)۔ کہتا ہے وہ حقوقِ خداوندی کا تصور انسان ذہن سے نکال ہی نہیں سکا۔ کہتا ہے مصیبت یہ ہوئی کہ وہ اگر یہ ملوکیت مذہبی پیشوائیت کی تھی انہیں بھی پتہ تھا کہ یہ متعین طور پہ کچھ مذہبی پیشوا ہیں' مذہبی میں ملوکیت میں تھی تو معلوم تھا یہ ہے بادشاہ اس ایک کا ہی ہے' کہنے لگے یہاں مصیبت یہ آ گئی کہ MASSES جب آپ کہتے ہیں تو ساری خدائی جو ہے اس کے اختیارات خداوندی' تو کہا کہ اس تصور میں بدترین ملوکیت اور پیشوائیت پائی جاتی ہے۔

Divine Rights کی بنیاد پر تشکیل پانے والے معاشرے میں انسانی حقوق متعین ہوتے ہیں

DIVINE RIGHTS کے بعد آپ سوچتے ہیں جب وہ کوئی بات کرتے ہیں حق کی' کہیں آپ REASON کے ساتھ' فکر کے ساتھ' دلیل کے ساتھ' برہان کے ساتھ' کوئی گفتگو کر سکتے ہیں ان کے ساتھ!! حل مسئلے کا جو ڈیمانڈ ہے وہ پوری کرو' یہی ہوتا ہے حقِ خداوندی' اس کے خلاف دلیل و برہان نہیں' اعتراض نہیں' تنقید نہیں' کوئی مصالحت' نہیں کچھ نہیں' پورا کرو۔ آپ دیکھتے ہیں قرآن کہاں لے جاتا ہے' وہ حق متعین کرتا ہے ذمہ داری کی ادائیگی کا' ذمہ داری کی فریضہ کی' ادائیگی کا نتیجہ جو ہے وہ کہتا ہے ہم دیتے ہیں وہ اس کا ہم پر حق ہوتا ہے' جو وہ کرتا ہے اس کا نتیجہ حق ہوتا ہے اس کا' وہ ہم دیتے ہیں۔

قرآنِ حکیم اپنے ہاں آجر اور مستاجر کی بجائے ہر شخص کے لیے عامل کا لفظ استعمال کرتا ہے نہ کہ کمّی کا

ضمناً یہ جو چیز ہے ہمارے ہاں یہ مزدور کا EMPLOYEE کرنے والا آجر اس مستاجر کا یہ تو تصور نہیں ہے قرآن میں' یہ جتنا عمل' قرآن میں لفظ آیا ہے وہ کوئی خاص طبقہ نہیں ہے جس کو آپ محنت کش یا مزدور کہتے ہیں وہ تو ہر انسان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ وہ عامل ہے۔ عمل اس نے کرنا ہے' کام اس نے کرنا ہے۔ اب ہمارے ہاں وہ کام کی بھی الگ نوعیت ہوگئی یعنی ایک الگ طبقہ ہے کام کرنے والا اور وہ طبقہ جو کام کرتا ہے پھر اس کی کیفیت یہ ہے یہاں شہروں میں تو خیر مزدور' ویسے مزدور بھی ہمارے شہروں کے اندر کی جو اصطلاح ہے بڑی عجیب سی اصطلاح ہے پست درجے کا انسان' یہاں تو پھر بھی یہ لفظ تھا گاؤں کے اندر تو ہمارے ہاں یہ کامی جو تھا پھر وہ کمّی ہوا' کمّی جو ہے وہاں سے کمین ہوا' کام کرنے والا۔ قرآنِ کریم ہر انسان کو کام کرنے والا کہتا ہے۔ یہ جتنے بھی لفظ ہیں اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (85:11)' اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ (39:74) قرآن جہاں کہتا ہے' وہ یہ نہیں کہ یہ مزدور یا محنت کش جو ہیں وہ ان کا ذکر کرتا ہے کہتا ہے۔ ہر کام کرنے والا جو ہے اس کے کام کا ایک نتیجہ ہوتا ہے جو اس کا حق ہے اور کام یہ نہیں ہے کہ یہ لیبر اس کا ہم نے ترجمہ کر دیا انسان

جو کام بھی کرتا ہے وہ عمل ہے یا وہ عملِ سوء ہوگا یا حسنات اس کے اندر ہوگی یا تخریب پیدا کرے گا اس کا کام یا تعمیر پیدا کرے گا اس کام کا نتیجہ جو ہے اجر' اسے کہئے۔ یہاں بھی سارا کچھ اس اعمال کے بدلے میں لیتا ہے' کام کے بدلے میں لیتا ہے آخری منتہا جو اس سطحِ زندگی کا جسے جنتِ اخروی آپ کہتے ہیں' اس کے لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ ہے بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (43:72) یہ ہے وہ جنت جو تمہارے کام ہی کے بدلے میں تمہیں مل رہی ہے۔ تو یہ چیز جسے آپ حق کہتے ہیں' وہ حقیقت میں اجر ہوتا ہے کسی کے کام کا۔

مزدوری کرنے والوں کے لیے مزدوری کے تعین کا مسئلہ ایک بڑا غور طلب معاملہ ہے

یہ میں کبھی پھر عرض کروں گا کہ یہ مزدوری جسے مزدَور کہتے ہیں' یہ تصور بڑا باطل ہے' بڑا غلط تصور ہے۔ یہ ساری مشکلات پیدا کی ہوئی ہیں WAGES کے تصور نے۔ مزدَور کے معنی WAGE EARNER ہے' اس کے اس کام کی WAGE یا بدلا یہ ہوگا۔ ضمناً میں عرض کر دوں یہ مصیبت کیا ہے۔ کس کام کا اتنا یہ معاوضہ ہوگا یہ معاوضہ کون متعین کرتا ہے یعنی یہ اتنا ہوگا' مزدور وہاں بیٹھا ہوا ہے صاحب! تین روپے روز ہو گئے' مستری ہے دس روپے روز' اور سیر اس کے اوپر ہے پانچ سو روپے مہینہ ہوگا' انجینیر ہے ہزار روپے یہ ہوگا۔ یہ چیز کہ وہ مزدور کے تین روپے ہونگے مزدوروں نے تو بیٹھ کے نہیں آپس میں مشورہ کر کے متعین کیا' یہ کون متعین کرتا ہے؟ دوسرے کا کام' اس کی محنت کا معاوضہ وہ متعین کرتا ہے جو کام کرا رہا ہے اس سے۔ کیا بات ہے!! اور آپ حیران ہونگے کہ یہ جن معاشروں کو آپ سوشلزم کا معاشرہ کہتے ہیں (کمیونزم تو کہیں آئی نہیں ابھی تک' وہ تو اس نے مارکس نے تصور ضرور دیا اور کہہ دیا میرے بس کی بات نہیں اس کا لانا یعنی وہ چیز کہ کوئی بھوکا نہ رہے' میں نہیں لا سکتا۔ چھوڑیے) SOCIALISTIC COUNTRY جتنے ہیں ان کے ہاں بھی WAGES ہی دی جاتی ہیں اور WAGES کا تعین پھر اوپر کا طبقہ کرتا ہے EMPLOYER کرتا ہے وہ ایک فرد کا ذاتی ملازم ہو' کارخانے کے مالک کا ملازم ہو' وہ سٹیٹ کا' گورنمنٹ سرونٹ ہو۔ یہ سٹیٹ کا جو سرونٹ ہوتا ہے جسے آپ گورنمنٹ سرونٹ کہتے ہیں وہ بھی تو اپنی WAGE آپ نہیں مقرر کرتا اس کی WAGES بھی EMPLOYER مقرر کرتا ہے۔ ساری عدمِ طمانیت جو دنیا میں پھیلی ہے وہ یہ کہ جس کی WAGE آپ مقرر کرتے ہیں وہ سمجھتا ہے اب یہ کہ WAGE میری تھوڑی ہے' مقرر اُس کی کی ہوئی ہوتی ہے یہ جب پوچھتا ہے کہ بھئی! وہ کتنی دیں جتنی وہ مانگتا ہے وہ کہتے ہیں ہم یہ AFFORD نہیں کر سکتے۔ WAGE کا جھگڑا اور WAGE جو ہے اس کے بعد بطور حق کے مانگنا بطور کسی ذمہ داری کے پورا کرنے کے اجر میں نہیں مانگنا RIGHT DETERMINES RESPONSIBILITY نہیں۔

قرآن حکیم کے ہاں WAGE کے مسئلہ کا دوٹوک اور واضح حل موجود ہے

عزیزانِ من! WAGES سارا قصہ ہے۔ یہ حل نہ سوشلزم پیش کرتی ہے نہ کوئی دوسرا نظام' یہ مسئلہ ہی نہیں ہوسکتا جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ مسئلہ حل ہوتا ہے قرآن کی رو سے وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) معاشرے میں بسنے والے تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی مملکت' نظام کے اوپر ہے۔ WAGES کا مسئلہ ہی نہیں۔ عملاً نبی اکرم ﷺ نے کر کے دکھا دیا۔ یہ تو ہماری بدقسمتی ہے کہ اس دور کی تاریخ صحیح ہمارے سامنے نہیں آ رہی' تاریخ مرتب ہوئی ہمارے سرمایہ دارانہ ملوکیت کے زمانے میں' جاگیردارانہ دور کے اندر' وہاں WAGES مقرر ہوئیں۔ کہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے' کہیں ہیروں کی کنیوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔ سپاہیوں میں مالِ غنیمت بٹا کرتا تھا یہی پہلے دور کا ہمارے ہاں کا اکنامک سسٹم اس دور میں ابتدا میں یہ تھا۔ پہلے تو یہ اصلاح ہوئی کہ روش چلی آتی تھی میدانِ جنگ میں سپاہی جو جتنا لوٹ لے وہ اس کا' کسی عورت کو پکڑ لے وہ اس کی لونڈی۔ تو جنگ کے لئے سب سے پہلا ہی ATTRACTION یا جاذبیت ہوتی تھی وہ یہ مالِ غنیمت ہوتا تھا سب سے پہلے یہ کہ اس کو ختم کیا کہ سوال ہی نہیں ہے کہ جو جتنا لوٹ لے۔ یہ جتنا بھی دشمن چھوڑ کے چلا جائے' مالِ غنیمت جو آئے گا' مملکت کی تحویل میں جائے گا۔ زمین کی پیداوار جب بعد میں قصہ آیا وہ بھی مملکت کی تحویل میں ہوئی۔

مملکت اسلامیہ کا ہر فرد ایک مجاہد کی حیثیت سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دے گا اور مملکت اس کی اور تمام اہل خانہ کی ہر قسم کی ضرورت کو پورا کرے۔

حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں جو انتظام ہوا ہے عراق کی زمینوں کا وہ بھی ہے۔ اب یہ جو کچھ آیا ہے کا ہے کے لئے آیا ہے؟ وہ آیا ہے اس لئے کہ مملکت میں کوئی شخص رات کو بھوکا نہ سوئے' ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہ جائے۔ اب میں نے کہا تھا کہ غنیمت کا یہ پہلا اصول ختم کیا۔ اب وہ اصول یہ تھا کہ آ کر وہ جمع ہوتا تھا اور یہاں سے مرکزِ ملت اس کو تقسیم کرتا تھا۔ سیدھی سی بات ہے کہ میدانِ جنگ میں سپاہی جو کچھ لائے ہیں' سپاہیوں نے یکساں وہاں کچھ کام کیا ہے ایک ہی جیسا ان کو ملنا چاہئے۔ حق کی بات اگر ہوتی AS OF RIGHT تو یہ چیز بڑی انصاف پر مبنی نظر آتی ہے کہ ہر ایک کو یکساں ملنا چاہئے۔ نبی اکرم ﷺ وہ جو SINGLE سپاہی ہوتا تھا غیر شادی شدہ اس کو آدھا حصہ دیتے تھے اور شادی شدہ بال بچے والے کو دوگنا حصہ دیتے تھے۔ پہلا دنیا کا عظیم انسان ﷺ ہے کہ جس نے WAGES کے تصور کو ختم کیا دنیا میں ضروریات کے تصور کو رائج کیا۔ عزیزانِ من! یہ اس مسئلے کا حل ہے ہر کام کرنے والے کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا' یہ مملکت کا فریضہ ہے۔ اس کا فریضہ کہ جس کام کے وہ قابل ہے اور جو کام اس کو دیا گیا ہے' اس کام کا پورا کرنا

اس کا فریضہ ہے۔ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ قیامت تک WAGES کے اوپر آپ اس کو رکھیں گے کبھی اس مسئلے کا حل نہیں مل سکے گا۔ WAGES پھر RIGHTS اس کے جو ہیں وہ آ گئے آپ کے سامنے' نہیں حل مل رہا۔ یہ ضروریاتِ زندگی پوری کرتے ہیں اپنی RESPONSIBILITY کے اعتبار سے' وہ کام کرتا ہے اپنی RESPONSIBILITY کے اعتبار سے۔ ارے یہ تو ایسا کچھ معاشرہ ہے جس میں RESPONSIBILITY ہی RESPONSIBILITY ہیں یہاں تو حقوق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہر ذمہ داری کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ کچھ پیدا کرتا ہے۔ عادلانہ معاشرہ وہ ہے کہ جس میں یہ اعلان کیا جائے کہ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (12:56) اسے ضائع نہیں ہم کریں گے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے یہ تصور پیدا کیا جسے کہا ہے' ثواب ہی ایک ٹرم جو ہے وہ تو خیر اور بات ہے کہ کیا معنی اس کے۔

عملی زندگی میں پہلے پانی پیو گے تو تب ہی پیاس بجھے گی' بالفاظ دیگر حق طلبی ہمیشہ ذمہ داری کے ساتھ مشروط ہوتی ہے

بہرحال جو بھی خدا کے ہاں سے ملتا ہے' کہیں بھی آپ دیکھ لیجئے قرآن میں یا باہر بھی اس کے ''یہ کرو گے تو یہ ثواب ملے گا'' پہلے یہ کرو گے آیا ہے پھر اس کے بعد کہا ہے کہ یہ اس کا حصہ ملے گا' ثواب حصے کو کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! ''کرو گے'' والی بات بنیادی ہے یہ ہے OBLIGATION , RESPONSIBILITY اس کے لئے پھر بعد میں آپ دیکھیں گے کہ ایک حق بھی اگر اسے آپ کہیں تو متعین ہوتا ہے ذمہ داری کے اوپر ہی اور یہ چیز ہے جو قرآنِ کریم نے کہی ہے لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (12:56) کتنی عظیم چیز مل رہی ہے' تمکن فی الارض مل رہا ہے' اقتدار اور اختیارات مل رہے ہیں اتنی شان کے کہ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (12:56) ضائع نہیں کرتے۔ تو یہاں اطمینان ہو گیا کہ صاحب! ٹھیک ہے حسن کارانہ زندگی بسر کی' دیانت دارانہ' حَفِيْظٌ ۚ عَلِيْمٌ (12:55) کی زندگی بسر کی یہ دنیاوی وجاہت' مملکت' اختیارات' منصب یہ ساری چیزیں مل گئیں تو کیا معاملہ یہاں ختم ہو گیا؟ یہ چیز تو دنیا کے ہر نظام' ہر معاشرے کے اندر یہ چیز یہاں تک تو وہ ملتی ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان رکھنے والوں کے لیے جہاں فردا کی رنگینیاں بدرجہ اتم' خوبصورت اور دل فریب ہوں گی

قرآن ہے! یہاں یہ دینے کے بعد اسی سانس میں کہتا ہے وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ (12:57) اتنا حصہ جو پہلا ہے اتنا تو اسلامی اور سیکولر میں کوئی فرق نہیں ہے' مومن اور کافر میں بھی کوئی فرق نہیں۔ جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ گنڈا سنگھ

بھی زمین جوتتا ہے' زراعت کرتا ہے تو وہ زمین اسی طرح کے گیہوں گندم اگاتی ہے۔ ہوسکتا ہے زیادہ محنت کرے' زیادہ ہی اُگے عبداللہ اور عبدالرحمٰن کے مقابلے میں۔ یہ جو کہا ہے تمکن فی الارض' تمکن فی الارض تو ہم دیکھتے ہیں فرعون کو بھی ملا ہوا تھا' تمکن فی الارض تو ہر سیکولر گورنمنٹ میں مل جاتا ہے۔ یہاں تک یہ دنیا کے اندر یہ جو چیزیں ملتی ہیں یہ تو یہاں کے جو طبعی قوانین ہیں ان کے مطابق یا آپ کے سوسائٹی کے جو قوانین ہیں' ان کے مطابق یہ سارا کچھ ملتا ہے' یہ یکساں ہوتا ہے۔ آگے ایک بات آتی ہے ایمان اور تقویٰ یہاں آتا ہے جہاں انسان خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی نگہ داشت کرتا ہوا زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ سارا کچھ تو وہ ملتا یہاں بھی لیکن وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ (12:57) مستقبل' آخرت کی زندگی جو ہے اس کا اجر ان کے لئے اور زیادہ ملتا ہے۔ یہاں آ گیا اب مومن اور کافر کا فرق۔ مومن کی زندگی یہ ہے کہ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201)۔ قرآن نے اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (12:56) کہا تھا وہاں حَسَنَةً (2:201) کہہ دیا اس کا نتیجہ۔ یہ زندگی بھی خوشگوار بڑی حسین' مستقبل کی زندگی آخرت کی زندگی بھی بڑی خوشگوار بڑی حسین' یہ ایمان اور عمل کا نتیجہ ہے۔ اتنا سا ٹکڑا آگے آتا ہے۔ حضرتِ یوسفؑ قید و بند سے باہر آئے' معزز ہوئے' زمین کے خزائن کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا' اس طریقے سے وہ کچھ کیا کہ وہ ملک خوشحال ہوا' فریضۂ رسالت ساتھ کے ساتھ ادا کرتے ہوئے چلے گئے' یہاں تمکن ملا اور وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ (12:57) قرآن نے یہ کہا۔

قحط کی بنا پر غلہ کے حصول کے دوران حضرت یوسفؑ کا اپنے بھائیوں کے ساتھ آمنا سامنا

اتنا کہنے کے بعد اب وہی بات کہانی چلی آ رہی ہے اس کا اگلا ٹکڑا سامنے آ گیا ہے وَ جَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (12:58) قحط تو عالمگیر تھا وہ ایک ہی مملکت تھی یہ مصر کی اور بحیرہ قلزم کے اس پار کا علاقہ' کنعان کا علاقہ جسے کہا جاتا ہے بیت المقدس تک کا علاقہ تو وہ بھی قحط کے مارے ہوئے وہ بھی یہاں غلہ لینے کے لئے آئے فَعَرَفَهُمْ (12:58) یوسفؑ نے تو انہیں ایک نظر میں پہچان لیا کہ یہ تو وہی بھائی تھے جہاں انہوں نے اسے چھوڑا تھا' کنویں میں ڈالا تھا ان میں تو کوئی تغیر نہیں آیا تھا لیکن یہ یوسفؑ تو وہ یوسفؑ نہیں تھا جسے انہوں نے کنویں میں پھینکا تھا۔ کیا بات ہے قرآن کی !! میں نے کہا تھا کہ اس میں SUGGESTIVENESS بڑی عجیب ہوتی ہے۔ انہوںؑ نے تو آسانی سے پہچان لیا' ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ مملکت کے اقتدارات کا مالک' جس کے پاس ہم آئے ہیں یہ غلہ لینے کے لئے' یہ وہ ہوسکتا ہے۔ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (12:58) وہ اسے نہیں پہچان سکے' نہیں جان سکے یہ کون ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہاں پہچان' تعارف جو تھا وہ عہدوں کے نام سے ہی ہوتا تھا' چیف سیکرٹری' جنرل سیکرٹری' منسٹر' نام کی ضرورت نہیں عام طور پہ پڑتی ہوگی ورنہ شاید یوسفؑ کے نام سے وہ پہچان لیتے یا یہ نام ہی عام ہوتا۔

قرآن نے جس کی تشریح نہیں کی ہم اس بات میں کیوں پڑیں۔قرآن نے کہا ہے کہ وہ نہیں پہچان سکے تو ہوگا یہ کہ یہی چیز' وہ عزیز مصر قرآن نے کہا ہے وہاں بھی' فرعون کا بھی نام نہیں لیا قرآن نے کسی جگہ بھی نہیں لیا حالانکہ یہ فراعنہ یوسفؑ کے زمانے کا اور تھا حضرتِ موسٰیؑ کا اور تھا وہ نام نہیں لے رہا عزیز کا بھی نام نہیں لیا تو ممکن ہے اس حیثیت سے وہ آئے ہوں انہوں نے نہیں پہچانا۔وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ (12:59) وہ جب سامان ان کا لدوا دیا یوسفؑ نے یعنی یہ کچھ کیا اپنی زیرِ نگرانی کیونکہ بات آگے چلانی تھی ورنہ عام لوگ آتے ہونگے غلہ لینے کے لئے لے جاتے ہونگے۔وہ جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ (12:59) کہا ہے کہ ان کا مال جب لاد دیا۔یہ لفظ جَهَّزَ کے معنی سامان کے ہی آتا ہے جو کچھ بھی سامان ہو یہ جہاز کا لفظ وہاں سے آیا ہوا ہے۔

جہیز کی وہ لعنت کہ جس نے گھر میں بیٹھی بیٹیوں کی زندگی کو خاموش قبروں میں بدل دیا ہے' کے لیے مہر کی ادائیگی کی نوعیت

اور جہیز کا لفظ بھی بیٹیو' یہیں سے آیا ہے۔یہ یہی ہوتا ہے کہ انہوں نے' ایک نئے جوڑے نے ایک نیا گھر بسانا ہوتا ہے' اس گھر میں ضروریاتِ زندگی ہونی چاہئیں تو یہ اس گھر میں جو ضروریاتِ زندگی ان کی ہوتی ہیں' وہ لڑکی ساتھ لے جاتی ہے۔یہ اس کا جہیز کہلاتا ہے۔ یہ قرآن کی رو سے کوئی فریضہ نہیں ہے' کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔کہاں سے بات چلی تھی ضروریاتِ زندگی سے' کہاں اب آ کے پٹی ہے سودا بازی پہ۔ٹھیک ہے جی لڑکی ہے ایم اے بھی ہے' پڑھی لکھی بھی ہے ٹھیک ہے جی! ساتھ کیا دو گے۔یہ ہے جہیز' اتنا ضروری کہ جو غریب بے چارہ ان مطالبوں کو پورا نہیں کر سکتا اس کی بیٹیاں گھر میں بیٹھی ہوئی بال سفید' ہو جاتی ہیں' خاموش قبریں۔ہمارا معاشرہ کہ اس زبان پر ایک لفظ نہیں لا سکتیں لیکن یہ سوزِ دروں' ہڈیوں کے گودے تک کو جلا کے رکھ دیتا ہے۔جہیز نہ ملنا۔وہ مہر جس کے متعلق تاکید تھی کہ یہ تم نے ادا کرنا ہے تحفتاً' خوشگواری سے اسے ادا کرنا ہے اس کی تو یہ کیفیت کہ صاحب! کتنا مہر؟ لاکھ لکھوا لیجئے' ارے میاں! کوئی حیثیت یہ سب کچھ' کہنے لگے صاحب! یہ تو ایک رسم ہے پوری ہو رہی ہے' کون ادا کرتا ہے۔قرآن کی رو سے وہ فریضہ ہے' اس کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا اس تحفے کے بغیر' وہ بھی یہ چیز نہیں ہے کہ صاحب! ایک رسم ہے لاکھ روپے کی' ادا کرنا ہے تحفتاً دینا ہے۔قرآن نے مرد کے مقابلے میں عورت کا وزن بتایا تھا کہ اس میں اگر دونوں پلڑوں میں بیٹھو گے تو اس کے ساتھ تمہیں کچھ رکھنا پڑے گا جب تمہارا وزن اس کے برابر ہوگا۔وہ جو فریضہ ہے خدا کی طرف سے' وہ تو رسم بن کے رہ گیا اور یہ چیز کہ جس کا کہیں ذکر تک بھی نہیں ہے کہ یہ کوئی واجب فریضہ ہے ماں باپ کے اوپر کہ وہ ساتھ دیں' اس خیال سے کہ لڑکی نے نئے گھر میں جا کے گھر بسانا ہے۔رات ہی کو اپنی روٹی پکانی ہے ایک تو اور چمٹا دیدیتے۔

شادی کے موقعہ پر نبی اکرم ﷺ کی طرف سے حضرت فاطمہ الکبریٰ کو دیا گیا سامان ایک چمٹا اور ایک چکی

سنت رسول اللہ ﷺ کے اتباع کے اوپر اتنا زور' بڑے زور شور سے کہیں گے کہ اپنے حضور ﷺ نے اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمۃ الکبریٰؓ کو ایک چٹائی ایک چمٹا ایک چکی دی تھی۔ اور ادھر ساتھ اس کے سودا ہو رہا ہوتا ہے کہ صاحب! ایک کار' ایک کوٹھی' اتنی زمین' اتنا نقد' یہ سارے کا سارا۔ لفظ آ گیا تھا جھز کا اس میں میں نے یہ کہا کہ یہ تھا جہاں سے یہ لفظ جہیز نکلا تھا۔ جب اس نے ان کا سامان لدوا دیا قَالَ ائْتُونِیْ بِاَخٍ لَّکُمْ مِّنْ اَبِیْکُمْ ۚ (12:59) یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ سوتیلا بھائی تھا جو پیچھے رہ گیا تھا' یوسفؑ بھی سوتیلا بھائی تھا۔ میں نے آپ سے کہا ہے کہ ان کے سوتیلے ہونے کے متعلق تو ان بھائیوں نے جو ایک گہری نشتر چبھوئی تھی اس مظلوم باپ کو' بیٹوں کے فراق میں جس کی آنکھیں کھوئی گئی تھیں' اس باپ کے پاس جب گئے ہیں وہی جو بیٹا یہاں چھوڑ گئے تھے اور یہاں پھر وہ کٹورے کا واقعہ آگے آتا ہے' جیسا پہلے بھائی کے متعلق جھوٹ موٹ کا وہ دمِ کذب جو تھا کرتے پہ لگا کے لے گئے تھے اور کہا تھا کہ بھیڑیا کھا گیا' اس کے متعلق بھی یہ بات کہنی تھی کہ اس نے وہاں چوری کی۔

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی طرف سے اپنے دوسرے سوتیلے بھائی بِنیامین کے ساتھ کیا جانے والے سلوک کی داستانِ غم

عزیزانِ من! قرآن کے ایک ایک لفظ پہ غور کیا کیجئے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ انہوں نے باپ سے آ کے کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے بیٹے نے کیا وہاں کیا' تمہارے لعل نے وہاں کیا چاند چڑھا دیا' یہ نہیں کہا ہمارے بھائی نے کیا کیا۔ کیا بات ہے قرآن کی!! بڑا فرق اس میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس باپ سے آ کے جو پہلے اس غم میں مغموم بیٹھا ہے' پہلے بیٹے کے غم میں آنکھیں سیاہ ہو گئی ہیں' دوسرا بیٹا ہے وہ بھی واپس نہیں آیا' اور آتے ہی اس سے یہ کہنا کہ جی! دیکھا آپ کے چہیتے لعل نے وہاں کیا چاند چڑھایا۔ اس باپ نے کہا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں' صبرِ جمیل۔ یہ نظر آتا ہے جو اس سے کہا کہ تمہارے بیٹے نے' اپنا بھائی نہیں کہا۔ یہاں بھی یہ کہا ہے حضرتِ یوسفؑ نے ان کو کہ تمہارے باپ کی طرف سے جو تمہارا بھائی ہے' اس کو لے آنا۔ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْکَیْلَ وَ اَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (12:59) یہ تو کم از کم تم نے دیکھ لیا کہ یہاں ظلم اور استبداد نہیں' میرے متعلق تم نے یہاں رہ کے دیکھ لیا' مُنْزِلِیْنَ (12:59) مہمان داری کتنی ہو گئی' تم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ میں اچھا مہمان نواز واقع ہوا ہوں' یہ بھی تم نے دیکھ لیا کہ میں غلہ بھی پورا دیتا ہوں اس میں بھی ڈنڈی نہیں مارتا اور یہ بھی تم نے دیکھ لیا کہ اچھا مہمان نواز ہوں تو جہاں یہ صورت ہو' اب کے آنا تو اپنے اس دوسرے بھائی کو بھی لے آنا۔

غلہ دینے کے سلسلہ میں حضرت یوسفؑ نے اپنے دوسرے بھائی یامین کو ساتھ لانے کی شرط سے مشروط کر دیا

فَاِنۡ لَّمۡ تَاۡتُوۡنِیۡ بِہٖ (12:60) اب ذرا سا تاکید کے ساتھ' سختی کے ساتھ کہا اگر یہ چیز تم نے نہ کی فَلَا کَیۡلَ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ وَلَا تَقۡرَبُوۡنِ (12:60) دو چیزیں تھیں کہ وزن بھی پورا دیتا ہوں' مہمان نوازی بھی کرتا ہوں' اگر تم اس کو ساتھ نہ لائے تو نہ غلہ ملے گا نہ میں تمہیں قریب آنے دوں گا۔ قَالُوۡا سَنُرَاوِدُ عَنۡہُ اَبَاہُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوۡنَ (12:61) یہ لفظ پہلے آ گیا ہے جو میں نے کہا تھا **رواد** : کسی کو اس کے فیصلے اور ارادے سے پھرا دینا۔ **ارادتو** یہ ہے خود ارادہ کرنا کسی بات کا اور یہ ہے کہ کسی نے جو ارادہ کیا ہوا ہو اس ارادے سے اس کو پھسلا دینا۔ یہ لفظ وہاں آیا تھا جہاں حضرتِ یوسفؑ کو کمرے میں بند کر دیا تھا عزیز مصر کی بیوی نے اور وہاں یہ چیز تھی کہ اس نے بہت چاہا کہ یوسفؑ کو اس کا جو ارادہ تھا DETERMINATION تھا کہ نہیں ! میں اس طرف نہیں آؤں گا' اس کو وہاں اس ارادے سے پھسلانے کی بڑی کوشش کی۔ عزیزانِ من ! عجیب زبان ہے۔ وہ ایک ہی مادہ اس کا ہوتا ہے اس کے اوپر جا کے جب ذرا سے باب بدلتے ہیں تو معنی عجیب و غریب اس کے ہو جاتے ہیں۔ یہاں بھی انہوں نے یہ کہا ہے کہ امید تو نہیں پڑتی۔

باپ کے مقابلے میں شریکانہ حربے کا پروگرام

ارادہ اس کا ہم جانتے ہیں فیصلہ اس کا جانتے ہیں' پہلا بیٹا کھونے کے بعد وہ اس بیٹے کو تو نہیں جدا کرنے کا' ہم کوشش کریں گے کہ اس کو اس کے ارادے سے پھسلا سکیں۔ اور اس کے بعد کہا وَ اِنَّا لَفٰعِلُوۡنَ (12:61) گھبراؤ نہیں ! ہم یہ کر سکتے ہیں۔ اندازہ لگائیے باپ کے مقابلے میں بیٹا آگے ہے۔ ٹھیک ہے رضا مندی سے نہیں چلے گا تو کھینچ کے لے آئیں گے ہمارا جتھہ ہے' ان کا کیا ہے۔ عزیزانِ من ! یہ اس دور سے بات چلی آ رہی ہے ''ایہنوں شریکا کیندے نیں''۔ وَ قَالَ لِفِتۡیٰنِہِ اجۡعَلُوۡا بِضَاعَتَہُمۡ فِیۡ رِحَالِہِمۡ لَعَلَّہُمۡ یَعۡرِفُوۡنَہَاۤ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَہۡلِہِمۡ (12:62) واہ واہ واہ !! اپنے کام کرنے والوں سے' کارندوں سے کہا بِضَاعَتَہُمۡ (12:62) وہ جوان کی پونجی تھی جو یہ لائے تھے جس کے معاوضے میں یہ دیا ہے' کہا کہ وہ ان کی ان بوریوں میں (کیا بات ہے صاحب ایک نبی کی) اس طرح سے چھپاؤ کہ یہاں نہ ان کو پتہ چلے کہ واپس دیا جا رہا ہے۔ یوں ان کے سامنے احسان ہو جائے گا ' ممکن ہے ان کی نگاہیں اس کو قبول نہ کرنا چاہیں' دکھا کے نہ یہ کرنا ایسا کرنا کہ ایسا چھپانا اور ایسا بھی نہ چھپانا کہ وہ چھپا ہی رہ جائے اس انداز سے چھپانا کہ یہاں تو ان کو معلوم نہ ہو وہاں جا کے اس کو جب وہ کھولیں تو وہ وہاں ان کو مل جائے اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَہۡلِہِمۡ (12:62) گھر والوں کے پاس واپس جائیں وہاں وہ ان کی بوریوں میں سے ان کو مل جائے۔ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ (12:62) میں یہ اس واسطے بھی کرنا چاہتا ہوں' لالچ پہ لالچ دئے چلا جا رہا ہوں کہ اس بھائی کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ اس لئے کہ یہ جو اگلی کڑیاں داستان کی ہیں وہ اسی صورت میں پوری ہوتی ہیں کہ وہ بھائی بھی یہاں آئے ان کے ساتھ۔

غلے کے لالچ کی خاطر چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جانے کے لیے حضرت یعقوبؑ کے ساتھ ان کی گفتگو کا انداز اور پھر آپ کی قوت ایمانی

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓی اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَیْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ (12:63) اب یہ چیز بظاہر بڑی لجاجت سے کہی جا رہی ہے کہ ابا جان! اس نے ہم سے کہہ دیا کہ آئندہ تمہیں غلہ نہیں ملے گا جب تک اپنے بھائی کو نہیں لائیں گے۔ من میں چور پہلے بھائی کے ساتھ جو کچھ کیا ہوا تھا کس طرح سے دلیری سے کہہ سکتے۔ کہا یہی کہ اس نے کہا یہ ہے کہ غلہ نہیں ملے گا یعنی وہ اس کی جو مجبوری ہے وہ بزرگِ خاندان کی' اس نے تو بوڑھے نے سارے گھر کو پالنا ہے' گھر کی پرورش اسی غلے سے ہو سکتی ہے' خود وہ لینے کے لئے جا نہیں سکتے' جانا انہوں نے ہی ہے' اُنؑ کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑتے ہیں کہ انہوں نے کہا ہے کہ غلہ نہیں ملے گا اب آپ سوچ لیجئے۔ دیکھا ! قرآن کا داستان بیان کرنے کا کیا انداز ہے۔ اس نے کہا ہے غلہ نہیں ملے گا اس لئے ہمارے بھائی کو ساتھ بھیج دیجئے **نَكْتَلْ** تاکہ ہم وہاں سے غلہ لائیں۔ اور وہ پھر من کا چور' ضمانت دینے والی بات **وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (12:63) قسم خدا کی ہم ان کی بڑی حفاظت کریں گے۔ جیسی پہلے کی حفاظت کی تھی! اس وقت بھی تو یہ قسمیں اٹھا کے گئے تھے۔ **قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓی اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ** (12:64) اچھا! یہ قسمیں اٹھائی جا رہی ہیں' مجھے یقین دلایا جا رہا ہے کہ میں اسی طرح سے تمہاری ان قسموں پہ اعتبار کر لوں تمہاری ضمانت کو قبول کر لوں جیسا اس سے پیشتر وہ اس کے بھائی کے معاملے میں' میں نے کیا تھا' یہی بات ہے۔ خیر۔ **فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا ؕ** (12:64) خدا ہی بہتر نگہبان ہے' تم کہتے ہو ہم اس کی حفاظت کریں گے اس کو یہیں رہنے دو اللہ کی حفاظت میں' میں تمہاری حفاظت میں نہیں دینا چاہتا **وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ** (12:64) غلہ نہ ملنے کی تم بات کہہ رہے ہو ٹھیک ہے سوچیں گے وہ بہت **اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ** ہے کوئی اور راستہ اس کے لئے نکلے گا' نکال لیں گے' سوچ لیں گے لیکن حفاظت میں اس کو خدا ہی کی میں رہنے دو۔ **وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَیْهِمْ ؕ** (12:65) کس قدر خوبصورت الفاظ ہیں! یہ باتیں انہوں نے آتے ہی کیں سب سے پہلے یہی بات کی' ابھی وہ کھولی بھی نہیں تھیں بوریاں۔ دیکھئے! جو انہوں نے ADDITIONAL ARGUMENT جو ہے یہ ہے صاحب! انداز بیان کرنے کا' پوچھئے آج کسی لکھنے والے سے وہ اس کو APPRECIATE کر سکتا ہے' پہلے آتے ہی جو چیزیں انہوں نے کہی ہیں وہ صرف یہ کہ غلہ اس صورت میں ملے گا کہ اس کو بھیج دیجئے' نہیں بھیجیں گے تو غلہ نہیں ملے گا۔ اتنے کے اوپر نظر آیا ہے کہ وہ کارگر نہیں ہوئی دلیل' کوئی زیادہ محکم نہیں ہوئی' اطمینان بخش نہیں ہوئی۔ اب اگر یہ سارے ترکش کے تیر پہلے ہی سے چلاتے تو اس کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا۔ وہ یہ بات جو ہے یعنی وہ اتفاقاً سہی' کیونکہ انہیں تو پتہ نہیں کہ بوریوں میں کیا ہے لیکن بات کا انداز یوں چلا آ رہا ہے کہ پہلے اتنی سی بات ہی تھی اور انہوں نے انکار کیا تو خیر۔ انہوں نے کہا کہ اچھا چلو بھئی یہ غلہ تو کھولو۔ **وَ لَمَّا فَتَحُوْا**

مَتَاعَهُمْ (12:65) جب انہوں نے اسے کھولا وَ جَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ (12:65) عزیزانِ من! دینے والا اس انداز سے دیتا ہے اور اس کا پونجی اور سرمایہ بھی لوٹا دیتا ہے۔ کھولا انہوں نے تو اس میں اپنے چھپے ہوئے سرمایے کو بھی پایا رُدَّتْ اِلَيْهِمْ (12:65) جو اس نے واپس کر دیا تھا۔ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ (12:65) ارے ابا جان! دیکھو۔ آ گیا دوسرا ADDITIONAL ARGUMENT۔

قرآن حکیم کا انداز بیان اگر بے مثل ہے تو اس کا انداز ترتیب بھی لاجواب ہے

میں نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں جن اہلِ بلاغت نے یہ کہا ہے کہ صرف بلاغت اور فصاحت کے اعتبار سے بھی قرآن کا جواب نہیں' ہم تو یہ مانتے ہیں کہ قرآن ہدایت کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ واقعی یہ اپنے اندازِ بیان کے اعتبار سے بھی بے نظیر ہے اور یہ بھی ہے کہ اس کے متعلق بڑی بڑی کوششیں کی گئیں کہ یہ اندازِ بیان ہی ہے۔ اور عربوں کے ہاں تو آپ پوچھتے ہیں' لکھنے والے ان کے ہاں تو بلا کے کم بخت خطیب تھے اور معری نے یہ رسالۃ الغفران جو لکھا ہے وہ طٰہٰ حسین پوچھئے کیا کچھ اس کے متعلق لکھ رہا ہے کہ کیا انداز ہے اور کہاں تک وہ پہنچا ہوا ہے' (معاذ اللہ) وہ تو مثل قرار دیتا ہے لیکن خود معری کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ نہیں صاحب! اما تو چیزے دیگری۔ اور وہ سامنے آتا ہے رسالہ تو نظر آ جاتا ہے کہ قرآن کا انداز کیا ہے یعنی اس کے اندازِ بیان کی بھی یہ صورت ہے۔ اور پھر جس نہج سے ترتیب سے یہ آپ کے سامنے ایک داستان آ رہی ہے اس میں آپ دیکھتے ہیں کہ اس کا کیا انداز ہے۔ پیش کرنے کا یہ انداز ابا جان! دیکھئے مَا نَبْغِيْ (12:65) کہو! اس کے بعد اور کیا چاہئے اور کیا ہم خواہش کر سکتے ہیں!! غلہ مل رہا ہے ساتھ اس کے پونجی بھی واپس مل رہی ہے' ابا جان! مَا نَبْغِيْ اس کے بعد اور کیا چاہئے۔ سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر۔ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ط (12:65) یہ تو غلہ آپ دیکھ رہے ہیں' یہ پونجی بھی اس کے ساتھ مل رہی ہے۔ اب درمیان کا ٹکڑا قرآن نے نہیں دیا' وہی SUGGESTIVENESS۔ اگلی بات یہ ہوگی کہ جو ہم نے عرض کیا ہے جو شرط انہوں نے لگائی ہے' اسے پورا کر لیجئے۔ وَ نَمِيْرُ اَهْلَنَا ط (12:65) اپنے گھر والوں کے لئے غلہ لائیں گے وَ نَحْفَظُ اَخَانَا (12:65) بھائی کی حفاظت کریں گے وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ط (12:65) اس کے حصہ کا جو ہے وہ ہمیں اور ملے گا۔ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ (12:65) یہ جو غلہ لائے ہیں یہ تو تھوڑا ہے جلدی ختم ہو جائے گا تو جلدی جانا چاہئے اور غلہ بھی لانا چاہئے۔ اس کو ساتھ لے جاتے ہیں اس کا حصہ بھی ہم لائیں گے اور پھر دیکھئے وہ تو پونجی بھی واپس کر دیتا ہے۔ کتنے ARGUMENT چلے آ رہے ہیں وہ جو چیز کہی تھی کہ ہم اسے اس کے ارادے سے پھسلا دیں گے اس کے لئے قرآن یہ دلائل دئے چلا جا رہا ہے۔ اس کا جواب باپ کی طرف سے کیا آیا یہ اگلے درس پہ ہم اٹھا رکھتے ہیں۔ سورۃ یوسف کی آیت 65 تک ہم آ گئے 66 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

ساتواں باب: **سورۃ یوسف** (آیات 66 تا 82)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1974ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یوسف کی آیت 66 سے ہو رہا ہے (12:66)۔

جیسا کہ آپ کو اب معلوم ہے اس سورۃ میں حضرتِ یوسفؑ کی داستانِ جلیلہ مسلسل چلی آ رہی ہے۔ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ حضرتِ یوسفؑ کے بھائی غلہ لینے کے لئے آئے' غلہ لے کے چلے گئے۔ آپؑ نے ان کی پونجی بھی ان کی بوریوں میں بند کر دی۔ گھر گئے اس میں سے وہ غلہ بھی ملا اور ساتھ ہی پونجی بھی واپس ملی۔ حضرتِ یوسفؑ نے ان سے یہ کہہ دیا تھا کہ اگلی دفعہ آنا تو اپنے اس بھائی کو بھی ساتھ لانا جسے تم چھوڑ آئے تھے۔ اب انہیں یہ معلوم تھا کہ پہلے ہی حضرتِ یوسفؑ کی جدائی میں باپ کی کیا حالت ہو رہی ہے اور پھر باپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان بھائیوں نے ہی یہ سب کچھ ان کے ساتھ کیا تھا اس لئے یہ اس باب میں بڑے مذبذب تھے کہ غالباً باپ اس کی اجازت نہیں دے گا۔ تو انہوں نے آ کے باپ سے کہا کہ بات صاف ہے' ہم گئے ہیں' یہ غلہ مل گیا ہے' غلہ اتنا تو ہے نہیں کہ جب تک یہ قحط ہے یہ اکتفا کر جائے گا۔ اور غلہ لینے جانا ہے اور وہاں یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ اس بھائی کو بھی ہم ساتھ لے جائیں۔ اور پھر کہا کہ وہ دیکھئے! کس قدر حسنِ سلوک ہے اس عزیز مصر کا یا وہاں کے صاحبِ اقتدار کا۔ انہیں یہ تو معلوم نہیں تھا کہ وہ یوسفؑ ہیں۔ غلہ دیا ہے اور ساتھ ہی پونجی بھی واپس دے دی ہے۔ اب اگر یہ بھائی ساتھ نہ گیا' غلہ بھی نہیں ملے گا اور ساتھ جائے گا تو اس کے حصے کا بھی تو غلہ ہمیں مل جائے گا اور پھر یہی حسنِ سلوک کا ارادہ انہوں نے کیا تو پونجی بھی ساتھ آ جائے گی۔ اس لئے اسے ہمارے ساتھ ضرور بھیج دیجئے۔ پہلے حضرتِ یعقوبؑ کہتے رہے کہ میں تمہاری باتوں پہ کیسے اعتبار کر لوں' پہلے بھی تم نے اسی قسم کی پرفریب باتیں کی تھیں اور اس کے بعد وہ کچھ کیا جس کا داغ مستقل طور پہ میرے جگر پر ہے۔ لیکن جب یہ دلائل سامنے آئے یہ بات سامنے آئی تو انہوںؑ نے کہا کہ اچھا! لے جاؤ لیکن قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ (12:66) اسی صورت میں' میں اب اجازت دیتا ہوں کہ تم پھر خدا کو درمیان میں لا کر اس بات کا پکا عہد کرو کہ تم اسے ضرور واپس لے آؤ گے' ہاں یہ اور بات ہے کہ تم تمام کے تمام کہیں دھر لئے جاؤ تو پھر تو یہ صورت ہی نہیں ہے کہ تم اسے واپس لا سکو۔

حضرت یعقوبؑ کی کشادہ ظرفی اور بلند نگہی

اب دیکھتے ہیں خود ہی کس طرح سے اس میں استثنا پیدا کر دی' EXCEPTION پیدا کر دی کہ جو چیز ان کے بھی اختیار میں نہیں ہو گی اس پہ ان سے عہد لینا بے معنی چیز ہے' زیادتی کی چیز ہے' زبردستی وہ تو عہد شکنی ہو جائے گی۔ دیکھئے! کتنی احتیاط برتی جا رہی

ہے معاہدے کے اندر۔ازخود اس چیز کو داخل کر رہے ہیں حالانکہ یہ چیز ان کی طرف سے آنی چاہئے تھی کہ عہد تو ہم دیتے ہیں لیکن اگر ایسی صورت ہوگئی کہ سارے کے سارے ہم کہیں گھر گئے تو پھر تو اس کو واپس لانے کا سوال نہیں پیدا ہوگا۔انہوں نے نہیں کہا' اِنہوںؑ نے خود ہی اس عہد نامے کے اندر ازخود یہ شرط عائد کردی۔تو آپ دیکھتے ہیں کہ جو شخص REASONABLE ہے' معاملات کو کشادہ نگہی سے دیکھتا ہے' وہ معاہدہ بھی دوسرے کے ساتھ کرتا ہے تو اس انداز کا کہ اس کی مجبوریوں کو پہلے ذہن میں رکھتا ہے اور پھر اس قسم کی شرائط عائد کرتا ہے۔یہ ارباب سیرت و کردار جو تھے ان کی کیفیت یہ تھی۔یہ سوال صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ خدا کی طرف سے وحی آئی اور لوگوں تک پہنچا دیا یہ بڑی بلند سیرت کے' کشادہ نگہی کے' وسیع الظرف انسان ہوتے تھے۔ان کا کردار بڑا بلند' ان کی سیرت بڑی پاکیزہ ہوتی تھی۔اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں اور ان میں ان کی جھلک اور چمک نظر آجاتی ہے۔**فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ** (12:66) جب انہوں نے عہد نامہ بھی یہ دے دیا وعدہ کرلیا خدا کو درمیان لا کے اور آخر میں یہ کہا کہ یہ سب کچھ ہوگیا لیکن اس کے باوجود ٹھیک ہے۔نگہبانی تو اسی کی ہوسکتی ہے' اس کی نگہبانی میں میں تمہیں دیتا ہوں۔

شہر کے اندر داخل ہونے کے لیے باپ کی طرف سے ایک ضروری ہدایت

ایک بات یاد رکھنا **وَ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ** (12:67) کہا کہ ایک احتیاطی تدبیر ہے اور وہ یہ کہ وہاں جانا تو یہ پورے کا پورا جتھہ ایک ہی دروازے سے شہر کے اندر داخل نہ ہونا۔پرانے زمانے کے شہر اب بھی ہمارے سامنے ہیں۔لاہور کو WALLED CITY کہتے ہیں۔شہر کے گرد فصیل ہوتی تھی اور کہیں ایک آدھ دروازہ ہوتا تھا یا دو چار دروازے ہوتے تھے۔انہی میں سے آنے جانے والے گذرتے تھے۔حفاظت کا یہ سامان اس زمانے میں ہوتا تھا۔کہا کہ سارے کے سارے ایک دروازے سے نہ گذرنا' وہاں جانا بکھر جانا' دو دو چار چار کر کے مختلف دروازوں سے شہر کے اندر آنا۔یہ ایک احتیاطی تدبیر تھی۔واقعی باہر سے اجنبی وہ پورے کا پورا گروہ ایک ہی قسم کا' جتھے کی شکل میں اگر جا رہا ہے' ہر ایک کی نگاہیں ان کی طرف اٹھیں گی کہ یہ کون لوگ آ گئے کہاں سے آ گئے۔چہ میگوئیاں شروع ہوجائیں گی' اس لئے انہوں نے احتیاطی تدبیر برتی کہا کہ یہ کرنا۔اور ساتھ ہی پھر نگاہ اس پہ بھی گئی کہ یہ حفاظتی تدبیر تو بہرحال میرا ایک قیاس ہے' ایک اندازہ ہے معلوم نہیں کہ وہاں ON THE SPOT (برسرِ زمیں) جسے کہتے ہیں وہ کیا واقعات پیش آئیں کس قسم کی وہاں SITUATION ہو تو اس کو تو میں قبل از وقت نہیں دیکھ سکتا کہ میں ان سے کہہ دوں کہ ہاں! جو میں نے کہہ دیا بس اتنی سی حفاظتی تدبیر برت لوگے تو پھر بالکل محفوظ رہوگے' کہا' یہ نہیں' یہ میں نے ایک احتیاطی تدبیر تم سے یہ کہی ہے۔وہاں کیا صورت پیش آئے اسے تو تم نے دیکھنا کہ قوانینِ خداوندی کا تقاضا کیا ہے۔

آنے والے واقعات کے متعلق غیب کا علم صرف ذاتِ خداوندی کو ہے

اب یہاں قوانینِ خداوندی آپ دیکھ رہے ہیں کہ اقدار و اخلاق کی بات نہیں ہے بلکہ حادثات اور واقعات جن قوانین کے تابع سرزد ہوتے ہیں' ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی تو' جیسا میں نے کہا تھا' یہ قوانینِ خداوندی ہوتے ہیں طبعی دنیا میں بھی۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی اسی کے قوانین کے تابع ہوتا ہے۔ اس لئے جب بھی قانونِ خداوندی کہا جائے گا تو ہمیشہ ذہن میں رکھئے کہ وہ صرف وہی نہیں کہ جو وحی کے ذریعے سے اس نے انسانی دنیا کی اخلاق و اقدار کے لئے دے دئے ہیں بلکہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی اسی کے قوانین کے تابع ہو رہا ہے۔ ان قوانین کی احتیاط' نگہ داشت' یہ بھی نہایت ضروری ہے وہ بھی اتباعِ قوانینِ خداوندی ہیں۔ ان کا دائرہ اس طبعی کائنات تک ہے لیکن بہرحال ہیں وہ خدا ہی کے قوانین اور ان کا اتباع بھی اس طبعی دنیا کی زندگی بسر کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کہا یہ کہ وَ مَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ ط (12:67) اس لئے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط (12:67) یہ نہیں کہ جتنے بھی معاملات آنے والے ہیں وہاں جو کچھ بھی واقع ہوگا' ان سب کے متعلق میں تمہیں بتا دوں گا کہ ایسا ہوگا تو یہ کرنا' ایسا ہوگا تو یہ کرنا' یہ سوال نہیں ہے' غیب کا علم مجھے نہیں ہے۔ اب یہاں سے یہ بات بھی نظر آ گئی کہ قرآنِ کریم بالتصریح یہ چیز واضح کرتا ہے کہ غیب کا علم یعنی مستقبل کا علم' آنے والے واقعات کا علم' خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اس نے خود یہ استثنا کی کہ ان میں سے جو بات ہم اپنے رسولوں میں سے کسی کو بتانا چاہیں وحی کے ذریعے بتاتے ہیں۔ تو گویا غیب کے علم یا مستقبل کے متعلق کچھ کہنا جسے آپ پیش گوئی کہتے ہیں قرآن کی نصِ صریح کی رو سے خدا کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی کو یہ علم دیتا ہے یا دیتا تھا' وہ رسول کو دیتا تھا اور وہ وحی کے ذریعے ملتا تھا یعنی رسول کو اگر وحی کے ذریعے یہ علم نہ ملے کوئی تو رسول کو بھی یہ علم نہیں ہوتا تھا۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ یہ جسے آپ FUTURE (مستقبل) کہتے ہیں یہ جتنی کائنات کی چیزیں ہیں جو خدا کے لگے بندھے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے پہ مجبور ہیں' جنہیں کوئی اختیار نہیں' ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا یا اپنی مرضی سے کچھ کرنے کا' اس کے متعلق ان چیزوں کے متعلق تو آپ حسابی قاعدے کے مطابق کہہ سکتے ہیں کہ سورج کو گرہن سو سال کے بعد اتنے منٹ اتنے سیکنڈ پہ لگے گا اور اتنے وقت تک رہے گا۔ کیونکہ وہ قوانین کی اطاعت پہ مجبور ہے اس میں سرکشی نہیں برت سکتا اس لئے اس حسابی قاعدے میں یعنی قانونِ خداوندی کو سمجھنے کے بعد اس کی روشنی میں جس نتیجے پہ انسان پہنچتا ہے۔ اگر یہ قاعدہ صحیح ہے اگر یہ CALCULATION صحیح ہے پھر اس کے مطابق یقیناً ہوتا ہے۔

انسانی علم ہمیشہ قانونِ خداوندی کے سہارے کا محتاج رہے گا

یہ مستقبل کی خبر نہیں ہے یہ اس کے قانون کی رو سے جو کچھ ہونا ہے اس کا علم ہے وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا (2:31) آدمی

میں اس کی استعداد دے دی گئی ہے کہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کرے۔ اور جب یہ علم حاصل کر لے گا تو پھر سارے ملائکہ اس کے سامنے جھک جائیں گے۔ غیب کا علم ان کے متعلق ہے کہ جن کو کچھ اپنا ارادہ دیا گیا ہے' وہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کر سکتے ہیں۔ یہ جو چیز ہے اسے کہا گیا ہے غیب کا علم ۔ وہ جو میں نے ایک دفعہ آپ کو مثال دی تھی وہ بہت بڑا سائنٹسٹ ہے سلیون "THE LIMITATIONS OF SCIENCE" وہ بڑی دلچسپ مثال دیتا ہے۔ کہنے لگے کہ صاحبِ اختیار کے متعلق قبل از وقت کہنا پیش گوئی کرنا ناممکن ہے' بڑے بڑے سائنٹسٹ آئن سٹائن جیسے بھی ایک میز کے گرد بیٹھے ہوں وہ سورج اور چاند کی حرکات کے متعلق تو آپ کو EXACTLY بتا دیں گے کہ کیا کچھ ہونا' ان قاعدوں کے مطابق ان کی CALCULATION بالکل صحیح نکلے گی لیکن اگر میز پہ آ کر کوئی مکھی بیٹھ جائے تو وہ پورے کے پورے' پوری کوشش محنت کر کے بھی نہیں بتا سکیں گے کہ یہاں سے اڑ کے یہ کہاں بیٹھے گی۔ اس لئے کہ سورج اور چاند کو یہ اختیار نہیں کہ جب اور جس وقت جی چاہے وہ طلوع ہوں' جس طرح سے جی چاہے اپنا سفر کاٹیں' جب جی چاہے غروب ہوں۔ مکھی کو اتنا اختیار ہے کہ کہیں سے اڑے تو جہاں جی چاہے بیٹھے۔

غیب کے علم کا دعویٰ نبوت کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے

جس معاملے میں جی چاہے آ جائے اس کے متعلق تو ایک پورا گروہ سائنٹسٹ کا نہیں بتا سکتا۔ تو اس کے بعد اس نے کہا کہ سوچئے تو سہی مکھی کے اڑنے کے بعد کہ اسی میز پہ کہاں بیٹھے گی درجن بھر سائنٹسٹ نہیں بتا سکتے۔ انسان کے متعلق یہ کل کیا کرے گا کون بتا سکتا ہے۔ اور یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ تھا جس میں اس نے کہا ہے کہ کوئی نفس نہیں جانتا مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا (31:34) کہ وہ کل کیا کرے گا' نہیں کہہ سکتا کہ کہاں موت میری واقع ہوگی۔ یہ جو پیش گوئیوں کے مدعی آپ کو یہ ملتے ہیں اگر قرآن کے نقطۂ نگاہ سے بات کی جائے یہ دعویٰ یا تو رسالت کا ہوگا کیونکہ خدا نے کہا ہے کہ صرف رسول کو وحی کے ذریعے ہم یہ بتاتے تھے۔ از خود رسول بشری حیثیت سے بھی یہ علم نہیں رکھتا تھا۔ اور اگر یہ چیز نہیں ہے تو پھر یہ بات بالکل کذب ہے افترا ہے۔ بہت بڑا دعویٰ ہے' خدا یہ کہتا ہے کہ کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ نہیں! ہم جانتے ہیں بتاتے ہیں تمہیں کہ سو برس کے بعد کیا ہونے والا ہے' چیلنج دے رہا ہے خدا کے اس حکم کو۔ قرآن کے ماننے والا کوئی ایسی بات نہیں کہتا۔ باقی رہا یہ کہ صاحب! یہ منجم یہ کچھ بتا دیتے ہیں یہ کچھ وہ ایسی ایسی پیش گوئیاں کر دیتے ہیں یعنی ہم دین کے نقطۂ نگاہ سے نہیں کہہ رہے' قیاس آرائیاں ہیں' قیافہ شناسیاں ہیں۔ یہ جو قطعی طور پہ یہ کہنا ہے اور یہ کہنا کہ خدا کی طرف سے علم پا کر مستقبل کے متعلق کچھ کہنا بہ نصِ صریح سارے قرآن میں کہیں استثنا ہی نہیں ہے اس کی' وہ کہا ہے کہ صرف رسول کو وحی کے ذریعے سے تو کچھ بتاتے تھے کسی اور کو نہیں' انبیائے کرامؑ کی بھی یہ کیفیت ہے وہ کل کے متعلق نہیں جان سکتے۔

حضرتِ یعقوبؑ نے بیٹے کے غم میں رو رو کے آنکھیں سفید کرلیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ بیٹا زندہ ہے اور کہاں ہے۔ وحی کی رو سے قیامت تک کی خبریں دینے والا نبی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا بیٹا کہاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار نبی اپنی منصبِ رسالت یا نبوت' خدا کی طرف سے وحی پانے اور اپنی بشریت میں قدم قدم پہ امتیاز کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں صرف انسان کی بصیرت اور فراست کام کرتی ہے جیسے اور انسانوں کی کرسکتی ہے۔

وحی کے علم اور انسانی فراست میں بنیادی فرق ہے

کہا کہ یاد رکھئے! میں نے حفاظتی تدبیر تو تم سے یہ کہی ہے لیکن یہ کوئی غیب کی بات نہیں جو میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ میں حاوی ہوجاؤں ان چیزوں کے اوپر۔ یہ جو چیز ہے اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ (12:67) یہ فیصلے جو ہیں یہ تو اس کے ان قوانین کی رو سے ہوتے ہیں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ۚ (12:67) میں بھی اس کے قوانین کے اوپر ہی بھروسہ کرتا ہوں تم بھی وہاں جو واقعات پیش آئیں فوراً وہاں عقل وفکر سے' تدبر سے' فراست سے دیکھ لینا کہ کیا بات پیش آ رہی ہے اور خدا کے طبعی قوانین کی رو سے تمہیں کیا کرنا چاہئے۔ میں بھی یہ کرتا ہوں وَ عَلَیۡہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ (12:67) اور جو بھی ان قوانین کے اوپر بھروسہ کرنا جانتے ہیں وہ بھی انہی کے اوپر بھروسہ کرتے ہیں۔ اب یہ ہوگئی کہ ایک تو علمِ غیب کی بات نہیں ہے' دوسرے یہ کہ وہاں یونہی بدھو بن کے نہ چلے جاؤ۔ کسی چیز پہ بھروسہ کرنے کے لئے اس چیز کے قانون کا علم ہونا ضروری ہے۔

کسی چیز پر توکل کرنے سے پہلے قانون خداوندی کا علم ہونا ضروری ہے

یہ چیز کہ آگ پہ پانی رکھنے سے اتنے منٹ میں کھولتا ہے یہ بھروسہ ہے اس چیز کا کہ اتنے منٹ میں میں تمہیں چائے دے دوں گا اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے۔ یہ اعتماد کیسے حاصل ہوا؟ تجربے نے یہ بتایا کہ اتنے منٹ کے بعد پانی کھولنے لگ جاتا ہے۔ تو توکل کے لئے قانون کا علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ جہاز سے کودنے والے چھتری باز کو اگر چھتری کھولنے کا علم نہیں آتا تو وہ اس چھتری پہ بھروسہ نہیں کرسکتا۔ چھتری پہ بھروسہ کرنے کے لئے چھتری کھولنے کا علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے جسے خدا پر توکل کہتے ہیں' اس توکل کے لئے خدا کے قوانین کا علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ اور یہ جو بیٹھے ہوتے ہیں اللہ توکل وہ پہلے سے عقیدت مندوں کا ایک گروہ ہوتا ہے جنہوں نے پکی پکائی لانی ہوتی ہے۔ وہ نہ گروہ یا ان کو نہ آنے دیجئے' پھر ہم دیکھتے ہیں یہ توکل کہاں جاتا ہے۔ توکل یہ ہے کہ خدا کے قوانین اٹل ہیں ان کے مطابق نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ان قوانین کا پورا پورا علم ہونا' صحیح CALCULATION ہونا اور جب یہ ہوجائے تو پھر جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے پھر اتنا بڑا بھروسہ ہے کہ یہاں سے اڑ کے چاند پہ بھی جاسکتا ہے اور وہاں سے واپس بھی

انسان آ سکتا ہے۔ کتنے بڑے عزم وتوکل کے ساتھ انسان جاتا ہے! عزیزانِ من! اسے توکل کہتے ہیں۔خدا کے قوانین کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد' یہ ہے توکل۔اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے ان قوانین کا علم ہونا نہایت ضروری ہے وَ عَلَیۡہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ o وَ لَمَّا دَخَلُوۡا مِنۡ حَیۡثُ اَمَرَهُمۡ اَبُوۡهُمۡ ؕ (12:67-68) داخل تو وہ اسی طرح سے ہوئے جیسا کہ ان کے باپ نے کہا تھا۔اب ایک واقعہ آنے والا ہے کہ جس میں یہی بچہ' یہی ان کا بھائی' یہی یعقوبؑ کا بیٹا جسے بھیجنے میں وہ اتنے متامل تھے' جس کے لئے اتنی تاکیدیں کی ہوئی تھیں' آگے چل کے ایک واقعہ آتا ہے کہ وہ یہاں روک لیا گیا۔تو کہا کہ وہ حفاظتی تدبیر تو ساری کر لی مَا کَانَ یُغۡنِیۡ عَنۡهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ (12:68) لیکن مستقبل کا تو ایسا نہیں تھا اس لئے اس سے کوئی چیز ان کو بھی مستغنی نہیں کر سکی۔

وحی خداوندی کسی خلش کو دل و دماغ میں باقی رہنے ہی نہیں دیتی

یہ بات جو انہوں نے کہی تھی' کیا تھا؟ اِلَّا حَاجَةً فِیۡ نَفۡسِ یَعۡقُوۡبَ قَضٰىهَا (12:68) اس کے دل میں ایک خلش پیدا ہوئی تھی اس نے اتنی خلش نکال دی تھی بس اتنا کیا تھا۔آ ہاہا!!! قرآن کس طرح مقامِ نبوتؐ کو نکھارتا' ابھارتا چلا جاتا ہے بشریت سے الگ کرتا ہوا' بشریت کی دنیا کے اندر ان کو ایک عام بشر کی حیثیت سے پیش کرتا ہوا۔اِلَّا حَاجَةً فِیۡ نَفۡسِ یَعۡقُوۡبَ قَضٰىهَا (12:68) دل میں ایک کھٹکا اور خلش سی پیدا ہوئی وہ خلش انہوں نے نکال لی اپنے یہ کہنے سے' وہ جو آنے والے واقعات تھے ان کا تو ان کو علم نہیں تھا کہ قبل از وقت اس کی بھی تدبیریں بتا دیتے اور اس طرح سے محکم طور پر ان تمام سے اپنی حفاظت کا اور بچوں کی حفاظت کا سامان کر دیتے۔ خلش پیدا ہوئی پوری کر لی ٹھیک ہے مَا کَانَ یُغۡنِیۡ عَنۡهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ (12:68) آنے والے واقعات جو تھے ان کے اوپر وہ حاوی نہیں ہو سکتے۔یہ بھی جو خلش کے مطابق انہوں نے کہا ہے اور بڑی چیز ہے وَ اِنَّهٗ لَذُوۡ عِلۡمٍ لِّمَا عَلَّمۡنٰهُ (12:68) یہ جو حفاظتی تدبیر تھی۔

تعلیمات قرآنی کے دوران جن باتوں کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے' اس سے مراد خدا کا قانون ہوتا ہے

اب یہاں دیکھئے پھر ہمارے ہاں کی وہی غلطی آ جاتی ہے۔یہاں قرآن میں یہ آیا کہ ہم نے جو ان کو علم دیا تھا جھٹ سے انہوں نے کہا کہ وحی کا علم ہے۔تو میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کے وہ مقامات جہاں کسی فعل کو' کسی کام کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم نے ایسا کیا' وہ مقامات بڑے غور طلب ہوتے ہیں بس سطحی طور پہ تو ہر چیز اس کی طرف ہم منسوب کرتے چلے جاتے ہیں' پہلے یہ مشکلات اپنے سامنے خود عائد کر لیتے ہیں پھر ان کا حل ڈھونڈنے نکلتے ہیں' حل ملتا نہیں۔خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ (2:7) ''خدا نے ان کے دلوں پر مہر کر دی'' یہ تو کر لیا اپنے ہاں ترجمہ' یہ بات سمجھ لی کفار کے متعلق۔سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ

لَايُـؤْمِـنُـوْن َ(2:6) برابر ہے‘ان کے لئے ان کو تم آگاہ کرو اس تعلیم سے‘ ڈراؤنہ ڈراؤ صاحب! وہ تو بالکل نہیں مانیں گے‘ کیوں؟ **خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** (2:7)۔اب یہ کر دیا‘ ترجمہ یہ سمجھ لیا مفہوم‘ اب بیٹھے گتھی سلجھانے کے لئے کہ پھر یہ جہنم کیوں۔

دلوں پر مہر لگا دینے والی آیات کو صحیح طور پر سمجھنا ہوگا‘ یہ بڑا غور طلب معاملہ ہے

یعنی جب یہ صورت ہے کہ دلوں پہ خود ہی مہر کر دی۔ یہ ضمناً آپ دیکھئے یہ **خَتَمَ**(2:7) جو VERB ہے یہ فعل ہے یہ وہی خاتم والی بات جو ہے‘ ختم کے معنی ہی ہیں مہر اوپر سے لگا دینا **خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** (2:7)۔میں نے عرض کیا ہے کہ یہ مقامات بڑے غور طلب ہوتے ہیں جہاں اس میں ہم نے سطحی طور پہ از خود یہ معنی کئے‘ اب مشکلات حائل ہوئیں کہ صاحب! اسی نے اگر مہر لگا دی دلوں کے اوپر اور پھر یہ کہہ دیا کہ ان کو سمجھانا نہ سمجھانا یکساں ہے‘ یہ تو جہنم کے لئے ہی ہیں‘ جہنم میں جائیں گے‘ خود ہی مہر لگا دی اور اس کے بعد کہا کہ یہ جہنمی ہیں۔اور یہ انبیا کرامؑ کا بھیجنا‘ ان کی رشد وہدایت‘ لوگوں کو تاکید کہ یہ سنو‘ ان پہ عمل کرو‘ پھر وہ حساب کتاب‘ قیامت‘ میزان وہ سارا کچھ سننا‘ نیکی‘ بدی‘ جنت‘ سارے کا سارا قصہ ختم ہو جاتا اگر اسی نے مہر لگا دی ہے اور یہ سمجھنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ جس میں ارادہ ہی نہیں اپنا دیا گیا اس پہ مواخذہ کا ہے کا؟ جیسا میں کہا کرتا ہوں کبھی کسی نے شیر کو بھی پھانسی پہ لٹکایا ہے کہ صاحب! اس نے اتنے قتل کر دئے ہیں۔ یہ مقام بڑے غور طلب اور فکر طلب ہوتے ہیں۔تو بہر حال ہم تو اپنے درس میں ان مقامات کو حل کرتے چلے جاتے ہیں۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ جہاں بھی یہ چیزیں آئیں یہ نہ کہئے کہ خدا نے از خود یہ کر دیا۔ یہ جو ہے **علمنٰہ** جو علم ہم نے ان کو دیا تھا یہ وحی کا علم نہیں ہے۔میں نے پچھلی دفعہ بھی اس کے لئے مثالیں دی تھیں **عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ** (96:5) ہم نے انسان کو سکھایا جو یہ نہیں جانتا تھا **عَلَّمَهُ الْبَيَانَ** (55:4) ہم نے اس کو بولنا سکھایا **عَلَّمَ بِالْقَلَمِ** (96:4) ہم نے اس کو لکھنا سکھایا۔سیدھی سی بات ہے کہ اللہ میاں نے تو کوئی مدرسہ نہیں کھولا ہوا اور پھر مدرسے میں بھی یہ نہیں ہے کہ کوئی اور ٹیچر بتائیں‘ وہ کہتا ہے ہم نے یہ سکھایا ہے‘ کبھی کسی نے دیکھا ہے کہ وہ بیٹھ کے بچے کو تختی پہ لکھنا سکھا رہا ہو یہ الف ب ت۔کیا چیزیں ہیں؟ سورۃ مائدہ میں ہے کہ تم یہ شکاری جانوروں کا پکڑا ہوا گوشت تم کھاؤ‘ یہ شکاری کتوں کے ذریعے سے جو تم شکار کرتے ہو وہ شکار کرنا جو ہم نے تمہیں سکھایا ہے‘ شکاری کتوں کے سدھانے کے متعلق بھی وہ یہ چیز کہتا ہے(5:4)۔تو یاد رکھئے! جتنی چیزیں یہاں قانونِ خداوندی کے مطابق کی جاتی ہیں ان کو وہ اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے اگر وہ یہ کہے کہ پانی کو جب تم آگ پہ رکھتے ہو‘ ہم کھولاتے ہیں صحیح بات ہے۔لیکن صحیح اس طرح سے ہے کہ ہم نے آگ میں یہ خصوصیت رکھ ری ہے کہ وہ اس طرح سے اتنے وقت کے اندر پانی کو کھولا سکتی ہے‘ ہم نے یہ خصوصیت رکھ دی ہے۔ یہ چیزیں ہیں‘ وہاں ہمیشہ یہ دیکھو کہ خدا کے کن قوانین کے تابع یہ چیز ہوتی ہے اس کے مطابق مفہوم لو۔

جہنم میں جانے والوں کی صورت حال اور اس کی وجہ جواز

جب یہ کہ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (2:7) دوسری جگہ کہہ دیا گیا وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (7:179) یہ اکثریت تم دیکھو گے ان کے لوگوں کی کہ وہ نظر آ جاتا ہے ان کی صورتِ حال' زبانِ حال سے پکار رہے ہوتے ہیں کہ یہ جہنم کے انسان ہیں' کونسے ہیں؟ لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا (7:179) ان کے دل ہوتے ہیں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت لئے ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (2:7) خدا کا قانون یہ ہے کہ جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں سے کام نہیں لیتا وہ صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا (7:179) اپنے ارادے سے ہے' ہم نے تو ان کو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت دی تھی اب جو اس سے کام ہی نہیں لیتا ذَرَاْنَا لِجَھَنَّمَ (7:179) یقیناً وہ جہنم کے لئے ہے۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جہاں یہ چیزیں آئیں خدا کی طرف جو منسوب ہوں' وہاں ان مقامات کے ترجمے میں بھی اور اس کا مفہوم لینے میں بڑی احتیاط' فکر' غور اور تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

علامہ پرویزؒ کی کتاب ''کتاب التقدیر'' ان حقائق کو سمجھنے کے لیے ایک بین کتاب ہے

ضمناً عرض کر دوں کہ میں نے ''کتاب التقدیر'' میں اتنا ہی کیا ہے کہ قرآنِ کریم کے جہاں اس قسم کے مقامات آئے ہیں وہاں قرآن ہی کی روشنی میں' میں نے بتایا ہے کہ یہ کونسے قوانین ہیں جن کے تابع خدا کہتا ہے کہ ہم یوں کرتے ہیں۔

حضرت یعقوب نے اپنی بصیریت کے تابع بیٹوں کو ایک تدبیر بتائی تھی

وَ اِنَّہٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰہُ (12:68) اب یہاں اس کا ترجمہ یہ نہیں کہ ہم نے اس کو جو یہ علم دیا تھا وحی کے ذریعے' وہ صاحبِ بصیرت تھا' صاحبِ فراست تھا' اس علم کے ذریعے سے کہ جو ہم نے انسانوں کو دے رکھا ہے۔ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ (2:31) ۔ بات حضرتِ یعقوبؑ کے آدمی ہونے کی حیثیت سے ہو رہی ہے' صاحبِ فراست تھا' اندازہ لگا لیا کہ ایک تدبیر جو تھی وہ کر کے ان کو بتا دیا ساتھ کہہ دیا کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ اس سے مکمل طور پہ تم محفوظ ہو گئے وہاں تمہیں کچھ اور دیکھنے بھالنے' سمجھنے سوچنے' کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ موقع کے اوپر جو بات آئے گی تم وہاں سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنا۔ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (12:68) بات اصل میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ یہ علم بھی نہیں رکھتے' اس لئے وہ اتنی فراست سے بھی کام نہیں لیتے۔ کہاں آ کے کہا لَا یَعْلَمُوْنَ (12:68) وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰٓی اِلَیْہِ اَخَاہُ (12:69)

حضرت یوسف کا اپنے بھائی کو اپنے پاس بلانے کا قصہ اور دوسرے بھائیوں کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار

جب جا کے وہ یوسفؑ کو ملے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے قریب جگہ دی۔ اسے کہہ دیا کہ قَالَ اِنِّیْٓ اَنَا اَخُوْکَ (12:69) میں

تمہارا بھائی یوسفؑ ہوں۔اب یہاں یہ چیز اب دیکھئے قرآن کا انداز۔ بھائی کے دل میں فوراً یہ بات پیدا ہوئی ہوگی کہ انہوں نے یہ کچھ کیا یوسفؑ کے ساتھ' باپ کے ساتھ اور اس وقت یوسفؑ اتنے اقتدارات کا مالک ہے' یہ اسؑ کے قبضے میں ہیں' ان پہ مواخذہ کرنا چاہئے' فوراً روک دیا **فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (12:69) نہ غم نہ کر' جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس پہ دل گرفتہ نہ ہو جانا دوسری چیز یہ ہے کہ ان کی طرف سے ایسا ناامید بھی نہ ہو جانا کہ ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی' اصلاح کی کوشش کریں گے۔کس طرح الفاظ کا انتخاب کرتا ہے !! انتقام پہ وہ اترتا ہے جو یا تو اصلاح کرنا نہیں چاہتا یا جو سمجھتا ہے کہ اس کی اصلاح ہو نہیں سکتی۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ مار مار کے بھرکس نکال دو۔کہا نہ! دل گرفتہ بھی نہ ہو جانا اور ان کی اصلاح کی طرف سے اتنی جلدی مایوس بھی نہ ہو جانا۔درمیان کی کڑیوں کی پھر ضرورت نہیں تھی بیان نہیں کی گئیں۔انہیں غلہ دیا۔**فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ** (12:70) قرآنِ کریم کے سمجھنے میں وہ جو دو چار ذرا سخت مقام آیا کرتے ہیں' یہ ایک اور مقام آ گیا۔بات یہ ہے کہ غلہ بھر دیا گیا ان کی بوریوں میں' وہ بادشاہ کا ایک پیالہ تھا شاہی پیالہ' تو آپ سمجھتے ہیں بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔وہ پیالہ حضرتِ یوسفؑ کا یہ جو بھائی تھا بنیامین اس کا نام تھا' اس کی بوری میں (میں ابھی PASSIVICE استعمال کروں گا اس میں بڑا الائسنس ملتا ہے: وہ قتل کر دیا گیا' جب آپ کہیں گے کہ اس نے اسے قتل کیا تو اس میں تو آپ دیکھتے ہیں کتنی بڑی COMMITMENT ہوتی ہے' قتل کر دیا گیا۔ اور یہ جتنی DIPLOMATIC LANGUAGE ہوتی ہے ابلیسی زبان آپ دیکھیں گے اس میں نوے فیصد PASSIVICE ہوگا: بیان کیا گیا ہے' ذمہ داری کو متعین نہ کرنے کے لئے یہ فریب ہے' جو دیا جاتا ہے' LANGUAGE بڑی فریب ناک ہوتی ہے) یہ پکڑے گئے متعین طور پہ نہیں۔یہ جو چیز ہے میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ قرآن میں یہ نہیں ہے اس لئے کہ بات واضح ہو جائے میں پہلے سے عرض کر دوں میں نے جو اس کا سہارا لیا قرآن میں' رکھ دیا گیا'' نہیں ''رکھ دیا'' ہے۔وہ کٹورہ اس میں رکھ دیا گیا بعد میں ڈھنڈیا پڑی۔یہ بار برداری کا رندوں نے ان کو ٹھہرایا' رکنا رکنا رکنا' **اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ**(12:70) ارے ٹھہرو' رکو بابا رکو' تم تو چور ہو کہیں کے۔یعنی یہ آواز پیچھے سے آ رہی ہے۔کیا محاکات ہیں قرآن کے!! مقام میں نے کہا تھا بڑے سخت ہیں اس میں ACTIVICE ہے فعل معروف جسے کہتے ہیں۔جعل رکھ دیا۔

شاہی کٹورے کی گمشدگی کے بارے ہمارے ہاں ہزار سال سے بیان کیے جانے والے اس قصے کی نوعیت

اب آیئے جو عام ترجمے ہمارے ہاں ہوتے ہیں اور جو مفہوم دیا جاتا ہے میں ان کی زبان میں وہ عرض کروں گا ''اس نے رکھ دیا بنیامین کی بوری میں شاہی کٹورہ' پھر کارندوں نے آواز دی کہ تم چور ہو ٹھہر جاؤ''۔اور آپ حیران ہونگے یہ سن کے کہ ہمارے ہاں ہزار

برس سے یہ لیا جاتا ہے کہ حضرتِ یوسفؑ نے خود ہی وہ کٹورہ رکھ دیا تھا بھائی کی بوری میں خفیہ طور پر اور جب پھر وہ بھائی سمیت چلے ہیں تو کارندوں سے کہا کہ ان کو ٹھہرالو کہو کہ یہ چور ہیں' ان کو بلالیا تلاشی لی ان کی' آگے یہ آتا ہے کہ خود ان سے کہلوالیا کہ تم چور ہو' چور کی کیا سزا' انہوں نے کہا صاحب! ہمارے ہاں تو جو چوری کرتا ہے' اس کو روک لیا جاتا ہے' اس سے مواخذہ کیجئے' روک لیجئے' اس کو قید کر دیجئے جس کی بوری میں سے وہ نکلے۔ انہوں نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب اس کے بعد بوریوں کی تلاشی ہوئی اور وہ نکلا بنیامین کی بوری سے' رکھا ہی اللہ نے تھا۔ تو اس کے بعد حضرتِ یوسفؑ نے کہا کہ تم نے خود کہا ہے جس کی بوری میں سے نکلے اس کو روک لیا جاتا ہے' تمہارا قانونِ شریعت یا تمہارے ملک کا قانون ہی یہ ہے۔ ہم تمہارے ملک کے قانون کے مطابق اس کو روک لیتے ہیں۔ آگے وہ ایک آیت آتی ہے جس کو ساتھ ملاتے ہیں كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (12:76) یہاں سے وہ لیتے ہیں۔

کس قدر افسوس ہے یہ کہ ہم نے نبیوں کی سیرت و کردار کو بھی عام انسانی سوچ کے ترازو میں تول رکھا ہے

یہاں تو حضرتِ یوسفؑ ہی کی بات تھی ذرا سوچئے کہ بات کیا ہوئی جو یہ کہتے ہیں ہزار برس سے ہر تفسیر میں لکھا ہوا آپ کو ملتا ہے کہ حضرتِ یوسفؑ بنیامین کو روک لینا چاہتے تھے تو ایسے تو روکنا نہیں چاہتے تھے' یہ زیادتی ہو جاتی یوں روک لیا جاتا' یہ زیادتی جو ہے اس سے بچا جا رہا ہے بھائی کی بوری میں خفیہ طور پہ' خود ہی کٹورہ رکھ دیتے ہیں' پھر ان کو بلایا جاتا ہے' تلاشی لی جاتی ہے' اس کی بوری میں کٹورہ نکلتا ہے' انہی کے قانون کے مطابق اس کو روک لیا' کہتے ہیں دیکھا جی! کس طرح سے الزام سے بچے اور اگلی آیت کو ساتھ ملاتے ہیں كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (12:76) تو خدا نے کہا ہے کہ اس طرح سے ہم نے یوسفؑ کے لئے تدبیر کر دی۔ دونوں ہی اس میں آ جاتے ہیں ہم نے کرایا' یوسفؑ نے کیا۔

سوائے اس کے کہ اس پر ہم ہزار بار معاذ اللہ معاذ اللہ کہیں اور کیا کہا جائے

عزیزانِ من! کلیجہ شق ہو جاتا ہے۔ سوچ رہے ہیں کہ یہ جو خدا کا اولوالعزم پیغمبر جس کی بلندیٔ کردار کے لئے خدا نے یہ ساری سورۃ وقف کی ہے' سیرتِ یوسفؑ کی حسن ورعنائیاں اس میں سے ابل ابل پڑ رہی ہیں اس سورۃ میں' ایک ایک ٹکڑے میں ایک ایک قدم پہ آپ دیکھتے ہیں کہ موجِ خرامِ یار میں کیا ہے جو یہ نظر آتا ہے۔ سوچئے کہ یہ سارا کردار کہاں جاتا ہے اس ایک واقعہ سے۔ ایک عام انسان اگر یہ بات کہے اس کے متعلق بھی کیا کہا جائے گا جو خود یہ کچھ کرے اور اس کے بعد سیدھی سی بات ہے کہ چوری کا بہتان بھائی کے خلاف لگا دیا۔ اول تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے کسی قرآنی سند کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ اس فعل کو کہا جائے۔ ضرورت ہو تو بہر حال دیکھئے تو سہی قرآن کیا کہتا ہے وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا (4:112) کہ جو شخص' غلطی اس سے خود ہو جائے گناہ یا جرم

اس سے خود ہو جائے اور پھر کسی بے گناہ کو اس میں وہ ملوث کرنے کی کوشش کرے اس کے خلاف یہ بہتان لگا دے **فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا** (4:112) اس نے ایک تو خود وہ جو ایک بہت بڑی تہمت تھی اس کو اپنے ذمہ لیا اور بڑے ہی گھناؤنے جرم کا مرتکب ہوا۔ مبین کہہ کے یہ کہا ہے کہ اس جرم کے لئے وضاحت کی ضرورت نہیں' تم خود سمجھتے ہو یہ کتنا بڑا جرم ہے **اِثْمًا مُّبِيْنًا** (4:112)۔ سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے ذہن کی ضرورت نہیں کہ یہ کتنا گھناؤنا جرم ہے کہ خود تو یہ چیز کرے' بہتان دوسرے کے اوپر لگا دے۔ بے گناہ کے اوپر بہتان لگانا جو ہے خود جرم کر کے بے گناہ پہ بہتان لگانا یہ کہا ہے قرآن نے کہ یہ بعینہٖ یہ چیز یہاں نہیں ہے' کاہے کے لئے؟ یہ اس بھائی کو روکنا چاہتے تھے **كِدْنَا لِيُوْسُفَ** (12:76) وہ بھی نہ بیچ میں سے رہ جائے کہیں۔ دیکھا! انہوں نے کیسی تدبیر کی یوسفؑ کے لئے اور یوسفؑ نے یہ کچھ کیا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ **جعل** یہاں سے بات آئی کہ اس نے رکھ دیا' کس نے رکھ دیا؟ وہ گیارہ تھے ان میں سے کسی ایک نے رکھ دیا۔ صاحب! کیسی سیدھی سی بات ہے ذہن میں یہ بات آئی کٹورہ بڑا قیمتی ہے ان کا کریکٹر ہمارے سامنے ہے وہ جو بھائی کو بیچنے والے' کنویں میں پھینکنے والے ہیں' کٹورے کی چوری کے لئے تو ایک سیکنڈ میں آمادہ ہو جائیں گے۔ کس طرح سے اڑایا جائے اس کو' بنیامین کی بوری میں رکھا جائے۔ اگر یہاں تلاشی نہ ہوئی کسی کو پتہ نہیں چلا تو کٹورہ گھر پہنچ جائے گا۔ ڈھنڈیا پڑی یہ دھر لیا گیا' خود وہ بچ گیا اس نے اپنی بوری میں نہیں رکھا۔ ان میں سے کسی ایک کو نامزد ہی نہیں کیا قرآن نے' یہ نہیں بتا رہا۔ ان گیارہ میں سے کسی ایک کے ذہن میں یہ بات آئی اس نے رکھ دیا۔ آیئے دیکھیں! قرآن سے کیا شہادت ملتی ہے اس مفہوم کے لینے سے۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن پہ غور کیا جائے تو یہ مفاہیم قرآن کی رو سے ہی سامنے آ جاتے ہیں۔ اس دفعہ بھی یہ چلے گئے تھے پھر لینے کے لئے آئے تھے۔ میں آگے چلا جا رہا ہوں اس کی شہادت دینے کے لئے کہ یہ مفہوم کیسا مشکل ہوتا ہے۔ پھر جب آئے تھے یعنی یہ جو بھائی تھا یہ تو یہاں رکھ لیا گیا تھا' آگے یہ بات آتی ہے' اس کے بعد یہ گئے پھر واپس آئے لینے کے لئے۔ اب وہ وقت آ گیا تھا جب حضرتِ یوسفؑ نے سمجھا تھا کہ یہ جو اس پہ پردہ پڑا ہوا ہے اس داستان پہ' اس کو اٹھا دینا چاہئے' انہیں بتا دینا چاہئے کہ میں کون ہوں تم کون ہو' تم نے کیا کچھ کیا تھا۔ یہاں دیکھئے ایک بات' ان سے کہہ رہے ہیں آپؑ' حضرتِ یوسفؑ کہ تم آئے ہو وہاں سے آئے ہو اس کے بیٹے ہو' ٹھیک ہے اتنے بھائی ہو تم۔ **قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ** (12:89) یہ ہے صاحب بات' یوسفؑ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ تو بات ہمارے سامنے ہے' یہ یوسفؑ کے بھائی کے ساتھ تو کچھ اور انہوں نے نہیں کیا تھا۔ وہ انہیں کہہ رہے ہیں کہ تم وہ ہو کہ تمہیں تو معلوم ہے کہ تم نے یوسفؑ کے ساتھ کیا کیا تھا اور اس کے بعد اس بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا۔ **جعل** کا فاعل معلوم ہے صاحب! کہ کس نے یہ کیا تھا۔ ساری داستان میں کہیں اس بھائی کے متعلق یہ نہیں آیا کہ انہوں نے اس کے ساتھ اس کے سوا کچھ اور بھی کیا ہو۔ **هَلْ عَلِمْتُمْ** (12:89) کوئی اور جانے نہ جانے تم تو جانتے ہو **مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ** (12:89) یوسفؑ کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا تھا وہ بھی تم جانتے ہو'

باپ سے جا کے کہہ دیا تھا کہ بھیڑیا کھا گیا تھا' جانتے ہو و اخیہ اوراس کے اس بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا تم جانتے ہو۔

سوال یہ ہے کہ آخر ہزار برس سے ہم نے اس قسم کی غلط سوچ کو کیوں اپنا رکھا ہے

عزیزانِ من! بات صاف ہے کہیں اور تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔اور وہ جو اس مفہوم لینے سے آپ دیکھتے ہیں کس قدر گھناؤنا تصور آتا ہے۔(معاذ اللہ معاذ اللہ) عام شریف کا وہ تصور!! آپ یہ کہیں گے کہ صاحب! یہ ہزار برس سے یہ کچھ کہے چلے جا رہے ہیں' کہے چلے جا رہے ہیں' کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آ رہی ہے' آ کیوں نہیں رہی ہے؟ دانستہ کیا جا رہا ہے یہ کہنے کے لئے کہ سچ بولنا اسلام میں' دین میں' قرآن کی رو سے بہت بڑی عظمت سمجھا لیکن زندگی کی بعض ضروریات ایسی ہوتی ہے جس کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے اور سند لاتے ہیں اس سے۔اپنی اس قسم کی فریب دہیوں کو (معاذ اللہ معاذ اللہ) اس کے لئے سندِ جواز مہیا کرنے کے لئے نہ خدا کے پیغمبر کو بخشا' نہ خود خدا کو بخشا۔

یہاں تو نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس کے متعلق بھی ایک غلط روایت کو سچ سمجھ کر جھوٹ بولنے کی کھلی چھٹی ہی نہیں بلکہ یہ واجب بھی ہے

یہاں تو یہ مفہوم بیان کرتے ہیں پھر اس قسم کی وضعی روایتوں کو صحیح قرار دینے کے لئے کہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) کلیجہ شق ہو جاتا ہے بیان کرتے ہوئے کہ خود نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک مخالف کو قتل کرانے کے لئے ایک سازش کی' اپنے دو صحابیوں ؓ کو تیار کیا جو اس کے دوست تھے' رات کو بھیجا کہ جاؤ اس کو ورغلا کے گھر سے باہر نکالو بہلا پھسلا کے جنگل میں لے جاؤ باتیں بنا کے' دوست کی حیثیت سے جاؤ وہاں قتل کر دو۔اور اس میں یہ ہے اس روایت میں کہ انہوں ؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! وہاں ہمیں اگر کسی کے منہ پہ جھوٹ بولنا پڑے کوئی مکر و فریب کرنا پڑے؟ آپ ﷺ نے کہا اجازت ہے۔جب کہا گیا کہ او! یہ تمہارے ہاں کی یہ حدیثیں' یہ روایتیں ان کے انکار سے کہتے ہو کہ انسان کافر ہو جاتا ہے' کیا کہتے ہو؟ کہنے لگے حضرتِ یوسف ؑ نے کیا نہیں کیا تھا! اور خدا نے کرایا تھا۔اور اگلی بات یہ کہ آپ ﷺ نے بھی یہ جو کہا ہو گا خدا ہی کے حکم کے مطابق کہا ہو گا حضور ﷺ اپنی طرف سے کچھ کہتے ہی نہیں تھے' یہاں بھی ایک رسول اور اس کا خدا' وہاں بھی رسول اور وہ سند۔یہ ہے وہ چیز جس کی وجہ سے یہ نہیں کہ خدانکردہ جھوٹ،بعض ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لئے واجب ہو جاتا ہے یہ نہیں کہ وہاں اجازت ہوتی ہے۔

کعب بن اشرف کے قتل کے متعلق روایت پر پرویز ؒ کا تبصرہ

یہ ایک اصطلاح ہے وجوب کی' سب سے اوپر فرض ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے لازم ہوتا ہے' فرض سے نیچے جو چیز ہے وہ واجب

ہوتی ہے اور واجب کو ترک کرنے والا مجرم ہوتا ہے یعنی وہاں جھوٹ نہ بولنے والا مجرم قرار پا رہا ہے اور سند ہے وہ کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے خود اس کو قتل کرایا تھا کعب بن اشرف کو اس طرح سے قتل کرایا تھا یوں صحابہؓ کو بھیجا تھا (معاذ اللہ معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ عزیزانِ من! یہ ہیں وہ روایات اور احادیث جن کے انکار سے یہ مجرم آپ کے سامنے کفر کے فتوؤں کا مورد بنا اور میں پھر کہا کرتا ہوں زندگی کے اس آخری دنوں کے اندر' اگر خدا کے رسولوں کی عظمت اور نبی اکرم ﷺ کی ناموس کی حفاظت کے لئے ایک کفر کا فتویٰ کیا' دس ہزار کفر کے فتوے لگ جائیں تو ان فتوؤں کے اوپر ناز ہے۔ خدا کے پیغمبر نبی اکرم ﷺ' اس کے صحابۂ کبارؓ ہر وہ شخص جس کے ایمان کی شہادت خدا نے دی ہے اس کی سیرت اور کردار کی حفاظت جو ہے ہمارا دینی فریضہ ہے اور جو سازشیں اس کے خلاف ہوئی ہیں' ان سازشوں کے پردے کا چاک کرنا قرآن کے طالب علم کا یہ اولیں فرض ہے۔ اس نے وقت دیا آگے آؤں گا تو اس کی بات میں کروں گا جہاں آیا ہے كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (12:76) جسے یہ کہتے ہیں کیا معنی ہیں' بات تو وہاں کرونگا یہیں ایک بات کہہ دوں کہ دیکھئے ساتھ کیا پڑا ہوا ہے' یہ سارا کچھ آ کے ذرا سوچئے یوسفؑ کا کردار اگر یہ معنی مانے جائیں' جو لئے جا رہے ہیں تو نظر آتا ہے کہ کیا کردار سامنے آتا تھا۔ یہ تو قرآن والا خدا خدائے خبیر و علیم ہے قیامت تک دلوں میں گذرنے والے واقعات سے واقف ہے' یہ جتنی سازشیں ہونی تھیں اس قرآن کے خلاف' اس کا اسے علم نہیں تھا؟ کیا یہ علم نہیں تھا کہ اس قسم کے یہ معنی پہنائیں گے اور یوسفؑ کی طرف اس کو منسوب کر دیں گے؟ اسی سانس میں اسی آیت میں کہا نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (12:76) اس طرح سے ہم جس کے چاہتے ہیں' درجات بلند کر دیتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد یوسفؑ کے درجات بلند ہو رہے ہیں تو (معاذ اللہ معاذ اللہ) ان کے مفہوم کے اعتبار سے پھر یہ ہوا کہ جیسے یہاں کسی سے کہا جائے آ گئے آ گئے جناب! ٹھیک ہے جی ایک درجہ اور بڑھا دیجئے ان کا' بڑے کام کا آدمی ہے۔ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ (12:76) وہ بہت عظیم سیرت کا مظاہرہ ہوا ہے جہاں یہ کہنا پڑا کہ ہم یوں درجات کو بلند کرتے ہیں۔ تو اگر یہ مانا جائے کہ یوں کیا کرتے ہیں کیا کہنے ہیں پھر (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔

شاہی کٹورے کی تلاش' بھائیوں کی سرشت و سیرت' چوری کا سراغ اور سزا کے تعین کا معاملہ

بہرحال ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ (12:70) آواز دی آواز دینے والے نے' انہوں نے دیکھا اس کے بعد کہ کمرے کے اندر کٹورہ نہیں ہے تو بڑی نمایاں چیز ہوگی جو فوراً ہی پتہ چل گیا' یہ ابھی کہیں دور نہیں گئے تھے' ادھر آ ؤ۔ قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ (12:71) وہ رکے ان کی طرف رخ کیا اور کہا کیا کہتے ہو' کیا گم ہوا ہے تمہارا' آوازیں دے رہے ہو۔ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ (12:72) وہ کہا کہ شاہی کٹورہ یہاں تھا' وہ گم ہو گیا ہے اب ان

کارندوں کو بھی اس کی فکر پڑی کہ یہ کہا جائے گا کہ تم یہاں چوکیدار تھے' محافظ تھے ان چیزوں کے نگران تھے' یہ اجنبی یہاں آ کے اپنی بوریاں بھر رہے ہیں یا ان میں سامان ڈال رہے ہیں تمہیں کیا ہو گیا کہ اتنی بڑی قیمتی چیز ہے وہ گم ہو گئی۔ کہا کہ بابا! خدا کے لئے تم میں سے بتا دے یا وہ دیدے تو ہم اپنی طرف سے انعام کے طور کے اوپر ایک بوری گندم کی تمہیں اور دیدیں گے۔ اگر انہوں نے حضرتِ یوسفؑ کے ایما سے ان کے اندر رکھا ہوتا تو یہ انعام وہ دینے کا وعدہ کر لیتے کہ جو ہمیں بتا دے گا یا دیدے گا تو انعام دیتے' انہیں تو پتہ ہے کس کی بوری کے اندر موجود ہے وہیں دھر لیتے۔ ان کی یہ کیفیت قرآن بتا رہا ہے کہ خود انہیں احساس ہوا کہ ہم بھی تو اس کے اندر دھر لئے گئے ہیں' ہمارا فریضہ تھا حفاظت کا۔ وہ کہتے ہیں او بابا! ہم اپنی طرف سے ایک بوری دیں گے خدا کے لئے ہمیں بتا دو۔ اب یہاں سے ان بھائیوں کی سرشت و سیرت سامنے آتی ہے۔ **قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ** (12:73) انہوں نے کہا کہ خدا شاہد ہے اور خدا شاہد کے علاوہ ہم پہلی دفعہ نہیں آئے ہیں بھئی! پہلے بھی تو یہاں آئے تھے' تمہارے ہاں مہمان رہے تھے' انہی کمروں کے اندر ہم رہے تھے' کوئی چیز چوری ہوئی تھی؟ تم بھی تو اس کو جانتے ہو کہ ہم چور نہیں ہیں' تمہیں بھی یہ علم ہے کہ ہم یہاں کچھ قانون شکنی کرنے کے لئے نہیں آئے' ہم تو غلہ لینے کے لئے آئے ہیں **وَ مَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ** (12:73) ہم چور نہیں ہیں۔ **قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ** (12:74) انہوں نے کہا کہ اگر تم جھوٹے نکلے تو پھر بتاؤ تمہاری سزا کیا ہے۔ یہاں سے ایک اور چیز سامنے آتی ہے کہ یہ باہر کے آنے والے اجنبی ہیں تو گویا اس دور میں بھی' جسے فرعونیت کا دور کہتے تھے استبداد میں وہاں بھی یہ چیز تھی کہ اجنبیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ تم بتاؤ تمہارے ہاں کیا سزا ہوتی ہے چور کی' انہیں ان کے ملک کے قانون کے مطابق سزا دی جاتی تھی۔ **قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ** (12:75) یہ ہمارے ہاں جس کی بوری میں سے نکلے' یہ نہیں کہ ہم دس کے دس یا بارہ کے بارہ دھر لئے جائیں جس کی بوری میں سے نکلے اسے دھر لیا جائے' رکھ لیا جائے۔ **كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ** (12:75) ہمارے ہاں اس طرح سے مجرموں کو سزا دی جاتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ رکھنے والے کو تو پتہ تھا کس میں ہے بچنے کے لئے کہیں ہمیں ABETMENT میں ساتھ نہ رکھ لیا جائے۔

قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
بچتے نہیں ہو مواخذۂ روزِ حشر سے

انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے صاحب! کسی ایک کی بوری میں سے نکلا ہے کیا پتہ کس کی بوری میں سے نکلا اور تم سارے کے سارے تو یہاں موجود تھے تمہارے سامنے یہ کچھ ہوا تھا اس لئے تمہیں بھی کیوں نہ دھر لیا' یا شاید یہ چیز انہوں نے کہی کہ جس کی بوری میں سے نکلے ہمارے ہاں تو اسی کو پکڑا جاتا ہے ساتھ جو دوسرے ہوتے ہیں' ان کو نہیں دھر لیا جاتا۔ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں' یہ تو بات ہے کہ معاملے کو

کیسے سمجھا جائے۔

کٹورے کی تلاش کے بعد ملکی قانون کے تحت سزا کا تعین اور قرآن حکیم کی راہنمائی

انہوں نے کہا یہ ہے۔ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ط(12:76) ایک ایک کر کے بوریوں کو کھولنا شروع کیا اور آخر الامر دیکھا کہ وہ یوسفؑ کا جو بھائی تھا اس کی بوری میں سے وہ کٹورہ نکل آیا' اسی میں سے نکلنا تھا۔ یہ دیکھئے كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ(12:76) یہاں قرآن یہ بات کہتا ہے کہ اس ملک کے قانون کی رو سے یوسفؑ ان اجنبیوں میں سے کسی کو بھی خواہ اس کا وہ اپنا بھائی کیوں نہ ہو' اپنے پاس روک کے نہیں رکھ سکتا تھا۔ یعنی اب یہ دیکھئے یہ اور سیرت کی بلندی کہ جو بھی وہاں مروجہ قانون ہے' اس قانون کی پابندی اتنی کرنے والا ہے یہ شخص کہ چاہتا تو اپنے بھائی کو اپنے پاس روک کے رکھ لیتا' وہ تو قرآن کہتا ہے کہ اتنا بڑا صاحبِ اقتدار یہ شخص' حضرتِ یوسفؑ تھے سارے ملک میں ان کا حکم چلتا تھا بات ہی کچھ نہیں تھی لیکن کہا کہ نہیں! قانون کی بڑی سختی سے پابندی کرنے والا تھا یہ شخص۔ بادشاہ کے قانون کی رو سے یہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ ایک بات ایسی ہوگئی کہ جو یہ چاہتا تھا وہ بھی ہو گیا بادشاہ کے قانون کی شکنی بھی نہ ہوئی اور کسی قسم کی ناواجب بات بھی اس کو نہ کرنی پڑی یوں ایسی تدبیریں خود بخود ہو جاتی ہیں۔ یہاں لفظ آیا ہے دِيْنِ الْمَلِكِ(12:76) دین کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ''بادشاہ کے قانون کی رو سے''۔

مملکت پاکستان کی بنیاد کا مقصد مذہب کی بجائے دین کا فروغ تھا

دین کہتے ہی قانون کو ہیں۔ یہ تو پھر مذہب ہوتا ہے جو وعظ ہوتا ہے' دین وعظ نہیں ہوتا' دین قانون ہوتا ہے۔ اور قانون اور وعظ میں فرق یہ ہوتا ہے کہ وعظ میں بھی وہی بات کی جاتی ہے اس میں PENALTY CLAUSE نہیں ہوتی اگر یہ چوری کرو گے وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہتے ہیں کہ خدا کی لعنت تم پہ ہوگی اس کے عذاب میں پکڑے جاؤ گے' یہاں کی بات نہیں ہے۔ یہی لفظ جب قانون میں آتا ہے تو وہ ہے کہ چوری کرو گے تو چھ مہینے کی سزا ملے گی۔ یہ جو آخری CLAUSE ہے یہاں آ کر وعظ' دین بنتا ہے۔ اور دین میں جب یہ صورت نہ ہو اور یہ صورت تو اپنی آزاد مملکت میں ہی ہو سکتی ہے۔ وہاں انڈیا میں جب ہم تھے یا اب بھی جو وہاں کے مسلمان ہیں یہ جتنی چیزیں آپ کی تعزیراتِ پاکستان میں قانون کی حیثیت لئے ہوئے ہیں وہاں بھی یہ چیزیں موجود تھیں' وہاں وعظ کی حیثیت لئے ہوئے تھیں' بیشتر چیزیں جتنی آپ کہتے ہیں۔ آج بھی وہاں مُلّا اس کا وعظ کرتا ہے اور یہاں بھی چونکہ ابھی وہ قرآن کا نظام تو رائج نہیں ہے آپ بھی وعظ ہی کرتے ہیں۔ اور یہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وعظ کا اثر کیا ہوتا ہے! کتنے وعظ کہے جاتے ہیں کہ یہ بددیانتی' بدمعاملگی'

چوری' سمگلنگ یہ بڑی بری بات ہے' یہ ہوگا اور یہ ہوگا' کہے چلے جارہے ہیں وہ کہہ رہے ہوتے ہیں' یہ اونگھ رہے ہوتے ہیں۔لیکن جب یہی چیز ایک ضابطۂ قانون کی حیثیت سے یہاں نافذ ہوگی پھر یہ مذہب نہیں رہے گا' دین بن جائے گا' وعظ نہیں رہے گا' قانون ہوجائے گا۔اور جیسا میں نے عرض کیا قانون کے لئے اپنی آزاد مملکت کی ضرورت تھی اور یہ تھی مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کہ ہم نے اسلام کو جواب مذہب بن چکا ہے' اسے ہم نے دین بنانا ہے جو بالحقیقت اس سے مقصود ہے اور وہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر نہیں بن سکتا' اس بنیاد پہ ہم پاکستان کا مطالبہ کرتے تھے۔عزیزانِ من! یہ تھا مطالبہ۔**دِیۡنِ الۡمَلِکِ**(12:76) قرآن کی کیا بات ہے! معنی متعین کرنے میں یونہی جو جی چاہے معنی متعین کرلیں۔**فِیۡ دِیۡنِ الۡمَلِکِ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ**(12:76) خدا کے قانونِ مشیت کی رو سے یہی جو مختلف حوادث' وقائع یوں وقوع پذیر ہوجاتے ہیں۔اور یہاں آ کے یہ کہا کہ یوسفؑ کا جی بھی چاہتا تھا' بھائی کو روک لے۔قانون کی رو سے روک نہیں سکتا تھا' غلط قدم کوئی اٹھا نہیں سکتا تھا' جی میں یہ تھا کہ بھائی کو روک لے' پابندی کی یہ صورت کہ ادھر کوئی ناواجب بات کرنے سے اقدارِ خداوندی کی خلاف ورزی ہورہی ہے' یوسفؑ وہ نہیں کرسکتے۔یوں روک لینے سے ملک کے مروجہ قانون کی خلاف ورزی ہورہی ہے یوسفؑ یہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا' ان میں سے کوئی بات بھی کرتا تو یوسفؑ اس درجۂ بلند سے گر جاتا جس کے اوپر وہ تھا۔یوسفؑ کی تمنا بھی پوری ہوگئی اور ان میں سے کوئی بات بھی اس کو نہ کرنی پڑی۔**نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ**(12:76) عزیزانِ من! دل میں وہ تمنائیں ابھریں جو جذبات پیدا ہوں' فوری ان کے پورا کرنے کے لئے جائز و ناجائز حربے نہ استعمال کرلے' تھوڑی سی استقامت برتے' خیال رکھے کہ نہیں! قانون شکنی بھی نہیں کرنی اور خدا کی اقدار جو ہیں ان کے خلاف بھی مجھے نہیں جانا' تھوڑا سا ضبط کرلے' تھوڑی سی استقامت اس میں کرلے تمنا بھی پوری ہوتی ہے اور انسان پستیٔ کردار سے بھی بچ جاتا ہے۔اور اسی لئے کہا کہ **اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ**(41:30) جب کہا کہ خدا کا قانون برحق ہے میں نے اس کی اتباع کرنی ہے اور پھر ذرا استقامت سے کام لے دیکھے کہ کس طرح فرشتے نہیں نازل ہونے شروع ہوجاتے!! **نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ**(12:76) کہا یہ ٹھیک ہے ہر شخص کچھ نہ کچھ علم رکھتا ہے ایسے معاملات میں کچھ کاریگری کرنا چاہتا ہے' اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ **وَ فَوۡقَ کُلِّ ذِیۡ عِلۡمٍ عَلِیۡمٌ** (12:76) کتنا ہی کسی کا علم ہو اس کے اوپر ایک اور ہے جسے علیم کہا جاتا ہے۔یہ ساری کاریگریاں' یہ ساری تدبیریں' یہ سازشیں' یہ حربے' یہ سارے کے سارے علم کی بنا' پہ اور عقل کی بنا پہ انسان کرتا ہے' بے چارا' ناواقف' بے وقوف' بدھو' وہ تو جانتا ہی نہیں ان چیزوں کو۔لیکن کہا کہ ہر وہ شخص کہ جس کو اس کا علم ان چیزوں کی طرف لے جائے' ابھارے' اسے معلوم ہونا چاہئے کہ آخری علم میرے ہی پاس نہیں۔

اپنی عقل کو حرفِ آخر قرار نہ دے تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا ہے

وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عَلْمٍ عَلِیْمٌ (12:76) کتنا ہی بڑا کاریگر کیوں نہ بن رہا ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ نہیں! میرے اوپر ایک اور علیم ہے۔ اور اگر یہ چیز ہے کہ خفیہ سازشوں سے یہ کچھ کیا جائے تو اسے بھی پتہ ہونا چاہئے کہ ایک وہ ہے جو جانتا ہے وہ دل میں گذرنے والے خیالات تک کو جانتا ہے۔ مقدمہ پیش ہو گیا۔ حضرتِ یوسفؑ کی عدالت میں مقدمہ جانا تھا وہیں تو یہ سب کچھ ہوا تھا۔ ان سے پوچھا کیا کہتے ہو؟ کہتے ہیں کہتے کیا ہیں ٹھیک ہے چور ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ عزیزانِ من! سنئے یوسفؑ ہی کے سامنے کھڑے ہیں عدالت میں کہتے ہیں کہ نئی بات اس نے نہیں کی! قَالُوْٓا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ(12:77) اس نے آج چوری کی ہے اس کا ایک بھائی بھی تھا وہ بھی چور ہی تھا' اس نے بھی پہلے چوری کی تھی۔ اب آ گئی مشکل ہمارے مفسرین کے لئے یعنی بات یوسفؑ کے بھائی کہہ رہے ہیں کہ یوسفؑ نے بھی کی تھی اور یہ ہمارے مفسرین ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں ان کے بھائیوں کے اس الزام کا کہ اس نے چوری کی ہوئی تھی۔

حضرت یوسف کا بچپن اور چوری کرنے کے ثبوت کی کہانی

یا اللہ! کیا کیا جائے ''کناں دے وس پے گئے پیغمبر ساہڈے'' (معاذ اللہ)۔ بیٹھے ہیں صاحب! کہ کیا کریں یوسفؑ کی چوری کیسے ثابت کریں۔ بہت دور سوچا تھا' بہت سوچتے تھے' کہنے لگے یوسفؑ چھوٹے بچے ہی تھے والدہ ان کی فوت ہو گئی تھیں' باپ نے انہیں ان کی پھوپھی کے پاس بھیج دیا پرورش کرنے کے لئے' تو وہاں یہ بچہ رہا۔ اس پھوپھی کو ان سے بڑی محبت ہو گئی اس کے گھر اولاد کوئی نہیں تھی۔ جب حضرتِ یوسفؑ بڑے ہو گئے تو حضرتِ یعقوبؑ بہن کے پاس گئے کہ انہیں دے دیجئے وہ دینا نہیں چاہتی تھی۔ اب وہ یہ سوچے کہ کیسے رکھیں' بھائی کے جذبات کا بھی خیال' زبردستی رکھ نہیں سکتی تھی تو اس نے اپنا ایک کڑا یا سونے کا کنگن تھا اسے یوسفؑ کے کپڑے وغیرہ باندھے تو اس کے اندر وہ کڑا رکھ دیا (ساری یہاں کی کہانی وہاں چلی جا رہی ہے) اور بھیج دیا باپ کے ساتھ ''روندیاں دھونیاں وچاری نے' کی کردی بڈھی مائی''۔ جب لے کے چلے تو اس کی بہن نے کہا ''اوبھرا ٹھہر جا میرا کڑا گم ہو گیا ہیگا'' وہ کہنے لگے کڑا گم ہو گیا ہے تو اس سے کیا واسطہ؟ کہنے لگی تمہیں پتہ نہیں ہے یہ تو روز یہ کیا کرایا کرتا ہے ضرور اسی نے چرایا ہے' کہنے لگے بہن! کیا کہتی ہو! کہ چرایا ہے! اس کے پاس ہے کیا' یہ کپڑا' کوئی کھلونے ولونے باندھ کے لے آیا ہے آ کے دیکھ لو اور جب وہ کھولا اس کے اندر کڑا نکلا۔ قانون یہ تھا کہ چور جو ہے اس کو رکھ لیا جاتا ہے اس طرح سے پھوپھی نے یوسفؑ کو رکھ لیا۔ اور یہ وہاں کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ کیا اس کا ایک اور بھائی تھا وہ بچپن میں چور تھا ''پھوپھی دا کڑا چرا لیا ہیگا سی''۔ یہ ہمارے مفسرین صاحب اس کے لئے یہ پیش

کرتے ہیں' سوچتے نہیں کہ کہنے والے کون ہیں۔یعنی یوسفؑ کے جو بھائی کھڑے ہیں' وہ ٹھیک ہے ہر ملزم خواہ وہ مجرم ہی ہو' ایک وکیل تو مل جاتا ہے اس کا کام ہی یہ ہوتا ہے اسے پتہ ہوتا ہے کہ اس نے یہ جرم کیا ہے' کام اس کا یہ ہے کہ کسی طرح سے کوئی نکات پیدا کرے مجرم ہے' وہ بے گناہ ثابت ہو جائے۔اب یہ کھڑے ہیں وہاں چرایا ہوا یہ سب کچھ ہے' یہ وہاں کہہ رہے ہیں یہ بات' اب ان کو وکیل چاہئے یہ ہمارے مفسر وکیل مل رہے ہیں وہ ثابت کر رہے ہیں کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے یہ بات تھی' یہ شروع سے ہی چور تھے۔آگے ایک بات سب سے بڑی دلچسپ ہے۔کہا انہوں نے یوسفؑ کے سامنے' عدالت کی کرسی پہ بیٹھا ہے' عزیزانِ من! ان باتوں کو قبول کرنے کے لئے شاہین کا جگر چاہئے۔**فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ** (12:77) ''کوڑتے بڑی چڑھی'' لیکن دل میں ہی بات رہنے دی' کچھ نہیں کہا۔**وَ لَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ** (12:77) ابھی وہ حقیقت کو واشگاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔یہ تو نہ کہا کہ تم نے اس کے بھائی کے خلاف کہا' ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ ایک جج کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اگر اس کے اندر ذاتی معاملہ آ جائے پھر اس مقدمے میں کوئی باز پرس کرلے' اگر ضرورت ہے اس میں تو خود مقدمہ دائر کرے کہیں دوسری جگہ جا کے۔بات جو کہی ہے ہر جج کہہ سکتا ہے۔عزیزانِ من! قرآن کی کیا بات ہے! یہ مقام اللہ اکبر سوچنے کی بات ہے' قرآن کا تو ہر قدم جو ہے وہ بلائی کی اطرف ہے۔کہا کہ اچھا! تم یہ بتا رہے ہو کہ یہ تو کوئی انوکھی بات نہیں ہے یہ اس کا بھائی اس کے متعلق کہہ رہے ہو کہ یہ بھی چوریاں کیا ہی کرتا تھا' کہنے لگے کہ میں ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ کچھ جو کہا ہے تمہیں معلوم ہے کہ یہ تم نے کیا کہہ دیا۔**قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا**ۚ(12:77) تم نے یہ جو کہہ دیا کہ یہ خاندان ہی ہمارا اس قسم کا ہے تو تم بھی تو اسی خاندان کے افراد ہو۔کہا سوچو ذرا تم نے ان کو تو ملزم قرار دے دیا اس سے' اپنے متعلق تم نے کیا IMPRESSION CREATE کیا' تم اجنبی ہو ہم تمہارے خاندان کے متعلق کچھ نہیں جانتے لیکن یہ جو تم کہتے ہو یہ ایک حادثہ تھا تم کہتے کہ نہیں صاحب! ہم لوگ بڑے پاکباز ہیں ہمارا خاندان بڑا بلند ہے' یہ سب کچھ ہے یہ ایک بچہ ہے اس سے ایک غلط بات ہوگئی۔تم کہتے ہو کہ نہیں صاحب! یہ بات نہیں ہے اس کا بھائی بھی یہ کچھ کیا کرتا تھا تو نظر آیا یعنی یہ بات **اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا**ط(12:77) کہا تم نے یہ کہہ کے' پتہ ہے خود اپنے متعلق کیا IMPRESSION CREATE کہ دیا ہے اور وہ یہ کہ تمہارا تو سارا خاندان ہی ایسا نظر آتا ہے۔اور اس کے بعد کہا کہ یہ دیکھئے میں کوئی الزام تم کو نہیں دیتا جو بات تم نے کہی تھی اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے ورنہ **وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ** (12:77) جو باتیں تم کرتے ہو اس کی حقیقت تو وہ جانتا ہے لیکن نظر بظاہر اس سے IMPRESSION یہی CREATE ہوتا ہے کہ تمہارا خاندان کوئی اچھا خاندان نہیں' تمہارے بیانات کے مطابق' واقعات جو صحیح ہیں ان کو خدا ہی جانتا ہے ۔ جج کو کوئی ریمارکس بھی پاس کرنے چاہئیں تو اس انداز سے کرنے چاہئیں کہ CIRCUMSTANCIAL EVIDENCE سے کچھ استنباط ہوتا ہے کہ ایسی بات ہے میں یقینی طور پہ تمہیں ملزم نہیں قرار دیتا۔

وَ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (12:77) جوتم کہتے ہو' اس کا صحیح علم تو اس کو ہی ہے لیکن تاثرات اس کے یہی تم دے رہے ہو کہ کوئی اچھا خاندان نہیں جس کے تم افراد ہو۔ فوراً بات سمجھ گئے کہ بھانپ گیا ہے' فوراً ہی اس اقدام پہ آ گئے کہ جہاں اس قسم کے لوگ جن کا کریکٹر نہیں' اس پہ اترا کرتے ہیں' خوشامد کے درپے۔ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیْخًا كَبِیْرًا (12:78) اوصاحبِ اقتدار بادشاہ! کیا کہیں ہم اس کے متعلق' کیا کہیں ہم ان کے متعلق' اپنے متعلق بھی ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے' تم نے سب کچھ کہہ دیا۔ ہمارے خاندان کے متعلق ہم صرف یہ کہنا چاہیں گے کہ بوڑھا باپ پیچھے ہے وہ تو مر جائے گا۔ رحم کی درخواست اب اپنے متعلق نہیں دے رہے کہ وہ تو دیکھ رہے ہیں کہ ہم نے اس کے سامنے کیا IMPRESSION CREATE کر دیا ''ٹبرای چوراں دا''۔

بوڑھے باپ کا سہارا لیتے ہوئے بنیامین کو ساتھ لے جانے کی اپیل

بڑا بوڑھا باپ ہے بے چارا' اس کے ساتھ اس کو بڑی محبت ہے اس لئے ہم یہ کہیں گے کہ اسے جانے دے۔ یہ پتہ ہے کہ یہ کچھ یہ نہیں کرے گا۔ فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ (12:78) اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو باندھ لے۔ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ (12:78) ہم نے دیکھا ہے کہ تم بڑے ہی حسنِ سلوک کرنے والے ہو' بڑے ہی محسن واقع ہوئے ہو' نیکوکار واقع ہوئے ہو اس لئے اس بوڑھے باپ کی حالت پہ رحم کھاتے ہوئے اسے جانے دو' ہم سے کسی کو رکھ لو۔ اب یہاں کا وہی وکیلانہ حربہ کہ محسنین تو ہے وہ یہ تو کرے گا ہی نہیں کہ جرم کوئی کرے اور پکڑ کسی کو لے اور اگر بوڑھے باپ کی حالت پہ رحم آ گیا تو اس کو چھوڑ دے گا۔ قَالَ مَعَاذَ اللّٰہِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ (12:79) تم کیا کہہ رہے ہو! چور کوئی ہو سزا میں کسی اور کو دیدوں' خدانکردہ معاذ اللہ مجھے تو تمہاری اس SUGGESTION کے مقابلے میں خدا کے قانون میں پناہ لینی پڑے گی۔ رحم کی درخواست جذباتی چیز ہے' ہوسکتا تھا میں جذبات میں آ جاتا تم نے جو کچھ کہا تھا۔ معاذ اللہ کہاں کہا ہے! میں نے ایک دن آپ سے کہا تھا کہ معاذ اللہ اب تو ہمارے ہاں انشاء اللہ اور ماشاءاللہ اور معاذ اللہ یہ چیزیں جو ہیں اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ (53:23) چند الفاظ بن گئے ہیں ان کے معنی کچھ نہیں ہیں۔ صاحب! معاذ اللہ بڑی چیز ہے۔

لفظ معاذ اللہ کا مفہوم خدا کے قانون کی پناہ میں آنا

میں نے کہا تھا عرب کہاں استعمال کرتے ہیں! یہ مرغی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جو چوزے ہوتے ہیں یہ چوزے چلتے پھرتے ہیں' چگتے پھرتے ہیں' کہیں اگر چیل کا سایہ یا بلی کی میاؤں کان میں پڑتی ہے آپ کو پتہ ہے ان کا FIRST RE-ACTION کیا ہوتا ہے؟ وہ دوڑ کے ماں کی حفاظت کے نیچے آ جاتے ہیں' اس طرح سے ان چھوٹے بچوں کا ماں کی حفاظت میں آ جانا ان کے ہاں تعوذ

کہلاتا تھا جہاں سے تعویذ کا لفظ نکلا ہے: جہاں کہیں خطرہ نظر آئے تعلیم ہماری یہ ہے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ''میں ان جذباتی خطرات سے خدا کے قانون کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں'' جہاں کہیں اس قسم کی سرکشی کا سایہ بھی پڑے فوراً دوڑ کے خدا کے قانون کی پناہ میں آ جائے' اسے کہتے ہیں معاذ اللہ۔ کہا ہے جذبات کو اپیل کرتے ہو اور یہ کہتے ہو کہ تم میں سے ایک کو لے لوں' جذبات کی بات تو ٹھیک ہے لیکن میں خدا کی پناہ میں' اس کے قانون کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔ جو مجرم ہے' اسی کو سزا ملے گی۔ ایسا میں نہ کروں گا تو ہم تو ظالم ہو جائیں گے اور تم کہتے ہو میں محسنین میں سے ہوں محسن ظالم کیسے ہو سکتا ہے اور ظالم محسنین میں سے نہیں ہو سکتا یہ تو متضاد بات ہے جو تم نے خود کہہ دی۔ فَلَمَّا اسْتَیْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا ؕ (12:80)۔

کٹورے کی چوری کا قصہ بھائیوں کی چابکدستی باپ کے لیے ذہنی طور پر نا قابلِ برداشت اذیت نا کی اور حضرت یوسف کی دل گرفتگی

جب ادھر سے مایوس ہو گئے تو پھر سارے اکٹھے ہو کے بیٹھ گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ قَالَ كَبِیْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَیْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ یُوْسُفَ ۚ (12:81) ان کا جو سب سے بڑا بھائی تھا اس کو معلوم ہو گا کہ ان میں سے ہی کسی نے یہ کیا تھا یہ کٹورے کا والا قصہ' اس نے کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ باپ نے کتنی تاکید سے تم سے یہ عہد لیا تھا اور پھر اس سے پہلے تم خود یوسفؑ کے ساتھ کیا کر چکے ہوئے ہو' تمہیں سب پتہ ہے۔ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰی یَاْذَنَ لِیْۤ اَبِیْۤ اَوْ یَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ (12:80) تم جہاں جی چاہے جاؤ' باپ کے پاس جاؤ' وہاں جاؤ' میں تو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں' میں نہیں جاؤں گا تآنکہ وہ باپ مجھے اجازت دیدے کہ آ جا' یا خدا ہی کا کوئی حکم مجھ پہ نافذ ہو جائے' مجھے موت آ جائے یا کچھ ایسے ہو جائے' میں نہیں تمہارے ساتھ جانے کو تیار' بہت بڑی شرم کی بات آتی ہے۔ اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤی اَبِیْكُمْ فَقُوْلُوْا (12:81) جاؤ باپ کے پاس جاؤ اور اس سے جا کے کہنا۔ عزیزانِ من! بڑا تھا اپنی حفاظت تو کر گیا جو کہا ہے اس کے کہنے کے لئے بھی میں نے کہا' بڑا ہی پتھر کا کلیجہ چاہئے' سننے کے لئے بھی سینے میں دل کی جگہ پتھر ایک چاہئے اور پھر یہ دیکھئے کہ نشتر کتنا بڑا ہے' کہا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ (12:81) کہنا کہ ابا جان! تمہارے لاڈلے نے دیکھا وہاں کیا چاند چڑھایا۔ یہ نہیں کہا کہنا کہ ہمارے بھائی نے وہاں یہ کیا' یہ نہیں کہا کہنا اس بنیامین نے کیا' تیرے بیٹے نے وہاں یہ کیا۔ عزیزانِ من! واقعات اور قرآن کا بیان۔ کہا اس سے یوں جا کے کہنا یعنی تم بری الذمہ ہو گئے۔ یہ کہنا کہ تیرے بیٹے نے وہاں چوری کی ہے۔ عزیزانِ من! اس کے بعد کتنا غصہ و رنج کیوں نہ ہو ان کے اوپر وہ غصہ نکال ہی نہیں سکتا' کتنا بڑا ملزم انہیں بھی ٹھہرا دیا کہ یہ ہے تمہاری تربیت کا اثر' یہ ہے جس کو تم چھاتی سے لگائے لگائے پھر رہے تھے' جس کو ہم سب پہ ترجیح دے

رہے تھے جس کو اتنا پیار کرتے تھے اتنا لاڈلا تھا' لو! کرتوت دیکھ لو۔ منہ بند کر دیتا ہے۔ بڑا تھا خود تو گیا نہیں اور ان کو یہ سکھایا کہ یہ جا کے کہنا۔ وَ مَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا (12:81) ہم اسی بات کی گواہی دے سکتے ہیں جتنا ہمیں علم ہے اس سے آگے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ (12:81) وہ ٹھیک ہے غیب کا علم تو خدا کو ہے یا اس کے معنی دوسرے یہ ہو سکتے ہیں شھد کے معنی اگر یہاں نگران کے ہو جائیں تو کہا کہ ہم نے تم سے معاہدہ کیا تھا' عہد کیا تھا کہ ہم اس کی حفاظت کریں گے' ہم تو اسی حد تک حفاظت کر سکتے تھے جو باتیں ہمارے علم کے اندر ہوں۔ جو باتیں ہمارے علم میں ہی نہ ہوں' ان کے لئے ہم حفاظت کس طرح سے کر سکتے تھے۔ یہ مفہوم زیادہ چبتا ہوا ہے۔ شھد کے معنی یہ بھی ہو جاتے ہیں' حافظین کے معنی نگران اور حفاظت کرنے والے کے تو ہو سکتے ہیں۔ تو وہ اگر الزام دیں کہ تم جو عہد لے کے گئے تھے پھر لے کے کیوں نہیں آئے تو کہا کہ جہاں تک تو یہ چیز مشروط تھی یعنی محسوس طور پہ سامنے آنے والی جو باتیں تھیں ان تک تو ہم نے پوری پوری حفاظت کی۔ ہم اب بھی کہتے ہیں کہ ہم نے عہد لیا تھا لیکن جو باتیں ہوں ہی پسِ پردہ جن کا ہمیں علم ہی نہ ہو' چوری چوری جس نے وہ کچھ کر دیا ہو' اس پہ ہم اس کی حفاظت کیسے کر سکتے تھے۔ ہمارا اعتبار نہ ہو وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (12:82) جو ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اس نے چوری کی تھی اور اس لئے وہ دھر لیا گیا ہے آپ زیادہ اہم ضروری سمجھئے تو چلئے اس بستی میں' ان لوگوں سے جا کے پوچھ لیجئے گا کہ واقعہ کیا ہوا تھا یا یہ جو قافلہ ہم سے پہلے ابھی ابھی دو دن پہلے چل کے آ گیا تھا ان قافلے والوں سے جا کے پوچھ لو کہ کیا یہ بات یوں ہوئی تھی یا نہیں جو ہم کہہ رہے ہیں۔ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (12:82) اور ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ ہم اس بات میں سچے ہیں جو تمہیں کہہ رہے ہیں۔ اب اس کے بعد حضرتِ یعقوبؑ کا جواب کیا ہے اور بات کیا ہوئی۔ وقت ہو گیا ہے اسے ہم آئندہ لیں گے۔ سورۃ یوسف کی آیت 82 تک ہم آ گئے عزیزانِ من! 83 آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

آٹھواں باب: **سورۃ یوسف** (آیات 83 تا 93)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1974ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یوسف کی آیت 83 سے ہو رہا ہے (12:83)۔

حضرت یوسفؑ کی داستانِ جلیلہ مصر سے واپسی پر غم زدہ باپ کے ساتھ بنیامین کے متعلق بیٹوں کی غلط بیانی اور پھر حضرت یعقوبؑ کے تاثرات

آپ کو معلوم ہے کہ اس سورۃ میں حضرتِ یوسفؑ کی داستانِ جلیلہ مسلسل بیان ہو رہی ہے۔ سابقہ درس میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ حضرتِ یوسفؑ نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ جو باقی گیارہ تھے ان میں سے بھی بڑا بھائی وہ اپنی مرضی اپنے فیصلے کے مطابق

پیچھے رہ گیا' اس نے مناسب نہ سمجھا کہ باپ کے سامنے اس حالت میں جائے کہ اس کا دوسرا بیٹا بھی گم گشتہ ہو جائے۔ باقی بیٹے وہاں سے غلہ لے کر واپس باپ کے پاس آئے۔ پہلے آئے تھے تو حضرتِ یوسفؑ کی خبر دی تھی کہ اس کو بھیڑیے نے کھا لیا اب آئے تو دوسرے بیٹے کے متعلق کہ باپ نے تاکید کی تھی کہ اس کی حفاظت کرنا' وہ بیٹا بھی ساتھ نہ آیا۔ تو اب آپ دیکھئے کہ اس سے کیا کیفیت گذری ہوگی اس پیرانہ سالی میں اس باپ پر۔ بیٹوں نے یہ بتایا کہ وہاں کیا ماجرا گذرا' بتایا یہ کہ تیرے بیٹے نے وہاں چوری کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس شخص نے اولاد کی تربیت خاص انداز سے کی ہو اور پھر وہ بیٹے کے کریکٹر سے بھی واقف ہو' اس کا فوری RE-ACTION یہ ہوگا کہ تم جھوٹ بولتے ہو وہ چوری نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ جو یقین تھا اپنے بیٹے کے کردار کے متعلق اس بنا پر انہوں نے یہ بات کہی کہ نہیں! تم غلط کہتے ہو' کوئی اور بات کہتے تو میں اس کے متعلق کچھ چھان بین کرتا' کچھ تذبذب میں رہتا' یہ بات کہ اس نے چوری کی ہے' یہ غلط ہے۔ تو آپ نے دیکھا کہ بعض اوقات انسان ان CIRCUMSTANCES سے جو خارجی شواہد ہوتے ہیں یا کسی فرد کے کریکٹر کے متعلق یہ یقین ہوتا ہے اس کی بنا پر اس کا ردِعمل کتنا صحیح ہوتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ اور وہ کہہ رہے ہیں مصیبت یہ ہے آپ کی کہ ہم جو بات بھی کہیں آپ اس کے متعلق کہہ دیتے ہیں تم جھوٹ بولتے ہو' تم غلط کہتے ہو' آپ تو ہماری کسی بات کو مانو گے ہی نہیں۔ ہماری بات نہیں مانتے تو **وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْ اَقْبَلْنَا فِيْهَا وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ** (12:82) ہماری بات نہیں مانتے ہم نا قابلِ اعتماد ہو گئے' وہ جو قافلہ اور آیا ہے دوسرا قافلہ ہم سے ذرا پہلے پہنچا ہے' اس سے پوچھو کہ وہاں کیا بات ہوئی تھی اور اس سے بھی زیادہ خود تصدیق کرنی ہے تو چلو وہاں جا کے خود ان بستی والوں سے پوچھ لو' ان شہر والوں سے پوچھ لو کہ یہاں کیا واقع ہوا تھا' ہماری بات تو آپ نہیں مانتے۔ اور مشکل یہ ہے کہ مشہور تو وہاں یہی ہوا تھا کہ اس نے وہ کٹورہ چرایا تھا اور اس کی بوری میں سے وہ کٹورہ نکلا تھا۔ تو کہا جا کے یہ پوچھ لو۔ پھر میں نے کہا ہے کہ اتنا یقین تھا اپنے بیٹے کے حسنِ کردار پر کہ آپؑ نے یہ کہا **قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ** (12:83) کہنے لگے میں اب بھی یہ نہیں ماننے کو تیار' میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ حقیقت میں امرِ واقعہ کیا ہوا ہے' کیا ہے لیکن مجھے کچھ یوں نظر آتا ہے کہ ایک بری بات کو تمہارے دل نے اچھا کر کے تمہیں سجھا دیا' بات تو کوئی اور تھی جو تم نے کی۔

بنیامین پر چوری کا الزام بالکل غلط معلوم ہوتا ہے دل بیدار باپ کے تاثرات

تمہارے دل نے ایک سازش کر کے اس کو ایک ایسے پہلو کے اندر بیان کرنے کے لئے میرے پاس تمہیں بھیج دیا' جو اچھا لگے۔ یہ بات کہ اس نے چوری کی ہے واقعی اگر یہ ہو جائے کہ اس نے چوری کی ہے تو سوال یہ نہیں ہے کہ میں اس کے غم میں یوں آبدیدہ ہو جاؤں' میں تو خود اسے سزا دلواؤں لیکن میں سمجھتا یہ ہوں کہ بات کچھ اور ہوئی' تمہارے جی نے اس کو گھڑا کہ یوں بیان کرو باپ کے سامنے تا کہ

اس کی طرف سے خود ہی اس کا دل میلا ہو جائے۔ ایک بری بات کو تمہارے نفس نے اچھا کر کے تمہیں دکھایا۔ بات تو دو لفظوں میں کہی گئی ہے لیکن بات قرآن نے کہی ہے اور کہنے والے بھی خدا کے ایک نبی تھے' بات بڑی گہری ہے۔ کسی بات یا کسی واقعہ پر انسان کا ری ایکشن یا ردِعمل' ایک تو کیفیت قلبی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو اچھی بات اچھی نظر آئے' بری بات بری نظر آئے' صحیح قلبی کیفیت یہی ہے اور یہی ہے مقامِ مومن: اچھی اچھی نظر آئے بری بری نظر آئے' اسے اقبالؒ دلِ بیدار کہتا ہے دلِ بیدار فاروقؓ دلِ بیدار کراریؓ۔ دلِ بیدار دنیا میں بہت بڑی چیز ہے۔

دنیا کے معاملات سے لاتعلق ہو جانا رہبانیت ہے

اس کے بعد اگلی سٹیج تو فوراً وہ تیسری آ جانی چاہئے کہ بری بات جو ہے' وہ اچھی نظر آئے لیکن ایک اور سٹیج ہوتی ہے وہ اس سے بھی خطرناک ہوتی ہے وہ سٹیج ہوتی ہے انسان کا ان معاملات کے متعلق INDIFFERENT ہو جانا'' کیا بات ہے صاحب ! ہمیں اس سے غرض نہیں ہے ٹھیک ہے برائی ہے برائی ہے' بھلائی ہے بھلائی ہے'' یہ INDIFFERENT جو ہو جانا ہے دنیا کے معاملات سے یہ دلِ مردہ ہوتا ہے۔ یہ INDIFFERENT جو ہے اس کی ابتدا رہبانیت سے ہوتی ہے' تصوف سے ہوتی ہے' قطعِ آلائش جسے کہتے ہیں' ترکِ دنیا جسے کہتے ہیں' دلچسپی نہ لینا کسی معاملے کے اندر' یوں ہوا تو کیا' ووں ہوا تو کیا' یہ ہے جسے اقبالؒ نے دلِ مردہ کہا ہے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

کچھ تو ری ایکشن تیری طرف سے ہو' ارے برائی کو' اچھائی ہی کہہ ری ایکٹ تو کر' سینے کے اندر دھڑکتا ہوا دل تو ہو۔ یہ جو زندگی سے INDIFFERENT ہو جانا ہے وہ موت سے بدتر چیز ہے' یہ وہ موت سے بدتر شے ہے جس کے متعلق فانی کہتا ہے' یہ ہماری شاعری میں عام لوگ جو ہیں' شاعری تو ہمارے ہاں تصوف کا ہی دوسرا نام ہے' کہتا ہے

عالم کی فضا پوچھو محرومِ تمنا سے
بیٹھا ہوا دنیا میں' اٹھ جائے جو دنیا سے

Indifferent رہبانیت سے تصوف اور تصوف سے مقرب ترین بارگاہ خداوندی تک کا سفر طے کرنے کے نتائج

یہ کیفیت ہے اس کی ''بیٹھا ہوا دنیا میں' اٹھ جائے جو دنیا سے'' چیز یہ ایسی جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بدترین شے ہے لیکن آپ

کی رہبانیت' آپ کا تصوف' اسے مقرب ترین بارگاہِ خداوندی کی علامات بتاتا ہے صاحب! ترکِ دنیا' ترکِ معاملات' دل میں کوئی آرزو ہی پیدا نہیں ہو' بیٹھا ہوا دنیا میں' اٹھ جائے جو دنیا سے'' ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ آپ سوچئے کہ اگر اسی قسم سے مقربین دنیا کے اندر سارے ہو جائیں تو دنیا میں کس قدر بدلگام ہو جائے بداخلاقی اور بے حیائی اور ہر قسم کی برائی' برے کو برا کہنے والا ہی کوئی نہ ہو۔

کسی چیز کے اچھے یا برے اخلاقی یا بداخلاقی پہلوؤں کو محسوس تک بھی نہ کرنا انسانی صلاحیتوں کے لیے موت کا باعث ہے

یہ چیز فلاسفی میں بھی آتی ہے انہوں نے اس چیز کو TACKLE کیا ہے ایک چیز MORALITY ہوتی ہے اخلاق والا انسان' ایک IMMORALITY ہوتی ہے جسے آپ بداخلاقی کہہ سکتے ہیں۔ بداخلاق ہے کچھ کرتا ہے تو برا ہی کام سہی' ایک ہوتا ہے IMMORAL وہ جسے میں نے INDIFFERENT کہا یعنی وہ نہ MORALITY ہوتی ہے نہ IMMORALITY ہوتی ہے وہ INDIFFERENT ہو جاتا۔ عزیزانِ من! ETHICS کے اندر یہ بدترین چیز ہوتی ہے کہ آپ کے دل کا کوئی ری ایکشن ہی نہ ہو۔ تو یہ ری ایکٹ کرنے والا جو دل ہے ردِعمل جس دل کے اندر پیدا ہوتا ہے' وہ زندہ دل ہے فیصلے کی غلطی سہی' خواہشات کا غلبہ سہی دل تو وہ زندہ ہے۔ اس زندہ دل کے متعلق تو توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے اندر صحیح فیصلے کی صلاحیت پیدا کر دی جائے' صحیح فیصلہ کرے گا لیکن اگر اسے آپ نے INDIFFERENT بنا دیا IMMORAL بنا دیا'' بیٹھا ہوا دنیا میں' دنیا سے اٹھ گیا'' اس کی اصلاح کی کوئی توقع ہی نہیں رہ سکتی۔ یہ جو کیفیت ہے کہ ری ایکشن ہی کوئی نہیں ہے وہ اس لئے کبھی کبھی وہ مولانا روم (ان کی شاعری میں جوش ہے) وہ یہ چیز کہہ جاتے ہیں کہ ''کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی'' کوئی بیہودہ سی کوشش ہی سہی' سونے سے اچھا ہوتا ہے یہ صحیح بات ہے۔ غلط کوشش سہی' ناکام کوشش سہی' بری کوشش سہی' وہ کہتا ہے کہ یہ سونے سے تو اچھا ہوتا ہے وہ سونا وہ ہے جسے دلِ مردہ کہہ گیا ہے وہ شخص' یہ وہ ہے'' جو بیٹھا ہوا دنیا میں' اٹھ جائے وہ دنیا سے''۔

فریبِ نفس کی کیفیت کا نتیجہ

آپ کے ہاں دیکھتے ہیں کہ یہ چیز پھر انسانوں کے اوپر کتنا اثر انداز ہو جاتی ہے یہ فریبِ نفس ہے۔ اکثر آپ نے دیکھا ہوگا VIRTUE بیان کرنے کے لئے' ارے میاں! ہم نے یہ لطافتیں ہی چھوڑ دی ہیں' یہ دھندے اوروں کے لئے ہیں' ٹھیک ہے وہ کریں جو بھی وہ کرتے ہیں۔ وہ یہ کرتا ہے' وہ یہ کرتا ہے' ہم تو میاں! اپنے ہاں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں یعنی ایک فریبِ نفس ہے۔ زندگی کی یہ کیفیت جو بدترین ہو سکتی ہے اسے ایک بار ہی ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! غلط چیز ہے۔ جن کو زندہ رہنا چاہئے اس میں ردِ

عمل کی صلاحیت ہونی چاہئے' اسے ہر بات کے اوپر REACT کرنا چاہئے۔اب اگلی بات جو ہے کہ اس کا ری ایکشن' اس کا ردِعمل جو ہے وہ صحیح ہونا چاہئے اس کے لئے معیار ہمارے پاس خدا کی اقدار دی ہوئی ہیں' ان کو سامنے رکھو' ان کے مطابق فیصلے کرو' ری ایکٹ کرو۔دوسری چیز یہ ہے کہ بہرحال کبھی غلط ری ایکشن ہی ہو جائے سہی' دل میں صلاحیت تو ہے ری ایکٹ کرنے کی۔

انسانی نفسیات کی تیسری کیفیت کہ جب کوئی شے نہ اچھی لگے اور نہ کوئی بُری تو اس کا نتیجہ قوموں کی موت ہوتا ہے

اور وہ تیسری چیز جو میں نے کہی ہے کہ وہ ری ایکشن ہی کوئی نہیں ہے اس کے اندر۔یہ جو یہ چیز ہے INDIFFERENT ہونے کی یہ ٹشے نے لکھا ہے اس چیز کے متعلق' TOLERANCE کے اوپر اس کا ایک بڑا عمدہ چھوٹا سا THESIS ہے یا پیراگراف ہے کہ جسے آپ TOLERANCE کہتے ہیں' سہار' برداشت' کس کس کی برداشت ہوتی ہے' اسے وہ کہتا ہے کہ TOLERANCE IS A PHILOSPHER کہ جس کے نزدیک نہ کوئی چیز اچھی ہوتی ہے نہ کوئی چیز بری ہوتی ہے۔اس کا نام TOLERANCE نہیں ہے ERECTION ہے اس کا نام۔یہ جو درجہ ہے جیسا میں نے عرض کیا ہے جب قوموں میں یہ چیز عام ہو جاتی ہے پھر وہ قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔

بنیامین کی خبر کے بعد زندہ دل باپ کی کیفیت آپ کے تاثرات اور شفقت پدری کا اظہار

یہاں جو کہا گیا ہے سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ط(12:83) کہ یہ دل زندہ ہیں' غلط بات کو صحیح کر کے بتا رہا ہے کہا یہ ہے تمہاری کیفیت۔تو آپ نے دیکھا ہے کہ یہ لوگ جو تھے ان کی ذہنیت ہمارے سامنے آ رہی تھی۔وہاں حضرتِ یوسفؑ کو گم کیا ہے' آ کے ایک غلط افسانہ گھڑا وہ بتایا' کچھ تو بات سوچی غلط ہی سہی۔یہاں یہ کیفیت پیدا ہوئی کہا کہ اس نے چوری کی انہوں نے یہ بات کہی' حضرتِ یعقوبؑ نے کہا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری جو روش' تمہاری جو ذہنیت ہے کہ اس کے تابع بات کچھ اور ہوئی ہے۔تمہارے دل نے ایک بری بات کو اچھا کر کے دکھانے کے لئے یہ افسانہ گھڑا ہے لیکن چونکہ حقیقت کا مجھے بھی علم نہیں ہے فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ط(12:83) میں اسے برداشت کروں گا کہ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کی خوبصورتی اسی کے اندر ہے کہ ان چیزوں کو ہمت سے برداشت کیا جائے' اس کو برداشت کروں گا۔عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ط(12:83) ہوسکتا ہے کہ یہ سب کے سب پھر واپس آ جائیں۔اب دیکھئے یہ باپ ہے یہ بِهِمْ (12:83) کہا ہے دو نہیں کہا۔یوسفؑ اور اس کا بھائی وہ زیادہ چہیتے تھے۔دونوں وہ گم ہوئے ہیں۔پہلے یوسفؑ گم ہوا ہے پھر بنیامین گیا ہے' یہ تیسرا جو وہاں رہ گیا ہے یہ تو اس گروہ میں کا ایک تھا لیکن یہاں آ کے شفقتِ محبتِ پدری ہے دو نہیں کہا' بِهِمْ (12:83) تینوں کہا

ہے۔ باپ' باپ ہی ہوتا ہے بیٹا نالائق بھی کیوں نہ ہو اس کی محبت موجزن ہوتی ہے۔ وہ بھی تو اس وقت ساتھ نہیں آیا اس لئے کہا یہی ہے کہ امید ہے۔ ورنہ کوئی اور ہوتا تو تھوڑے سے ہی پست لیول کے اوپر کوئی بات معیوب نہیں تھی کہ اس میں یہی کہتا کہ ٹھیک ہے مجھے توقع یہ ہے کہ میرے دونوں بیٹے جو ہیں وہ ضرور آئیں گے وہ جو تیسرا تم کہتے ہو گم ہوا ہے جہنم میں جائے مجھے اس سے کیا ہے' آئے آئے نہ آئے نہ آئے' تم ہو دس تو کیا! میرے لئے تکلیف ہی کا باعث بن رہے ہو یہ نہیں کہا' کہا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ واپس آ جائیں۔ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (12:83) میں تو جو کچھ تم سامنے باتیں کرتے ہو یا جو کچھ میں یہ خارجی شہادات سے کسی نتیجے پہ پہنچ سکتا ہوں' اس بنا پہ میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ جو بھی میں کہہ رہا ہوں کہ آ جائیں گے مجھے یقینی طور پہ پتہ نہیں' جاننے والا تو وہی ہے' وہی حقیقت میں جانتا ہے کہ واقعہ کیا ہوا تھا' میرا اندازہ یہ ہے۔ وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ (12:84) ان سے یہ کچھ کہا لیکن بہرحال دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں' بات ہے کہ جن حالات میں یہ بیٹے گم ہو رہے ہیں' وہ ناقابلِ فہم ہیں' یہ جو آ کے پھر ایک اور بیٹا گم ہوا' تیسرا بھی نہیں ساتھ آیا تو اس نے وہ پہلے بیٹے کی یاد از سرِ نو تازہ کرا دی۔

بیٹوں کی یاد میں حضرت یعقوبؑ کی یاد پر ہمارے ہاں کے مفسرین کا اظہار اور قرآن حکیم کے الفاظ کا مفہوم

پھر دیکھئے! قرآن کا انداز جو ہے ان سے یہ کہا ہے کہ مجھے یہ توقع ہے' میں ابھی تک ناامید نہیں ہوا' ہوسکتا ہے کہ وہ سارے واپس آ جائیں' ان سے الگ ہو کے علیحدگی میں یہ کہا کہ پھر وہی پہلے بیٹے کی گم گشتگی کے واقعہ کی یاد نے رلا دیا۔ اب یہاں یہ الفاظ آئے ہیں ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ ' ہمارے ہاں پھر مفسرین آگے چلتے ہیں کہ حضرتِ یعقوبؑ اسی سال تک بیٹے کی جدائی میں روتے رہے اور روتے روتے اندھے ہو گئے۔ اسی سال تک ایک بیٹے کی جدائی میں اس طرح سے روتے رہنا کہ ہر وقت بیٹھے ہوئے روتے ہی رہنا آنکھیں اندھی کر لینا!! ایک طرف وہ کہہ رہے ہیں فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ (12:83)' اس کا نام صبر ہوتا ہے؟ کہ انسان دنیا دین کے دھندے چھوڑ کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا' دن رات روتا ہی رہے۔ اسی سال تک روتا رہے اور روتے روتے اندھا ہو جائے۔ خدا کا ایک پیغمبرؑ' جس کے ذمے اتنا بڑا مشن ہوتا ہے اور وہ سارا مشن وشن سب بھول جائے' بیٹے کی یاد تو تین بیٹوں کی گم گشتگی نے اس قدر ان کو از کار رفتہ کر دیا کہ اب وہ بیٹھے ہوئے روتے ہی چلے گئے' اسی سال تک روتے چلے گئے اور پھر یہ چیز کہ وہ اتنا روئے اتنا روئے کہ ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ یہ چیز قرآن کے اندر کہیں نہیں۔ یہ جو الفاظ ہیں ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ (12:84) لفظی ترجمہ پھر میں کہوں گا وہی بات آ گئی' یہ لفظی ترجمہ ہے آنکھیں سفید ہو گئیں' دو لفظوں کا ترجمہ اگر کیا جائے۔ لیکن ذرا اور آگے یہ لوگ بڑھ جاتے' بات صاف ہو جاتی۔ یہ ٹھیک ہے بیض جو ہے سفیدی کو کہتے ہیں۔ عربوں کے ہاں وہ ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں بیضة السقٰی لبالب بھر جائے کوئی چیز

صاف شفاف پانی سے' اسے کہتے ہیں وہ شے سفید ہوگئی' مشکیزہ سفید ہوگیا جب وہ منہ تک بھر جائے تو اس کے لئے یہ لفظ بولتے ہیں' پانی جیسی چیز۔اب ہمارے ہاں اس کے لئے آنکھوں کا ڈبڈبا آنا کہتے ہیں''آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں''۔ان عربوں کی تشبیہ بھی کتنی خوبصورت ہے پانی سے مشکیزہ بھر جائے' آنکھوں میں آنسو جو تھے اس سے ڈبڈبا آئے۔دو آنسوؤں سے آنکھیں بھر جاتی ہیں یہ تو مشکیزہ اتنا چھوٹا سا ہے اور شفاف تو ہوتا ہی ہے۔کتنی خوبصورت تشبیہ تھی جو قرآن نے دی۔اب کیا کہوں کہ یہ چیزیں جو ہیں ان مفسرین کے ہاتھ میں آ جائیں گی اور انہوں نے یہ سفیدی کو لیا اور کہا کہ ہاں صاحب! روتے روتے ان کی آنکھیں اندھی ہوگئیں۔قرآن نے کہا یہ تھا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے' یوں نظر آتا تھا جیسا سفید پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ ہو۔ٹھیک ہے حزن سے دل کے اندر از خود اٹھنے والا ایک درد۔

نبی اکرم ﷺ کے بیٹے کی وفات کے موقع پر ان کی آنکھوں میں آنسو

عزیزانِ من! کوئی معیوب بات نہیں۔دل کو اتنا نرم ہونا چاہئے کہ جن واقعات کا اثر دل گدازی ہے' اس سے آنکھوں میں آنسو آ جائیں۔خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کا بیٹا شہزادہ قاسم حالانکہ ابھی بچہ تھا' وہ فوت ہوا ہے تو آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔تو ایک بدو تھا اس نے یہ بات کہی ایک بیٹے کی اس وفات کے اوپر آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو میں نے اپنے ہاتھوں سے پتہ نہیں تین یا سات یا کتنی زندہ بیٹیاں قبر میں دبائی ہیں۔عرب زندہ بیٹیوں کو دبا دیا کرتے تھے۔تو گویا اس نے بظاہر یہ بتایا ہوگا کہ میں اتنا باہمت ہوں کہ میرا دل نہیں کپکپایا اور ایک بیٹے کی موت پہ آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر تیرے سینے میں دل کی جگہ برف کی کاش رکھ دی گئی ہو تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے۔

انسانی جذبات کی اہمیت قرآن حکیم کی روشنی میں

سینے میں گرم دل ہونا چاہئے یعنی یہ ہمارے ہاں محاورہ ہے دل جسے ہم کہتے ہیں' جسے آپ جذبات کہتے ہیں' جذبات نہایت ضروری ہیں' محبت کے جذبات بھی' ہمدردی کے جذبات بھی' غم کے جذبات بھی۔سوال سارا یہ ہے کہ یہ OVER-POWER نہ کر جائیں انسان کے اوپر غالب نہ آ جائیں کہ انہی کا ہو رہے۔یہ کیفیت تھی جسے قرآن نے بیان کیا کہ بیٹے کا درد۔اور آپ دیکھئے کہ یہ چیزیں قرآن اس طرح بیان کر جاتا ہے۔میرے آپ کے نزدیک معیار جو ہیں ہم اور رکھتے ہیں' مبالغہ کرتے ہیں۔تو یا تو مبالغے کی یہ کیفیت کہ ایسا ہونا چاہئے کہ صاحب! آنکھوں میں آنسو آئیں ہی نہیں' سینے میں گویا دل نہ ہو' برف کی کاش ہو گویا یا تو یہ صورت ہو جائے اتنی ہمت اور برداشت اور یا کیفیت دوسری طرف یہ ہو کہ اسی برس تک روتے ہی چلے جا رہے ہیں اور اندھے ہو گئے ہیں' یہ کیفیت ہے۔

قرآن یہ نہیں کرتا قرآن تو بڑی ایک صحیح تفسیر پیش کرتا ہے۔تفسیر پیش کی ہے کہ دل غم سے بھرا ہے' آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔اور یہ چیز جیسا میں نے عرض کیا ہے یہ بے ساختہ ہوتی ہے' ہمدردی کے جذبات کا تقاضا ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ

نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو
دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج

اس غم سے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔بات میں سے بات نکلتی ہے ہمارے ہاں کے مفسرین کی نگاہ تو ادھر گئی ایک شاعر کی نگاہ بھی ادھر گئی' یہ ان کی بتائی ہوئی بات کہ ان کی آنکھیں جو تھیں بے نور ہو گئیں' وہ اندھے ہو گئے لیکن اندازہ لگایئے بات کہنے کا سلیقہ۔غنی کاشمیری' فارسی کا بہت عمدہ بلند پایہ شاعر ہے ان کا یہ ایک مشہور شعر ہے بڑا پیارا شعر ہے' مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشہ کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

کہا کہ ذرا اس کی بدقسمتی پہ' اس کنعان کے بوڑھے باپ کی بدقسمتی کے اوپر ذرا غور کرو اس کی آنکھوں کا نور زلیخا کی آنکھوں کو روشن کر رہا ہے۔آپ نے دیکھا یہاں ''آنکھوں کا نور'' کیا کہہ گیا یہ شخص۔اور واقعی یہ بدقسمتی ہے کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را' کیا انداز ہے بات کہنے کا کہ

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشہ کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

ارے کچھ بات کہنی ہو تو کچھ اس انداز سے تو کہو' یہ تو نہ ہو کہ چالیس سال تک خدا کا نبی روتا ہی چلا گیا اور یہاں تک کہ آپ کی آنکھیں ضائع ہو گئیں!! کیا خوبی ہے جو تم نے بیان کی ہے۔بہر حال غم تھا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آیا کرتے تھے۔

اندر من کا چور ہو تو ہمدردی کے جذبات پھر پیدا ہی نہیں ہوتے

اب بجائے اس کے کہ یہ بیٹے جو تھے یہ اس باپ سے اظہارِ ہمدردی کرتے وہ دیکھا ہے ہم نے جو انہوں نے آ کے کہا تھا کہ تیرے لعل نے وہاں ایک اور چاند چڑھایا ہے' وہ بھی نشتر تھا' اس کے رونے پہ بھی اظہارِ ہمدردی نہیں اس لئے کہ اندر من کا چور تھا کہ یہ اپنا ہی تو کیا ہوا ہے جو یوسفؑ کے ساتھ انہوں نے کیا ہے اور اس کی وجہ سے یہ کچھ ہو رہا ہے یہ بھی تو ہر وقت دل میں کھٹک تھی۔**قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ** (12:85) کہا کہ یہ کیا حالت آپ نے اپنی بنا رکھی ہے ہر وقت یوسفؑ

یوسفؑ یوسفؑ کی رٹ لگا رکھی ہے ہمیں تو نظر آتا ہے کہ تم بس یہ کہتے کہتے مر جاؤ گے اور اگر مرو گے نہیں تو کم از کم ایسے از کار رفتہ ہو جاؤ گے کہ دنیا کا کوئی کام ہی نہیں کر سکو گے' کیفیت یہ کہ ہر وقت تم نے یہی رٹ لگا رکھی ہے۔

اس قدر غم والم کے باوجود صبرِ جمیل کے پیکر کی طرف سے اظہار خیال کا بصیرت افروز انداز

ہمدردی کے بجائے پھر ایک نشتر ہے۔ اِدھر سے یہ کیفیت ہے اُدھر سے جو صبرِ جمیل والا ہے اس کا جواب ہے' بڑا خوبصورت جواب ہے قَالَ اِنَّمَآ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ (12:86) میرے بچو! میں تم سے کچھ نہیں کہتا ہوں' میں تو کسی سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنی تو مجھے اجازت ہونی چاہئے کہ میں اپنے غم والم کا اظہار اپنے خدا کے سامنے تو کر سکوں۔ تم سے تو کچھ نہیں کہتا' تم نے کبھی سنا بھی کہ میں نے کبھی کوئی شکوہ تمہارا کیا ہو ان باتوں کے اندر' میں نے کبھی نام بھی تمہارا لیا ہو' کوئی طعن دیا ہو' کوئی الزام تمہارے سر دھرا ہو' میں تو یہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ورنہ طعن دینے والی بات تو آئی ہے بڑی دل گدازی کی حضرتِ یوسفؑ کی لیکن طعن کی بات اور ہے۔ میاں بیوی میں لڑائی ہو رہی ہے وہ عورت بہت تیز تھی وہ اسے کہنے لگا کہ بھئی! لڑائی کرتی ہو کر وا اپنے لئے تم مجھے بد دعائیں کیوں دے رہی ہو' کہنے لگی میں تمہیں بد دعا کیا دیتی ہوں میں تمہیں کیا کہتی ہوں جو تمہیں غصہ آ گیا ''میں تے سیدھے اپنے آپ نوں بد دعا واں دین ڈئی ہوئی ہیگی آں کہ میں تے ایہو کینی آں پئی یا اللہ میں ہنے ای بیوہ ہو جاں' میں تینوں کی کینی پئی آں' ایویں مینوں کہن ڈیا ہیگاں ایں' میں تے اپنے آپ نوں بد دعا واں دین ڈئی ہوئی ہیگی آں''۔ وہ اپنے آپ کو بد دعائیں بعض اوقات ایسے بھی تو دی جاتی ہیں۔

نبی تو زندگی کے ہر شعبہ میں عظمت کردار کا مالک ہوتا ہے

نبی کی یہ بھی شان نہیں ہوتی یعنی ایک بلند کردار کے انسان کی یہ بھی شان نہیں ہوتی کہ وہ بد دعا بھی کہیں اس قسم کی دے' وہ کہتا ہے کہ میں تو تمہارا نام تک نہیں لیتا ذکر تک نہیں کرتا لیکن بہر حال اپنے خدا کے سامنے تو حزن اور الم کی بات ہے۔ عزیزانِ من! آگے ایک بات کہی اور یہ بہت گہری چیز ہے وَ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (12:86) اور میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ یہاں آ کے ہمارے مفسرین نے پھر وہی بات کہہ دی کہ صاحب! وحی کے ذریعے سے آپ کو معلوم تھا' علم ہو گیا ہوا تھا' یوسفؑ بھی زندہ ہے' وہ عزیز مصر بھی ہے' چھوٹا بھائی بھی اس نے رکھ لیا ہے' سارے واقعات ان کو معلوم تھے۔ کیا بات ہے صاحب! خدا نبی کو بتانے والا وحی کے ذریعے اس یقین کے ساتھ اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ روئے جا رہے ہیں اور خدا کے سامنے وہ اپنا حزن اور شکوہ کر رہے ہیں' وحی کے ذریعے علم ہو رہا ہے۔

اعلم من اللہ مالاتعلمون کے مفہوم کے متعلق ہمارے مفسرین کی غلط نگہی کی نشاندہی

میں نے عرض کیا تھا کہ ان حضرات کی یہ چیز تھی کبھی دو کڑیاں ملاتے نہیں تھے۔ جونہی یہ آیا اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ(12:86) اورانہوں نے جبکہ یہ پہلے سے یہ فرض کر رکھا ہے کہ جب بھی خدا یہ کہے کہ میں تمہیں بتاتا ہوں یا مجھے خدا نے بتایا ہے تو جھٹ سے یہ وحی کے اوپر آ گئے کہ صاحب! بس ایک ہی طریقہ ان کو سمجھاتا ہے کہ خدا نے بتایا وحی کے ذریعے' ذرا نہیں سوچا کہ بات تو یہ پہلی چیز ہے یعنی اسی فقرے میں دیکھ لیجئے اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ(12:86) اگر یہ چیز ہے کہ خدا نے مجھے یہ سب کچھ بتا رکھا ہے تو کوئی بات رونے دھونے کی ہے ہی نہیں۔ وہ زندہ ہے وہ تو عزیز مصر بن گیا ہوا ہے۔ بھائی اس نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ یہ سارے اکٹھے ہو گئے خدا بتانے والا بذریعہ وحی بتانے والا اور یہ اس فقرے کا آدھا حصہ پھر کیا معنی کہ میں تو اپنے غم والم کا اظہار اپنے خدا سے صرف کر رہا ہوں تو یہ غم والم پھر کاہے کے لئے' یہ چیز فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ(12:83) پھر کاہے کے لئے' پھر آنکھوں کا ڈبڈبا آنا کاہے کے لئے۔ انہیں اگر بتانا نہیں تھا تو نہ بتاتے' ان کا تو مذاق اڑاتے' اپنے اندر تو معلوم تھا کیا بات ہے پھر رونا کس بات کا! ایسا ہی انداز ہے جیسا کہ کبھی شاعری میں فلسفہ ہے کہ خدا میں نے کہا ہے کہ بتانے والا لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

یعنی وہ اللہ تعالیٰ وہ تسکینِ خاطر کر رہے ہیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں یہ ہیں کہ رو رہے ہیں (معاذ اللہ معاذ اللہ) ''تیرا وی کی اعتبار ہے''۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیز ہے ہمارے ہاں جو ہو جاتی ہے۔ آپ دیکھئے گا کہیں باہر سے بات نہیں لانی پڑتی' وہیں قرآن کے اندر یہ ساری چیز ہوتی ہے کہ یہاں بہرحال جب وہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ رو بھی رہے ہیں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ (12:83) کہہ رہے ہیں اپنا غم وحزن خدا کے حضور بیان کر رہے ہیں تو یہ نظر آ رہا ہے کہ یقینی طور پہ کوئی چیز معلوم نہیں' وحی کے ذریعے تو کم از کم قطعاً یہ علم نہیں دیا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور کیا جاننے کی بات تھی؟ عزیزانِ من! یہ جاننا تھا یاد کا فلسفہ: عام لوگ نہیں جانتے' بچہ گم ہو جائے تو جب تک اس بچے کی یاد آپ کے دل میں رہے اس کی تلاش کا جذبہ' ہمیشہ بیدار رہتا ہے' آپ اس کے لئے سوچتے رہیں گے' یہ ہو سکتا ہے اور اگر اس کی یاد گم ہو جائے تو یہ جذبہ جو ہے' یہ ختم ہو جاتا ہے۔ خارجی شہادات انہیں یہ بتا رہی تھیں کہ بات یوں نہیں ہوئی جیسا یہ آ کے کہہ رہے ہیں وہ گم گشتہ ہی ہیں۔ گم گشتہ کی یاد اگر دل کے اندر باقی نہ رہے تو پھر ان کے ڈھونڈنے کا' ان کی تلاش کا جذبہ جو ہے یہ باقی نہیں رہتا وہ پھر LOST FOR EVER جسے کہتے ہیں۔ وہ جو ڈوبی ہوئی رقم

بیوپاریوں کے حساب میں ہوتی ہے' جو رقم ڈوب گئی اس کو مرفوع القلم کر دیتے ہیں WRITE-OFF کر دیتے ہیں۔ اگر وہ رکھی رہے اپنے حساب میں کاروبار میں جس کا حساب ملتا نہیں ہے روز شام کو آپ اس کے متعلق پھر نئے سرے سے پھر اکاؤنٹ کرنا شروع کریں گے کہ کہیں غلطی ہوگئی ہے۔ اور جس دن آپ نے اس رقم کو اپنے اکاؤنٹ سے WRITE-OFF کر دیا کبھی دوبارہ آپ حساب چیک نہیں کریں گے اس آئٹم کے لئے۔ یہ جو چیز جو مر گیا ہے اس کی یاد کی تو یہ کیفیت نہیں ہونی چاہئے کہ سوال ہی نہیں اس کی بازیابی کا یا اس کی تلاش کے لئے کچھ تدبیر کرنے کے لئے' جو واقعی LOST ہے۔ لیکن یہ جو حالات تھے جن میں یہ بچے گم ہوئے ہیں اور خارجی شہادتیں اس طرف لا رہی ہیں کہ وہ مرے نہیں ہیں کچھ اور ہوا ہے۔

اپنے بیٹوں کے متعلق حضرت یعقوب کا یہ کہنا کہ تم نہیں جانتے جب کہ میں جانتا ہوں دیکھیے اس کی وضاحت

عزیزانِ من! یہ ان کی یاد جو تھی میں آدھے سانس میں' جو آگے قرآن نے کہا ہے' میں بتا رہا ہوں کہ یہ چیزیں میں نے کہاں سے لیں۔ میں کہاں سے لیتا ہوں ابھی بتاتا ہوں اسی قرآن سے اگلی آیت سے' لیکن یہ جو چیز تھی کہ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ تم چاہتے یہ ہو کہ میں اس یاد کو بھی بھلا دوں اور میں جانتا ہوں کہ یاد کا تازہ رکھنا جو ہے یہ کسی گم گشتہ کی بازیابی کے لئے کچھ کوشش کرنے کے واسطے۔ یاد کا باقی رہنا' فرق ہوتا ہے اس دل میں جن میں یاد بھی باقی نہ رہے یا یاد باقی رہے

کچھ نقش تیری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی' ویراں تو نہیں ہے

یاد کی رمق باقی نہ رہے تو ویران ہو جاتا ہے' کسی گم گشتہ شے کی یاد باقی رہے اس کے لئے کچھ سوچتا ہے' کچھ کرتا ہے دل بے سرو ساماں سہی ویراں تو نہیں ہے۔ اور پھر یہ چیز جو ہے اس یاد کے اندر وہ ٹھیک ہے اور اس سے تھکنا ہی نہیں چاہئے

وہ اپنا کام کرے گا تم اپنا کام کرو
وہ چاہے آئے نہ آئے' تم بلاتے رہو

اگر انسان کے لیے یاد رکھنے کا جذبہ ختم ہی ہو جائے تو پھر تو ہر قسم کی تگ و تاز ہی ختم ہو جاتی ہے

صاحب! یہ جو یاد رہتی ہے یہ بلاتے رہنا ہوتا ہے۔ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (12:86) خدا نے جو مجھے بصیرت عطا فرمائی ہے اس بصیرت کی بنا پہ میں جانتا ہوں کہ ان گم گشتگان کی یاد اگر مجھے تازہ رہے گی ان کی تلاش کا جذبہ بیدار رہے گا۔ یاد بھی اگر میں نے گم کر دی تو پھر کوئی جذبہ بھی بیدار نہیں ہوگا۔ اور میں نے جو عرض کیا ہے کہ یہ چیز جو ہے میری اپنی نہیں' ساتھ ہی تو آیت پڑی ہوئی

ہے اس لئے یٰبَنِیَّ اذۡهَبُوۡا فَتَحَسَّسُوۡا مِنۡ یُّوۡسُفَ وَ اَخِیۡهِ (12:87) اس لئے اے میرے بیٹو! جاؤ۔ دیکھا یہ یاد کے باقی رہنے سے' اگلے ہی فقرے میں اگلی ہی آیت میں بات بتادی کہ یہ کیا چیز تھی جس کے لئے وہ یہ کہتے تھے کہ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے' یہ جذبہ' اگر وہ یاد بھول جائے' قصہ ختم ہو جائے اگلی یہ بات ہی نہیں آتی۔ اس یاد کا فطری نتیجہ یہ تھا جو کہا کہ میرا دل نہیں مانتا کہ وہ ختم ہو گئے۔ قرائن ایسا کہہ رہے ہیں کہ وہ ضرور کہیں باقی ہیں۔

باپ کی طرف سے لڑکوں کو اس مشکل سے نکلنے کے لیے تلاش کرنے کی تلقین

میرے بچو! جاؤ۔ فَتَحَسَّسُوۡا مِنۡ یُّوۡسُفَ (12:87) عزیزانِ من! لفظوں کا کیا انتخاب!! میں نے کہا ہوا ہے کہ بہر حال اتنی سی عربی تو ضرور سیکھ چھوڑیئے' قرآن کا مفہوم تو سمجھ میں آئے گا لیکن یہ جو وہ پھول کی پتی کی نزاکت اور خوشبو ہے' وہ مفہوم میں یہاں پیدا ہو سکے گی۔ ان الفاظ کے اندر جو بلاغت' جو نزاکتیں ہیں وہ تو ان الفاظ کے اندر ہے۔ قرآن کا تو ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ فَتَحَسَّسُوۡا مِنۡ یُّوۡسُفَ (12:87) یہ جسے آپ حواس کہتے ہیں یا حس کہتے ہیں یہ جو طبعی چیز ہے اس کے لئے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ میں یہاں بیٹھا ہوا' اتنی ہمت نہیں ہے کہ اٹھ کے خود جاؤں' ان حواسِ خمسہ سے کام لے کر میں جا کے تجھے تلاش کروں' میں تو ذہنی طور پر یہ چیز کرتا ہوں تم محسوس انداز سے کچھ کرو وہاں جا کے۔ فَتَحَسَّسُوۡا (12:87) عرب یہ اس وقت کہتے تھے جب کسی سے کہا جائے کہ میاں! یونہی پاؤں توڑ کے نہ بیٹھ جاؤ۔ پھر وہ حس باقی نہیں رہتی۔ یعنی میں جو کچھ کر رہا ہوں میں غیر محسوس شکل میں کچھ کر رہا ہوں اس کے لئے' یہیں بیٹھا ہوا سوچ رہا ہوں ایسا ہو سکتا ہے' ایسا ہونا چاہئے' یہ غیر محسوس شے ہے۔ کہا میں جو یاد تازہ رکھ رہا ہوں یہ میں ذہنی طور پہ کچھ کر رہا ہوں تم اذۡهَبُوۡا (12:87) اٹھو جاؤ اور کچھ محسوس طور پہ بھی اس کے لئے کرو۔ عزیزانِ من! یہاں بیسیوں لفظ ہو سکتے تھے تلاش کرنے کے لئے' سراغ پانے کے لئے' کیا تقابل ہے قرآن کا! وہ جو کہا کہ میں خدا کی طرف سے دئے ہوئے علم کی بنا پہ وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور از خود بھی کہہ دیا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ بہر حال ایک ذہنی اور فکری چیز ہے' میں اٹھ کے اتنا نہیں چل سکتا پھر نہیں سکتا پتہ ہے سست ہوں' تم یہ کر سکتے ہو PHYSICAL ACTION جسے آپ کہیں گے یہ ہے۔ میری یہ تلاش MENTAL ہے تم ذرا PHYSICALLY اٹھو' جاؤ تو سہی' اس طرح سے بیٹھ گئے ہو بیٹھتا تو وہ ہے کہ جو نا امید ہو جائے۔ وَ لَا تَایۡـَٔسُوۡا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ (12:87) بیٹھتا وہ ہے جو نا امید ہو جائے' کیوں نا امید ہو کے بیٹھتے ہو!! عزیزانِ من! ایک ایک لفظ اور اس کا انتخاب قرآن کا!!! دیکھتے ہیں کس طرح سے کڑیاں سے کڑیاں ملتی چلی جا رہی ہیں۔

انسان کی ناکامی کی بنیادی وجہ مایوسی ہے اس سلسلہ میں لفظ یاس اور قنوط میں فرق قابل غور ہے

میری تلاش فطری ہے' تم جو آگے کچھ نہیں کرتے تو یہ کیفیت تو اس پہ طاری ہوا کرتی ہے کہ جو مایوس ہو چکا ہوا ہو۔ دیکھا وہ یاد کا تازہ رکھنا بھی مایوسی نہیں ہے مایوس ہو جائے تو پھر تو یاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔تم جو کچھ نہیں کرتے تو محسوس ہوتا ہے کہ تم مایوس ہو رہے ہو' مایوس ہوتے ہو! اِنَّـهٗ لَا يَـايْـئَـسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰـهِ (12:87) یاس بھی تو عربی زبان کا لفظ ہے' قنوط بھی تو اسی کا لفظ ہے' لَا تَـقْـنَطُوْا (39:53) جو ہے وہ بھی تو آتا ہے' بڑے باریک فرق ہوتے ہیں۔ یہ یاس جو ہوتی ہے اس کے اندر ایک علم کا پہلو ہوتا ہے کسی شے کے متعلق عدمِ علم کی بنا پہ مایوس ہو جانا' گم گشتہ کے متعلق یہ بات ہو سکتی ہے اس کا علم آپ کو نہیں ہے۔قنوط یہ ہوتا ہے DEFINITE جس کے متعلق ہو اس کے متعلق مایوس ہو جانا۔ یہاں یہ لفظ جو ہے کیسا خوب ہے کہ DEFINITE علم کی بات نہیں ہے لیکن کچھ شہادات ہیں کچھ قرائن ہیں' جو مجھے اس چیز کے اوپر لے آتے ہیں اس لئے اس عدمِ علم کی بنا کے اوپر تو مایوسی نہیں ہونی چاہئے۔اگر یہ بات DEFINITE ہو جائے کہ واقعی وہ مر چکے ہیں تو ٹھیک ہے وہ تو واپس نہیں آ سکتے' یوں تو یہ نہیں ہونا چاہئے مِنْ رَّحْـمَةِ اللّٰهِ (39:53) وہاں رحمت اللہ بھی آیا ہے لَا تَـقْـنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (39:53) وہاں آؤں گا تو میں عرض کروں گا' رحمت کیوں آیا ہے۔

لفظ ''رُوح' رَوح اور ریح کا لغوی مفہوم اور پھر حضرت یعقوبؑ کی اپنے بیٹوں سے گم شدہ لڑکوں کی تلاش کے متعلق حرکت کرنے کی تاکید

یہ ہے روح 'روح' رَوح بھی یہیں سے ہے ریح بھی یہیں سے روح بھی یہیں سے' ہے راحت بھی یہیں سے ہے۔ان کے اندر ریح میں روح میں بڑے نازک فرق ہیں۔کہا کہ ذرا چلو پھر وذرا ہلو' یہ جو ریح جسے ہم ہوا کہتے ہیں یہ تو موجود ہوتی ہے اس وقت آپ احباب جس جس کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں ہوا اس وقت بھی آپ کے ساتھ موجود ہے ہوا حرکت میں نہیں ہے' یہ پنکھا کیا کرتا ہے! اس کے اندر تو کہیں ہوا نہیں بھری ہوئی یہ آپ کی ساکن ہوا میں حرکت پیدا کرتا ہے۔تو آپ دیکھتے ہیں کتنا فرق ہو جاتا ہے جس جس میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں اور وہی ہوا جب متحرک ہو جائے تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہ جس والی ہوا جس کے اندر ہم بیٹھے ہیں چاروں طرف سے ہمارے گرد ہوتی ہے ہمیں محیط ہوتی ہے' سانس نہیں لیا جاتا اس کے اندر دم گھٹتا ہے' اسی ہوا میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو نئی زندگی آ جاتی ہے۔ یہ ذرا سے جب یہ پتے ہلنے لگتے ہیں شام کو جس کے بعد تو آپ دیکھتے ہیں ایک نئی زندگی کے آثار اس میں پیدا ہو جاتے ہیں' کوئی چیز باہر سے نہیں آتی اسی ہوا کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ریح ہوا کو کہتے ہیں لیکن جب اس کے اندر ذرا سی حرکت پیدا ہو جائے تو اسے رَوح کہتے ہیں۔کہا لَا يَـايْـئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ (12:87) ہوا کی حرکت سے کیوں مایوس ہوتے ہو۔کہا باہر سے کوئی چیز لانے کی

بات نہیں ہے ہوا موجود ہے۔تمہاری کیفیت یہ ہے۔فَتَحَسَّسُوْا (12:87) کے معنی اب سمجھ میں آئے۔کہا ہے کہ ذرا PHYSICALLY اٹھ کے تھوڑا بہت چلو پھرو تو سہی' چلو پھرو اس ساکن ہوا میں حرکت پیدا ہو جائے اور آپ دیکھئے پھر دونوں ہواؤں میں کتنا فرق ہو جاتا ہے۔عزیزانِ من! یہ ہیں قرآن کے الفاظ۔کہاں سے ان کے ترجمے ہونگے! کس کس انداز سے ایک ایک لفظ سے دوسرا لفظ چلتا چلا آ رہا ہے۔میری تلاش فکری ہے تم اسے محسوس شکل کے اندر تبدیل کرو تم پاؤں توڑ کے بیٹھ گئے ساکن ہو کے بیٹھ گئے' مایوسی ہے عدمِ علم کی بنا کے اوپر یہ چیز ہے' اٹھو ذرا حرکت کرو یہ جو اس وقت ساکن ہوا ہے جس میں دم گھٹ رہا ہے اس میں تم دیکھو گے کہ حرکت پیدا ہو جائے گی یہ نسیم بن جائے گی اس کے نسیم بننے سے کیوں مایوس ہو رہے ہو۔

ساکن اور متحرک ہوا میں فرق وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو قوانین خداوندی سے آگاہی حاصل کریں

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (12:87) اس بات سے کہ یہ ساکن ہوا جو ہے اس میں حرکت پیدا ہو سکتی ہے اور ساکن اور متحرک ہوا میں کیا فرق ہوا کرتا ہے' کہنے لگے صرف وہ لوگ اس چیز کو نہیں جان سکتے یا اس سے مایوس ہوتے ہیں جو خدا کے قوانین سے انکار کرنے والے ہوتے ہیں' جنہیں قوانینِ خداوندی کا علم ہوتا ہے ان کو یقین ہوتا ہے وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ ہوا میں حرکت نہیں پیدا ہو سکتی اور حرکت والی ہوا اور ساکن ہوا ایک ہی جیسی ہوتی ہے' قوم الکافرون کہا ہے۔

قرآن حکیم نے تو طبعی قوانین سے انکار کرنے والوں یا انہیں چھپا کر رکھنے والوں کو بھی کافر کہا ہے

اس کفر سے مراد یہ آپ کے ہاں کا اصطلاحی ہندوانہ کفر نہیں ہے یہ تو قرآنِ کریم نے ان قوانینِ طبعی سے انکار کرنے والوں کو بھی قوم الکافرون کہا ہے۔ہمارے ہاں کی ہزاروں مصیبتیں جتنی بھی ہیں' اذیتیں' صعوبات' قوانینِ خداوندی سے کفر کا ہی تو نتیجہ ہیں۔معاشرے کے اندر کی جو انسانوں کی تباہیاں ہیں وہ تو ان قوانینِ خداوندی سے کفر ہے کہ جن کا تعلق اقدار سے ہے' طبعی زندگی کے اندر جو مصیبتیں ہمیں بھگتنی پڑ رہی ہیں وہ تو اس کی وجہ سے ہیں کہ ہم طبعی قوانینِ خداوندی کے کافر ہیں اور قرآن نے ان کو کافر کہا ہے' انہیں جاننے والوں کو مؤمنین کہا ہے ان سے انکار کرنے والے کو کافرین کہا ہے۔اور پھر اور بات آگے چلے تو میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن تو پوچھو نہیں کہاں تک چلتا جاتا ہے۔کافرین کہا ان کے لئے' کفر کے معنی اصل میں انکار کرنا ہی نہیں ہوتا اس کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کو چھپا کے رکھ چھوڑنا' ڈھکے ہوئے کو ڈھکے ہوئے رہنے دینا۔یہ قوانینِ فطرت تو یہاں ساری کائنات کے اندر پھیلے ہوئے ہیں' ان کے اوپر صرف ہمارے عدمِ علم کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔قانونِ فطرت کوئی CREATE نہیں کرتا' کوئی پیدا نہیں کرتا' تخلیق نہیں کرتا اس کو DISCOVER کرتے ہیں اس کے اوپر پڑا ہوا پردہ اٹھا دیتے ہیں۔کفر کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز پہ پڑا ہوا پردہ۔کہا یہ ہے

کہ ان چیزوں سے مایوس وہ ہوتا ہے جو قانونِ خداوندی کے اوپر جو پردے پڑے ہوئے ہیں' پردے پڑے رہنے دیتا ہے۔ جو اس کو اٹھا دیتا ہے وہ مومن ہو جاتا ہے اس کے لئے DISCOVERY کا لفظ ہے' کفر کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کو چھپا دینا۔

آخر کار حضرت یعقوبؑ کی طرف سے سال ہا سال کے صبر و استقامت کے عمل نے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے دلوں میں حرکت و لجاجت پیدا کر ہی دی

باپ کے اس کہنے سے' اکسانے سے' آمادہ کرنے سے' فَتَحَسَّسُوْا (12:87) سے وہ اٹھے چلے پہنچے۔ پھر درمیان کی کڑیاں بیان کرنے کی ضرورت قرآن نے محسوس نہیں کی۔ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ (12:88) اب آپ دیکھئے کتنی بڑی تبدیلی آ رہی ہے اس ذہنیت کے اندر' اب لجاجت ہے اب گڑگڑاہٹ ہے اب جھکاؤ پیدا ہو رہا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ (12:88) یعنی اب تخاطب بھی آپ دیکھتے ہیں کہ اس منصب کو کہ اے صاحبِ عزت و جلال! مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ (12:88) ہم اور ہمارے اہلِ خاندان بڑی تکلیف میں ہیں۔ اب ہمدردیاں اس کی واپس لا رہے ہیں۔ وہ کہنا یہ تھا کہ اس بھائی کو چھوڑ دو اس لئے اب اس میں لجاجت آ رہی ہے' باپ نے اس طرح سے ڈانٹ کے بھیجا ہوا ہے' لجاجت آ رہی ہے۔ یہ ہے بات قرآن کی!! مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ط(12:88) بڑی مصیبت میں گھرانہ ہے اور ہماری کیفیت یہ کہ اب ہمارے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں ہے کہ اس سے ہم غلہ خرید سکیں' یہ تھوڑی سی پونجی ہمارے پاس تھی۔

قرآن حکیم کے مرادفات میں سے الفاظ کے انتخاب پر علامہ پرویزؒ کی قلبی کیفیت

عزیزانِ من! میں کیا کہوں الفاظ آتے ہیں قرآن کے میں اپنے آپ میں نہیں رہتا' میرے سامنے ہوتے ہیں کئی مرادفات جو استعمال ہو سکتے ہیں۔ بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ (12:88) بضاعت تو وہی سرمایہ' کسی کی کل کائنات' بضاعت تو ہمارے ہاں بھی لفظ استعمال ہوتا ہے بے بضاعت ہے۔ مُّزْجٰةٍ (12:88) تھوڑے کے لئے بیسیوں الفاظ ہیں' عربی زبان کے اندر' ذرا تصور میں لائیے خریدار اور دوکاندار' قیمت ہو رہی ہے جو قیمت طے ہوتی ہے یا جو قیمت دینی ہے وہ قیمت پوری اپنے پاس ہے' وہ قیمت رکھی ہوئی ہوتی ہے' شے خود کھنچ کے اس کی طرف آ جاتی ہے پوری قیمت کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے اور اگر پلے پوری قیمت نہ ہو وہ تھوڑی ہو' یہ جو تھوڑا سا سرمایہ یا تھوڑی سی جو قیمت اپنے پاس ہے جو رکھی ہے یہ لفظ مُّزْجٰةٍ (12:88) کے معنی ہوتے ہیں جو اپنے پاؤں نہ چل سکے' دھکیل کے جسے آگے کرنا پڑے' پورے پیسے ہوتے تو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ طے ہوا ہوا تھا کہ یہ اس کی قیمت ہے یہ اس کی شرح ہے' یہ ہمارے پیسے ہیں اور ہم رکھ دیتے چیز بھاگ کے آتی۔ کہا یہ وہ مُّزْجٰةٍ (12:88) ہے کہ جو اپنے پاؤں پہ اس تک نہیں پہنچ سکتی ہم اسے دھکیل کے لائے ہیں۔ یا

اللہ!!! عزیزانِ من! یہ ہے انتخاب الفاظ کا جسے کہتے ہیں۔ دیکھا یہ بات تو کہنے کی تھی کہ برابری کا سودا نہیں ہے ورنہ وہاں بکتا تھا غلہ۔ بکتا تھا قیمتاً دیتے تھے کسی کی خوشامد نہیں' کچھ نہیں' قیمت اس نے طے کی ہوئی ہے چیز رکھی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے ہمارا یہ سرمایہ ہے جو خود بڑھ کے آگے نہیں جا سکتا وہ چیز بڑھ کے اس کی طرف نہیں آ سکتی ہم اسے دھکیل کر آگے پہنچا رہے ہیں۔ فَاَوۡفِ لَنَا الۡکَیۡلَ (12:88) اور پھر درخواست بھی یہ ہے کہ جتنی یہ ہے اتنا ہی تو اگر غلہ دیتا تو اس کو دھکیل کر پہنچانے کی ضرورت نہیں تھی پھر تو برابری کا سودا تھا۔ یہ اتنی سی جو ہے یہ جسے ہم دھکیل کے تیرے پاس پہنچا رہے ہیں یہ اتنی سی قبول کر لیکن غلہ پورا دیدے۔ دیکھا یہ دھکیلی ہوئی قیمت اور جو خود چل کے جاتی ہے قیمت' کیا فرق ہے دونوں کے اندر!! کبھی کبھی اس قسم کی چیز ہوتی ہے میں کہتا ہوں یہ DRAMATICALLY ہوتی ہیں جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ مجھے تو زیادہ کاروبار کا پتہ نہیں' بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ وہ دوکاندار اتنے پہ دینے پہ راضی نہیں ہوتا۔ یہ تھوڑی ہوتی ہے اس کے لئے' جس کے پاس تھوڑی ہوتی ہے تو آپ کو پتہ ہے پھر وہ تنازعہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے ہاتھ میں روپیہ ہوتا ہے وہ دے رہا ہوتا ہے ''او جی! تسی لے لو میں کہیا کہ ٹھیک ہے مینوں پتہ ہے گھٹ ہیگے نیں گھٹ ای لے لو'' یہ کر رہا ہوتا ہے اس طرح سے خریدنے والا' وہ پیچھے ہٹ رہا ہوتا ہے وہ دھکیل رہا ہوتا ہے یہ اس کو کہہ رہا ہوتا ہے۔ یہ نقشہ جو آپ دیکھتے ہیں یہ ہے بِبِضَاعَةٍ مُّزۡجٰىةٍ فَاَوۡفِ لَنَا الۡکَیۡلَ (12:88) کہ بھئی! کیسے دیدوں! پیسے تو اتنے ہیں' غلہ پورا مانگتے ہو' کیسے دیدوں! وَ تَصَدَّقۡ عَلَیۡنَا (12:88) یہ بھی تو ہوتا ہے' یہاں ہم بیع وشرٰی کا معاملہ کرنے کے لئے نہیں آئے بھیک مانگنے کے لئے آئے ہیں بھیک تو اِنَّ اللّٰہَ یَجۡزِی الۡمُتَصَدِّقِیۡنَ (12:88) اور تم تو اپنا باقی جو رہ گئی قیمت ہماری وصول کرنا چاہتے ہو تو تم ہی نے تو کہا تھا کہ خدا پوری کر دیا کرتا ہے باقی وہاں سے لے لینا ہمیں دیدو۔ عزیزانِ من! کوئی ان چیزوں کو DRAMATIZE کرنا چاہے تو آپ دیکھئے کتنا EFFECTIVE انداز ہے قرآن کے اس ڈائیلاگ کا۔ یَجۡزِی الۡمُتَصَدِّقِیۡنَ (12:88) کیا الفاظ ہیں! کمی رہ گئی ہے ٹھیک ہے' کہاں سے یہ پوری ہوگی' ہونی چاہئے' تو بیچنے والا ہے تم نے ہی تو بتایا تھا کہ یہ کمیاں جو ہیں پھر وہ پوری کر دیا کرتا ہے۔ جو چیز تصدق میں دے دی جاتی ہے وہ قیمت تو پوری نہیں ملتی لیکن وہ پوری کر دیا کرتا ہے اتنی ہم سے لے لو اور اتنی اُس سے لے لو' اب تو معاملہ ٹھیک ہو گیا اب تو پورا غلہ دیدو۔

حضرت یوسفؑ کی طرف سے پورا غلہ دینے کے اظہار پر بنیامین کے متعلق ایک سوال

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ جب حضرتِ یوسفؑ نے سمجھ لیا کہ زیادہ عرصے تک اس بات کو یوں نہیں رکھنا چاہئے بات کھول دینی چاہئے کیونکہ انہوں نے باپ کی کیفیت بتائی ہوگی کہ وہاں کیا صورت پیدا ہوئی ہے' حالات کیا پیدا ہوئے ہیں۔ تو انہوںؑ نے کہا کہ کہیں یہاں تک بھی نہ پہنچ جائے کہ وہ باپ جو ہے آخر تک اسی غم سے مر جائے یا یہ چیز ہو۔ وقت وہ آ گیا بہرحال۔ کہا کہ میں نے سن لیا ہے

ٹھیک ہے میں دونگا ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ (12:89) کہا کچھ یاد پڑتا ہے تمہیں کہ تمہارا بھائی یوسفؑ ہوا کرتا تھا اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ بات غلے کی ہو رہی ہے یہاں یہ عزیز مصر بیٹھا ہوا ہے یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور پھر یاد ہے جو اس دن میں نے آپ سے کہا تھا وہ جو واقعہ تھا بوری میں کٹورہ کس نے رکھ دیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ وہاں قرآنِ کریم نے فاعل نہیں بتایا کس نے رکھ دیا ہے' وہاں نہیں بتایا یہاں بتایا ہے۔ کہا کہ یوسفؑ سے کیا کیا تھا اور پھر وہ جو یوسفؑ کا بھائی تھا پھر اس کے ساتھ تم نے یہاں کیا کیا تھا' عَلِمْتُمْ کچھ یاد پڑتا ہے!!

یہ مقام نبوت یہ ہے کہ وہ کسی کو شرم سار کرنا نہیں چاہتی

جرم ثابت ہے بتا رہے ہیں' اپنی طرف سے یہ چیز نہیں کہہ رہے ہیں کہ تمہیں بتاؤں مجھے سب یاد ہے تم نے یوسفؑ کے ساتھ کیا اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا' انداز انداز' کچھ تمہیں یاد پڑتا ہے تم نے کیا کیا۔ اور آگے ہے اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ (12:89) جبکہ بالکل تمہاری جہالت تھی جس کے لئے تم نے یہ ایسا کیا۔ کسی بھی مجرم سے یہ بات کہہ دیجئے آپ دیکھتے ہیں وہ شدت جو ہوتی ہے اس کی وہ کم ہو جاتی ہے۔ تمہاری نادانی تھی تم نے نادانوں کی طرح نادانی میں' جہالت میں کیا کیا۔

برادران حضرت یوسف پر حقیقت کا انکشاف حیران کن تھا

اب کچھ یاد آ رہا ہے کیا کیا۔ سوچ لیجئے کہ وہ کھڑے ہیں انہیں پتہ نہیں ہے' وہ عزیز مصر کے ہاں آئے ہوئے ہیں' غلہ مانگ رہے ہیں' متصدقین چاہتے ہیں کچھ علم نہیں ہے کہ یہ کیا چیز ہے' وہؑ یہ جو بتاتا ہے تو اب ذہن اس طرف جا رہا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن نے جس انداز میں یہ الفاظ بیان کئے ہیں میں نے گذارش کیا ہے کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ ایسے میں آپ دیکھئے کہ جسے ہم کہتے ہیں کہ کس طرح سے بھونچکے رہ گئے ہونگے کہ یہ کیا ہے قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ (12:90) عزیزانِ من! قرآن کا انداز دیکھئے وہ سیدھی سی بات تھی کہ تو یوسفؑ ہے' نہیں! ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ (12:90)۔ میں بھی وہ بات یوں نہیں کہہ سکتا جو ان الفاظ میں ہے۔ EXACTLY یہ انداز ہوگا ان کا کہنے کا ارے اچھا یہ آپ آپ یوسفؑ ہیں ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یہ ہے قرآن۔ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ (12:90) پہلی دفعہ یہ کہ جس یوسفؑ کے ساتھ' یہاں انا کا لفظ استعمال ہو رہا ہے' عدالت کی کرسی پہ بیٹھے ہوئے ہیں وہاں تو ہر جج کو ''ہم'' کہنا ہوتا ہے ''میں'' نہیں کہہ سکتا وہ اس وقت نمائندہ ہوتا ہے کسی اور حکومت کا۔ وَ هٰذَآ اَخِيْ (12:90) یہ ہمارا بھائی ہے۔ اب وہ انا جو کہا ہے اس کی وجہ سے کہ اس میں تو ذرا تھوڑا سا تکبر پایا جاتا ہے' کہنے کے ساتھ دوسرا لفظ ہے قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ (12:90) یہ صرف اس کا پلٹ ہے۔ انا سے انانیت نہ پیدا ہو جائے بلکہ اس کے فضل و کرم سے بھی تو وہ مقامات مل سکتے ہیں جہاں میں والا' ہم کہہ سکتا ہے۔ اور جسے کہنا پڑتا

ہے عدالت کی کرسی پہ تو وہ اتھارٹی ہوتی ہے اس کا کم حق ہوتا ہے کہ وہاں ہم کہے ''ہمارے دستخطوں اور مہرِ عدالت سے یہ جاری ہوا''۔ وہاں کہا ہے تو اسی سانس میں قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ط (12:90) یہ خدا کا فضل تھا احسان تھا جو اس نے ہم پہ کیا۔

خدا کا فضل و کرم انسان کے اپنے اعمالِ حسنہ اور کردار کے ساتھ مشروط ہوتا ہے جسے تقویٰ کہا گیا ہے

بات وہاں آ گئی کہ ٹھیک ہے صاحب! خدا کا ہی احسان تھا تو اس میں تمہارے کرنے کی تو کوئی بات نہیں تھی' کہا کہ نہیں یہ بات نہیں ہے' یہ ہے اس کا احسان' میں اس کے حضور سجدہ ریز ہوں لیکن وہ یونہی نہیں ہوتا کہ ''جینوں چاہے ککھوں لکھ کردے تے جینوں چاہے لکھوں ککھ کردے'' یہ بات نہیں ہے۔ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ (12:90) یہ اس کا فضل' اس کا احسان اس پہ ہوتا ہے جو اس کے قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتا ہے اور پھر برداشت کرتا ہے ہر قسم کی صعوبات کو' اس کا نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے۔ یعنی فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (12:90) جو بھی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے وہ اس کو اجر دیا کرتا ہے۔ یہ اجر ہے جس کو میں نے اس کا احسان کہا ہے' مجھے یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ میں نے یہ کچھ کیا' تقویٰ کیا' محسنین کی سی زندگی بسر کی اس لئے میں نے یہ حاصل کیا۔ بہرحال بایں ہمہ یہ اس کا فضل ہے لیکن یاد رکھو! یہ یونہی فضل نہیں مل جایا کرتا۔ دیکھتے ہیں ایک ایک فقرے' ایک ایک لفظ کے اندر کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔

داستانِ حضرت یوسف تو اپنے اندر انسانی زندگی کے بے شمار پہلو لیے ہوئے ہے

عزیزانِ من! کیا یہ محض داستان ہے کسی گذرے ہوئے پیغمبر کی' کیا ایک کہانی ہے' کیا ایک افسانہ ہے جو قرآن بیان کر رہا ہے' کوئی فقرہ بھی ایسا آیا ہے کہ جس میں میرے آپ کے ہمارے دور کے یا قیامت تک کے انسان کے لئے ایک اعلیٰ قدر اس کے اندر نہ چھپی ہوئی ہو۔ انا کہا ہے تو ساتھ میں قَدْ مَنَّ اللّٰهُ (12:90)' قَدْ مَنَّ اللّٰهُ (12:90) کہا ہے تو فوراً یہ چیز کہ یہی نہ ہو جائے کہ صاحب! پھر ٹھیک ہے تمہارا اس میں کیا ہے' مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (12:90) تم بھی ایسا کر سکتے ہو' اس کا یہ مطلب ہے' وہ میں نے طریقہ بتایا ہے' تم نے ایسا نہیں کیا تم اس سے محروم رہ گئے۔ میں نے ایسا کیا ہے مجھے وہاں سے یہ چیز مل گئی۔ اگلے الفاظ پھر قرآن کا ایک اور لفظ آتا ہے قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ (12:91) انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے واقعی خدا شاہد ہے۔ عزیزانِ من! اس لفظ اٰثَرَكَ اللّٰهُ (12:91) کا عام طور پہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ خدا نے تمہیں ہم پہ واقعی فضیلت دی ہے یہ درجہ دیا ہے اور ہم خطا کار تھے۔ پھر وہی بات کہ یہ اٰثَرَكَ اللّٰهُ (12:91) کیا لفظ ہے جو استعمال کیا گیا ہے؟ اثر آپ کو بھی معلوم ہے اثرِ خامہ آپ کو پتہ ہے کہا کرتے ہیں' اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں نقش و نگار جسے آپ کہتے ہیں اس کے لئے لفظ

آتا ہے' کسی چیز کے اندر رنگ بھرنا' نقش جسے کہتے ہیں کوئی چیز پیدا کر دینا۔ یہ کیا کہہ گئے ہیں؟ کہا انہوں نے یہ کہ طبعی طور پہ تو تم ہمارے ہی بھائی تھے اسی خاندان کے تھے جس کے ہم ہیں' اب یہ جو فرق ہے یہ کیا ہے؟ عزیزانِ من! کوئی ادیب اس کو پہچانے گا۔ مصور کہتے ہیں جو وہ پہلا خاکہ کھینچتا ہے مصور صرف پنسل سے اس کو کہتے ہیں انگارہ' ایک خاکہ SKETCH۔ کہا کہ جہاں تک اس انگارے کا تعلق ہے اس خاکے کا تعلق ہے وہ تو تم ہمیں میں سے ہو' ایک ہی جیسے تھے لیکن فطرت کے خامے نے جو رنگ آمیزیاں تمہارے اندر کی ہیں' وہ ہمیں کہاں میسر صاحب!!

جسم خاکی میں نقش حسن و جمال سے آراستہ بااصول زندگی کی رعنائیوں کی یہ چمک ہم سب کے لیے قابل رشک ہے

جو اس خاکے کے اندر نقش و نگار اس خامۂ فطرت نے کر دئے ہیں وہ ہم میں کہاں!! خاکہ وہی تھا بنیادی طور پہ تم ہم میں سے ہی تھے' ہیولیٰ پیدائشی طور پہ پیکر وہی تھا۔ لفظ دیکھتے ہیں یہ اٰثَرَکَ اللّٰہُ (12:91) کے کیا معنی ہوئے! کیا بات ہے جو اس کے اندر کہی گئی ہے! ایک ہی خاندان کے چند افراد تھے' خاندانی اعتبار سے' پیدائشی اعتبار سے' خون رنگ و نسل کے اعتبار سے وہ سارے ایک ہی جیسے خاکے تھے' اسے خاکہ کہا ہے خدا نے کہ یہ صرف خاکے ہوتے ہیں جو وہاں سے آتے ہیں اب ان خاکوں کے اندر رنگ کس کس قسم کا بھرا جاتا ہے نقش کس قسم کے کئے جاتے ہیں وہ ان کی اپنی ذاتی خصوصیات' جوہر جو ہوتے ہیں اس کی بنا پہ ان کے اندر نقوش بھرے جاتے ہیں۔ لَخٰطِئِیْنَ (12:91) ہم خطا کار تھے ہمارے اندر اس قسم کا رنگ بھرا گیا' تو محسنین میں سے تھا تیری رعنائیاں یہ چمک اٹھیں قَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا (12:91)۔

قرآن حکیم میں دیئے گئے مرادفات کی اہمیت اور انفرادیت

عزیزانِ من! میں جو وہ کہا کرتا ہوں اپنے لئے نہیں کہتا قرآن فہمی کے لئے یہ کہا کرتا ہوں کہ قرآن کے کسی ایک لفظ سے بھی یوں آگے نہ گذر جایئے' آگے آجائے تو بیٹھ جایئے اس کو لے کے۔ خصوصیت سے اس لئے کہ عربی زبان کے بے شمار مرادفات ہوتے ہیں ایک بات کے کہنے کے لئے۔ بیٹھ جایئے یہ سوچنے کے لئے کہ یہاں ان میں اس لفظ کو کیوں چنا گیا۔ یہ یہاں فضل اللہ کیوں نہیں بات آئی' ان کی زبان سے کیوں نہیں بات آئی۔ اس نے تو اس کو من اللہ کہہ دیا کہ ٹھیک ہے بھئی! اس کا یہ احسان ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ وہ تقویٰ اور صبر اور حسن کارانہ زندگی جو ہے' یہ بہر حال اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ چیز ان کی زبان سے یہ کہہ رہا ہے کہ نہیں صاحب! ہم جانتے ہیں یوں کہئے کہ خاکہ اور ہیولیٰ اور پیکر تو وہی تھا جو ہمارا ہے تو ہم میں سے ہی تھا لیکن یہ حسین نقش و نگار جو تیرے اندر ہو گئے ہیں یہ ہے وہ چیز جو ہم پہ تمہیں فضیلت دے رہی ہے اور یہ اس لئے کہ تو نے وہ تقویٰ کی زندگی بسر کی وَ اِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ (12:91) ہم خطا کار

تھے اور اس لئے ہمارا خاکہ ان سے محروم رہ گیا اور تیرے خاکے کے اندر رعنائیاں بھر دی گئیں۔ عزیزانِ من! وہ جسے حسنِ یوسفؑ کہتے ہیں وہ حسنِ یوسفؑ اس پیکر کی رعنائیوں کا نام نہیں تھا وہ تو یہ سیرت کی رنگینیاں ہیں جو ایک لفظ میں وہ بھائی کہہ گئے **قَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ** (12:9) یہ سیرت کی رنگینیاں نظر آ رہی ہیں۔ اب آپ نے سوچا کہ یہ داستان ایک فرد کی کیوں مسلسل بیان ہو رہی ہے۔ بھائیوں نے یہ کہا' ادھر سے یہ چیز انہوں نے کہا **کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ** (12:91) جُرم کا اقبال کر لیا جی! ٹھیک ہے ہم خطا کھا گئے ہم نے یوسفؑ کے ساتھ بھی وہ کچھ کیا' اس کے بھائی کے ساتھ بھی وہ کچھ کیا تسلیم ہے جرم کا اقرار ہے۔ اُدھر سے کیا ری ایکشن ہوتا ہے؟ تم نے جرم کا اقرار کر لیا' وہی ری ایکشن جو قصۂ ابلیس و آدم کے اندر ہوا تھا یہ **خٰطِئِیْنَ** . ہم خطا کار ہیں **رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا** (7:23) جب کہا ہے آدم نے کہ ہاں! ہمارے رب ہم سے خطا ہوئی ہم بھول گئے ہم سے غلطی ہوئی ہمیں احساس ہے ہمیں ندامت ہے ہمیں اعتراف ہے اس چیز کا ہم اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں' یہ مقام تھا جب یہ کہا گیا کہ کوئی بات نہیں! **فتاب اللہ علیکم** لوٹ آئے ہم تمہاری طرف' روٹھ کے چل دئے تھے ہم آ گئے تمہاری طرف۔ یہ ری ایکشن ہونا چاہئے ایک مومن کا۔ انہوں نے کہا **اِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ o قَالَ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ** (91:92)

اثباتِ جرم کے بعد لفظ تثریب ایک قابل غور عمل ہے

پھر ترجمہ ہو جائے گا کہ آج تم پہ کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ مواخذہ خود عربی کا لفظ ہے۔ یہ **تَثْرِیْبَ** (12:92) کیا ہے؟ یہ لفظ بہت کم استعمال ہوا ہے **لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ** (12:92) تثریب کہتے ہیں کہ ملزم کا جرم ثابت ہو جائے وہ مجرم ثابت ہو جائے' اثباتِ جرم کے بعد اسے معاف کر دیا جائے اور معاف ایسا کیا جائے کہ پھر زندگی بھر اس کو یاد نہ دلایا جائے کہ تم سے یہ جرم سرزد ہوا تھا اس وقت تثریب ہو گی۔ یہی نہیں کہ میں نے اس وقت تمہیں معاف کر دیا' اب انا سمجھ میں آتی ہے عدالت کی کرسی پہ بیٹھے ہوئے' تم نے جرم کا اعتراف کر لیا تھا گنہگار تھے چاہتا تو اسی وقت تمہیں پھانسی پہ لٹکا سکتا تھا یہ بات نہیں ہے' تم نے **خٰطِئِیْنَ** (12:91) کہا ہے اقرارِ جرم کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ تم میں اصلاح کی صلاحیت ہے اس لئے جرم کی تو معافی ہے' معافی یہاں نہیں کہا کہ اس میں کچھ نہ کچھ INFERIORITY PERCEPT رہ جاتا ہے' کہا یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے اس وقت معافی ہے اس کی سزا بھی میں نہیں دیتا اور اس کے بعد' اس کے بعد وہ جو غالب نے کہا تھا کہ

قسم لے لو جو ہم یہ بھی کہیں
کیوں! ہم نہ کہتے تھے

عزیزانِ من! معاف کر دینے کے بعد بھی یہ کبھی کہہ دینا کہ کیوں بھئی! یاد ہے' ٹھیک ہے' ویسے ٹھیک ہے میں نے تم سے کچھ انتقام نہیں لیا اس وقت بھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا ویسے میں تمہیں یاد دلا رہا ہوں' یاد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے تو بیس درجے اچھا تھا کہ

مجھے پھانسی دے دیتا' یہ عمر بھر کے لئے یہ چیز جو ہے ''جنوں کیندے نیں رڑکا ندے رہناں'' بڑا عجیب لفظ ہے ''رڑکا ندے رہنا'' وہ اچھا بھلا وہ بنولا وہ ہاتھ کے اندر کہیں آ جاتا ہے غلطی سے' وہ چھپا ہوا ہوتا ہے ''اونہوں رڑکا یا جائے تے فیر دیکھو ہوندا کی ہے''۔ یہ جو ہے عمر بھر کے لئے یہ چیز کرنا۔

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

لفظ لاتثریب کا لغوی قرآنی مفہوم کہ کسی کے جرم کو بار بار نہیں دہرانا چاہیے

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:92) کبھی یاد نہیں دلاؤں گا اس کے بارے میں کہ تم نے کیا کیا تھا۔ اور یہی چیز تھی جو ہماری تاریخ میں حضورِ نبی اکرم ﷺ نے بھی تیرہ سال مکے کی زندگی کے' چھ سات سال مدینے کی زندگی کے' یہ قریش نے کیا کچھ نہیں کیا حضور ﷺ کے ساتھ اور وقت وہ آ گیا جب یہ قیدیوں کی طرح پابجولاں سامنے آ گئے سب کے سب۔ پوچھا کہ اس وقت تمہاری کیا سزا ہو سکتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ جنگ کے قیدیوں کی جو سزا ہوا کرتی ہے وہی' کہا کہ تمہیں اس کا اعتراف ہے کہ تم نے یہ کچھ اس دوران میں کیا تھا؟ کہنے لگے ٹھیک ہے ہم اس کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ اب اس انتظار میں تھے جو بھی سزا ہو سکتی تھی' اس کی سزا موت بھی تو ہو سکتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! میرے بھائی یوسفؑ نے جو اپنے بھائیوں سے کہا تھا محمد ﷺ اپنے بھائیوں سے وہی کہنا چاہتا ہے **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) حضور ﷺ نے وہاں یہ آیت دہرائی ہے۔ اور تثریب پھر یہی تھی کہ اس کے بعد اس کے متعلق یہ گذشتہ تئیس سال میں یا بیس بائیس سال میں تم نے کیا کچھ ہمارے ساتھ کیا تھا' اسے کبھی رڑکایا بھی نہ جائے۔ آپ ﷺ نے تو یہ فرما دیا تھا کہ **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) لیکن ہمارے بعد میں پھر اب۔

فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی کشادہ ظرفی لیکن ہمارا رویہ

لیکن ہمارے ہاں اب یہ چیز چلی آ رہی ہے کہ صاحب! ٹھیک ہے یہ ایمان تو یہ سارے لے آئے تھے یہ فتحِ مکہ کے بعد ایمان لائے تھے تو ان کو ہم کس طرح سے پکے مومن قرار دیدیں۔ یعنی وہ فرما رہے ہیں **لَا تَثْرِيْبَ** اور دیکھا پھر یہ لفظ تثریب کیوں آپ ﷺ نے استعمال فرمایا تھا؟ اپنے لئے تو سینۂ نبوی ﷺ میں اتنی کشادگی تھی کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ ﷺ کبھی رڑکاتے' وہ یہ تھا ہمارے لئے سبق کہ تثریب کا لفظ جن کے لئے میں بولتا ہوں ان کو تم نے رڑکانا نہیں کہ ''تسی کی کردے رہئے ہیگے او''۔ اور ہماری ساری کاوشیں' ساری کوششیں اس میں صرف ہو جاتی ہیں کہ ہم اس تئیس سال کے ان کے جرائم جو ہیں رڑکائیں ہی نہیں بلکہ اگر ہمارے بس میں ہو تو قبروں سے نکال کے ان کو پھانسی دیدو۔ کہنے والے نے کہا تھا **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92)۔ عزیزانِ من! لفظوں کے انتخاب

کے یہ معنی ہوتے ہیں یہ شاعری نہیں ہوتی کہ وہ وزن میں لفظ اگر شہد فٹ نہیں بیٹھتا تو انگبیں لکھ دیا' شاعری نہیں ہے' لفظوں کا استعمال' انتخاب بڑی چیز ہے۔ حضورﷺ نے اس وقت یہ فرمایا تھا' میرے ذہن میں فوراً یہ بات جو میں نے ابھی عرض کی تھی کہ وہ اس لئے صحابہؓ سے یہ کہا ساتھیوں سے یہ کہا کہ میں نے تو یہ کچھ کیا ہے اور کہا ہے' حضورﷺ نے وہاں تثریب کیوں فرمایا؟ پہلے تو اپنے مخاطبین سے یہ چیز کہی کہ ٹھیک ہے اس تئیس برس میں تم لوگوں پہ جو زخم ان کے ہاتھوں سے پہنچے ہیں مجھے پتہ ہے کتنے ہونگے' یہ اس کے بعد اب ایمان لائے ہیں' آئیں گے ہمارے تمہارے اندر رہیں گے۔ اس اندر رہنے میں یہ چیز ہوسکتی ہے کہ کبھی وہ زخم یاد آ جائے اور تم ان کے بعد اس کو رڑکا دو کسی طرح سے' آپﷺ نے فرمایا **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) مواخذہ نہیں کہا' انتقام نہیں کہا کہ یہ معافی اس قسم کی معافی ہے کہ میں بھی اور میرے ساتھی بھی جو ہیں میری سنت کا اتباع کرنے والے' ان کی کیفیت یہ ہوگی ہم زندگی بھر کبھی بھولے سے بھی اس کی یاد نہیں تمہیں دلائیں گے کہ تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا۔

نبی اکرمﷺ کی طرف سے سنت رسول پر عمل کرنے کی تلقین

عزیزانِ من! تثریب کے یہ معنی ہوتے ہیں اور ان کی وساطت سے ہمیں کہا تھا کہ تم نے بھی تثریب جو ہے وہ یہ چیز پیدا کر لینی ہے **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) آیئے قرآن کا ایک ایک لفظ لیجئے۔ ہم یوں سمجھتے ہیں کہ بات ختم ہوگئی' معاف کر دیا' ٹھیک ہے۔ یہاں سے جرم کا فلسفہ سامنے آتا ہے۔ ایک نے میری چیز چرالی ٹھیک ہے' معلوم ہوگیا' میں نے اسے کہا کہ میں نے معاف کیا۔ میرا اس نے جرم کیا تھا وہ معاف کیا یہ جو اس نے یہ ایک جرم کیا ہے خود اس کی اپنی ذات کے اوپر بھی تو اس کا اثر پڑا ہے اس جرم کا' یہ جو تعمیری کاموں سے حسن کارانہ کاموں سے' اقدارِ خداوندی کے اتباع سے انسان کی ذات خود متوازن ہوتی ہے' اس غلط قدم اٹھانے سے اس کے توازن میں بھی تو کچھ فرق آ گیا تھا۔

ایک انسان دوسرے انسان کو تو معاف کر دیتا ہے لیکن جرم جو انسان اپنے ساتھ خود کرے اسے کون معاف کرے گا؟

اب میں نے اسے یہ تو کہہ دیا کہ تم نے میرا جو جرم کیا تھا' وہ میں نے معاف کر دیا ٹھیک ہے' میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ ایک بات اس کی ذات کے اوپر بھی تو مرتب ہوئی ہوئی ہے' اس اثر کا مٹا دینا میرے اختیار میں تو نہیں ہے۔ میرے اختیار میں تو اس جرم کی معافی ہے جو اس نے میرے خلاف کیا تھا۔ یاد ہے میں نیٹشے کا ایک قول دہرایا کرتا ہوں اس نے یہ چیز کہی تھی کہ تم نے جو جرم میرے خلاف کیا ہے اسے تو میں معاف کر دوں گا' تم نے جو اپنے خلاف خود جرم کیا ہے' اسے کون معاف کرے گا۔ یہ کہہ کے کہ **لَا تَثْرِيْبَ**

عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:92) یہ کہا کہ میرے خلاف جو کچھ تم نے کیا تھا' میں نے تو معاف کر دیا۔ اس سے تم نے اپنے خلاف جو کچھ کیا تھا یہ نہ سمجھ لینا کہ اس معافی میں وہ بھی آ گئی ہے اور میں وہ بھی کر سکتا ہوں' بالکل نہیں' يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ (12:92) او بابا! اس کی مغفرت خدا سے جا کے چاہو' وہ میرا کام نہیں ہے' نہ میں اسے بخش سکتا ہوں' اس کی حفاظت خدا سے چاہو۔ تمہارے کریکٹر کے اندر ایک بڑی کمی واقع ہو گئی اس کی مغفرت جو ہے' اس سے حفاظت چاہو۔

اقدارِ خداوندی سے روگردانی کرنے پر انسانی ذات جو متاثر ہوئی ہے' اس کا علاج کرنا ہوگا

وہ کیا کرے گا؟ میں نے کہا ہے کہ یہ اقدارِ خداوندی کے خلاف جتنے اقدام ہمارے ہاں ہوتے ہیں' ان سے ہماری ذات کی نشوونما میں کمی آ جاتی ہے۔ رحمت کے معنی ہیں سامانِ نشوونما بہم پہنچانا' خدا کو اسی لئے رحیم کہتے ہیں' سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے۔ کہا یہ کہ ان غلط اقدامات سے تمہاری نشوونما رک گئی تھی' خدا سے اس کی حفاظت چاہو' کیوں؟ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (12:92) بہترین نشوونما دینے والا وہی ہے۔ راحمین اور بھی ہو سکتے ہیں' میں تمہیں غلہ دے رہا تھا' یہ بھی سامانِ نشوونما تھا' یہ بھی خدا کی طرف سے رحمت ہے' وہ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (12:92) سب سے بہترین طور کے اوپر سامانِ نشوونما دینے والا جو میں بھی نہیں تمہیں دے سکتا' وہ وہ ہے۔ تو بابا! میں نے جو معاف کیا ہے تو اب مطمئن ہو کے نہ بیٹھ جانا کہ سب ٹھیک ہو گیا' بالکل نہیں' میں نے اپنا جرم معاف کیا ہے تم نے جو اپنے خلاف جرم کیا ہے اور یہ وہ چیز تھی جو آدم نے کہی تھی کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) ہم نے اپنے خلاف یہ جرم کیا ہے۔ اقدارِ خداوندی کے خلاف جو کچھ بھی آپ کریں گے خدا کے خلاف تو وہ جرم ہوتا ہی نہیں ہے یعنی خدا کے خلاف جرم کیا! آپ اس کے خلاف کوئی جرم کر ہی نہیں سکتے وہ اتنا محفوظ خدا ہے' سارے جرم جو تم خدا کی اقدار کے خلاف اس سے سرکشی برتو گے ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) ہوتا ہے تمہارے اپنے خلاف ہوتا ہے۔ اسی لئے خدا یہ کہا کرتا ہے کہ اپنے خلاف جو تم کرتے ہو وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (3:117) ہم نے ان کے اوپر کوئی زیادتی نہیں کی ہم نہیں کسی پہ زیادتی کیا کرتے' انسان اپنے آپ پہ زیادتی کیا کرتا ہے' وہ جو تم نے کی ہے' وہاں سے معافی مانگو۔ دو منٹ ہیں میں سمجھتا ہوں اگلا فقرہ یہاں آ ہی نہیں رہا کیونکہ اس ڈائیلاگ کا یہ فقرہ ہے۔

برادرانِ یوسفؑ کی واپسی اور اپنے والد سے ملاقات اور حضرت یوسف کی طرف سے نشان کے طور پر ایک منصبی کرتے کی فراہمی کا ذکر

یہ ہو گئی بات یہاں سے۔ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ (12:93) اب اس کے بعد کہا ہے واپس جاؤ' بات تو ساری تم جا کے سنا دو گے' کیا کہا؟ یہ جو اپنا منصب کا کرتہ تھا جس پہ غالباً وہ تمغے وغیرہ بھی لگے ہوتے ہیں' نشانات جس

کے اوپر لگے ہوئے ہوتے ہیں' دور سے پہچانا جاتا ہے' جسے کہتے ہیں تین سٹار لگے ہوئے ہوتے ہیں' یہ کیا چیزیں ہوتی ہیں؟ وہ شرٹ بھی' وہ کوٹ بھی' وہ ایک ہی ہوتا ہے جرنیل کا بھی وہ نیچے والے کا بھی' وہ یہاں کچھ یہ نشانات اس کے اوپر لگ جاتے ہیں تھوڑے سے۔ کہا کہ بات تو تم جا کے اس کو سناؤ گے۔ باپ سے کہو گے ممکن ہے یہ باور نہ کرے کہ یوسفؑ جسے تم کہتے تھے بھیڑیا کھا گیا ہے یا اب کہو گے کہ ہم نے اس طرح سے بیچ دیا تھا' کیا کہہ رہے ہو کہ وہ عزیز مصر بن کے بیٹھا ہوا ہے' تمہاری اتنی باتیں' تم نے اس وقت تک کی ہیں۔ انہوںؑ نے جھوٹ سمجھی ہیں' یہ بھی شاید جھوٹ سمجھیں ۔ اس کی تصدیق کے لئے تمہارے پاس کچھ سند ہونی چاہئے CERTIFICATE لکھ کے نہیں دیا' باپ کی بصیرت کے اوپر اعتماد تھا۔ کہا یہ قمیص لے جاؤ۔ یہ قمیص کیوں لے جاؤ؟ اس لئے کہ جو تم کہتے ہو ہم خطا کار ہیں اس وقت بھی تم باپ کے پاس ایک کرتہ لے کے گئے تھے جس کرتے نے باپ کی یہ کیفیت کر دی تھی' آہاہاہا! عزیزانِ من! یہ ہے یوسفؑ' دیکھتے ہیں کن بلندیوں پہ یہ لوگ تھے' کچھ نہیں کہا خط نہیں لکھا۔ تمہاری خطا یہ تھی ایک کرتہ تم اس وقت لے کے گئے تھے کہ جس کرتے نے جیسا تم کہتے ہو' باپ بیچارے کو روتے روتے اندھا کر دیا۔ کہا ایک کرتہ یوسفؑ کا آج بھی لے جاؤ اس باپ کے پاس' جب سامنے جائے گا تو آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ کرتہ لے جاؤ۔

اس منصبی کُرتے کے متعلق ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات

ادھر پھر ہمارے وہ مفسرین آ گئے معجزے کے اوپر کہ وہ اندھے ہو گئے ہوئے تھے تو انہوں نے اس لئے کہ وہ پھر سے بینا ہو جائیں' اپنا کرتہ دیدیا' وہ جیسے وہ کوئی تعویذ دیدیتے ہیں ''اے لے جاؤ جی جا کے پا دیناں'' وہ ٹھیک ہو جائے گا جی۔ ہمارے ہاں اس کی تفسیر لکھی ہوئی ہے' بات ہی نہیں سمجھے کہ یہ قمیص ساتھ کیوں دی ہے۔ جاؤ! یہ کرتہ لے جاؤ فَـاَلْقُوْا عَلٰی وَجْهِ (12:93) کے معنی انہوں نے کہا کہ اس کے چہرے کے اوپر جا کے ڈال' دینا یوں کر کے' تم دیکھو گے کہ وہ دیکھنے لگیں گے۔ یہ تو جب تک اس میں شعبدہ نہ پیدا کریں 'بات ہی نہیں بنتی اور بڑا آسان ہوتا ہے' یعنی ان چیزوں کے لئے تو فکر کی ضرورت ہے کہ بات سمجھے کہ یہ قمیص ہی کیوں ہے کس طرح سے یہ چیز وہاں پیدا ہو گی۔

عقل انسانی کے لیے قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ تم قرآنی آیات پر اندھے اور بہرے بن کر نہ گر پڑا کرو

جب آپ نے کوئی چیز شعبدے میں کرنی ہو تو وہ بڑی آسان ہوتی ہے' افسانے میں' کہانی میں' ڈرامے میں جہاں آ کے وہ اٹک جاتا ہے آگے سوجھتا نہیں کہ کہانی میں سے کیسے نکلوں' کچھ سپر نیچرل چیز اس میں لے آتا ہے بس یہاں سے وہ اس افسانہ نگار کو اس مصیبت میں سے نکال دیتا ہے' وہاں لاتے ہیں یہ چیز جو ہوتی ہے۔ یہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ قرآن تو یہ چیز نہیں کہتا۔ قرآن تو فہم و تدبر کو

شروع سے آخر تک اپیل کرتا ہے' درمیان میں کہیں بھی اگر وہ یہ چیز لے آئے' جسے آپ خارقِ عادت کہتے ہیں' تو وہاں تو وہ فہم اور تدبر اور تعقل اور علم کو پھر اس نے اپیل نہ کیا۔ فکر کی چیز ہے' جاؤ یہ قمیص میری لے جاؤ' تم اس وقت پہلے بھی لے گئے تھے' اس کو دکھانا۔ یہ جو ہے یَاْتِ بَصِیْرًا(12:93) اب بَصِیْرًا(12:93) کے معنی پہلے کہہ دیا وہ اندھے تھے پھر کہہ دیا تھا بینائی نظر آ جائے گی۔ ارے! بصارت اور بصیرت میں بھی تو فرق ہوا کرتا ہے' مادہ تو دونوں کا ہی بصر ہے۔ بات سمجھ لے گا وہ۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ کچھ لکھ کے دیجئے' انہوںؑ نے کہا کہ نہیں! یہ لے جاؤ وہ بات سمجھ لیں گے ساری بات سمجھ لیں گے یَاْتِ بَصِیْرًا (12:93) سب کچھ سمجھ لیں گے وہ جو کچھ بھی ہے۔ اور اس کے بعد وَاْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ (12:93) اور جاؤ انہیں بھی اور باقی سارے گھر والوں کو اب یہاں لے آؤ وہاں تم نے کیوں رہنا ہے' قحط کا بھی زمانہ ہے ویسے بھی وہاں عام حالات بھی اچھے نہیں تھے' تم جاؤ' وہاں جا کے ان سب کو لے آؤ۔ اور یہ کہہ کے بھائیوں کو آپؑ نے رخصت کیا اور بھائی پھر ادھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ادھر سے یہ روانہ ہوئے اور اُدھر کیا کیفیت ہوئی آگے کیسے چلی۔ عزیزانِ من! سورۃ یوسفؑ کی آیت 93 تک ہم آ گئے 94 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ(2:127)

❀.....❀.....❀

نواں باب: **سورۃ یوسف** (آیات 94 تا 101)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1974ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یوسف کی آیت 94 سے ہو رہا ہے (12:94)۔

قرآن حکیم میں بیان کردہ واقعات کا ذکر انسانی زندگی کے لیے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے

جیسا کہ آپ کو یاد ہے اس سورۃ میں داستانِ حضرتِ یوسفؑ مسلسل چلی آ رہی ہے اور اب آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا جب کہ ہم اس داستان کے مقطع کے بند میں پہنچ رہے ہیں تو یہ یونہی ایک داستانِ پارینہ نہیں' پچھلے زمانے کی کوئی کہانی نہیں جو قرآن نے دہرا دی ہو۔ قرآن کا تو یہ انداز ہی نہیں ہے۔ کہانی میں آپ نے دیکھا ہوگا' انداز داستان کا ہے لیکن حقائق' عبرت و موعظت قدم قدم پہ ہمارے سامنے آتی ہیں یہ چیزیں۔ پیرایۂ بیان ایک داستان کا سا ہے۔ داستان بھی حقیقت پر مبنی ہے قرآن کا تو ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہوتا

ہے لیکن مقصود اس سے صرف داستاں سرائی نہیں ہے بلکہ داستان کے انداز میں' جو بڑا مؤثر طریق ہوتا ہے' بہت سے حقائق سامنے آئے ہیں بہت سے معارف کھلے ہیں۔

قدم قدم پر حضرت یوسفؑ کی سیرت انسان کے لیے مشعل راہ ہے

سب سے بڑی چیز جو اس میں عمودی نقطہ ہے وہ یہ کہ ایک فرد کا کریکٹر کیا کیا نتائج پیدا کرتا ہے۔ ہم جو ہمیشہ اپنے آپ کو اس فریب میں الجھائے رکھتے ہیں کہ ہاں صاحب! بڑا غلط معاشرہ ہے' اس کے اندر کیسے انسان دیانت دار بن سکتا ہے!! قرآن نے یہ بتایا ہے کہ اگر انسان صاحبِ کردار ہو' اس کا کریکٹر ہو تو غلط معاشرے کے اندر بھی وہ اپنے دامن کو پاکیزہ رکھ سکتا ہے اور اس کے نتائج بھی مرتب ہوتے ہیں۔ بنیادی نقطہ تو اس میں یہی ہے لیکن یہ قدم قدم پہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ سیرتِ یوسفؑ کے حسن کی رعنائیاں جلوہ افروز ہوتی چلی جاتی ہیں۔ وہ بتایا ہی یہ ہے کہ ایک فرد کا کریکٹر کیا ہے اور اس میں کوئی چیز فوق البشر نہیں آتی۔ اگر کوئی چیز وہاں درمیان میں فوق البشر آ جائے تو وہ ہمارے' آپ کے لئے یا دوسرے انسانوں کے لئے اُسوہ نہیں بن سکتی' ماڈل نہیں بن سکتی۔ وہاں ہم یہ کہہ دیں گے کہ صاحب! یہ ٹھیک ہے یہ خدا کے نبی تھے' اللہ نے ان کے لئے یہ کچھ کر دیا اور ہم تو عام بندے بشر ہیں' ہمارے لئے تو وہ کچھ نہیں ہوتا۔ ہم وہ کچھ کیسے کر کے دکھا سکتے ہیں جیسے انہوں نے کر کے دکھا دیا۔ قرآنِ کریم ان مقامات میں اس چیز پہ زور دیتا چلا جاتا ہے کہ یہ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ جو فوق البشر کی سی ہو۔ وہ مقامات الگ آتے ہیں لیکن یہ ان حضرات کا کردار ہمارے سامنے آتا ہے' ان کی سیرت ہمارے سامنے آتی ہے' ان کے واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس میں وہ کوئی چیز فوق الفطرت' SUPRA-NATURAL وہ ایسی چیز نہیں لاتا تاکہ ہم یہ سمجھ لیں کہ اگر ایک انسان یہ کچھ کر سکتا تھا تو خدا کے دئے ہوئے قوانین کی رہنمائی میں دوسرے انسان بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ رسول کی بشریت کے اوپر زور دینے سے مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں وہ بحیثیت بشر کے کرتا تھا اور ہر بشر یہ چیزیں کر سکتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کا بھائیوں کی گھر واپسی پر والدِ محترم کی خدمت میں اپنی قمیص ارسال کرنے کا مقصد

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ وہ پھر یوسفؑ نے بالآخر اپنے بھائیوں کو بتا دیا کہ میں یوسفؑ ہوں۔ یہ میرا بھائی ہے۔ اب بات کھل گئی ہے۔ جاؤ باپ کو بھی اس کے متعلق بتا دو۔ اور بتانے کا انداز انہوں نے یہ اختیار کیا کہ انہیں کہا کہ لو یہ میری قمیص لے جاؤ۔ اور جیسا میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا وہ جیسے کہ ہمارے ہاں بھی یہ وردی جو ہے اس ایک وردی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتنے بڑے منصب کا انسان ہے جس کی یہ وردی ہے' جس کا یہ کرتہ ہے' جس کا یہ کوٹ ہے تو یہ ان نشانات سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تو حضرتِ یوسفؑ بجائے اس کے کہ کوئی ان کو خط لکھ کے دیتے یا انہی پہ چھوڑتے کہ تم جا کے یہ بتا دینا کہ یوسفؑ اس مقامِ بلند پہ پہنچ چکا ہوا ہے' ایک نشانی دیدی۔

مذکورہ قمیض کے بارے ہمارے ہاں کی تفسیروں میں بیان کردہ قصے اور پھر قرآن حکیم کی روشنی میں اس کی وضاحت

میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں بھی آپ دیکھئے کہ کتنی بڑی نزاکت ہے کہ وہی بھائی اس سے پیشتر یوسفؑ کا کرتہ لے کے باپ کے پاس گئے تھے کہ جس کرتے نے یہ کیفیت برپا کر دی کہ باپ عمر بھر روتا رہا۔ اس کے بعد جب اس حالت سے دوسری حالت کی طرف لانا تھا باپ کو' انہی بھائیوں کے ہاتھوں ایک اور کرتہ بھیجا گیا تو کرتہ اب بھی ہے اور اس وقت بھی کرتہ ہی گیا تھا' قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ کرتہ جو لے کے گئے تھے تو محاورتاً جسے ہم کہتے ہیں کہ دنیا ان کی آنکھوں کے سامنے تاریک ہوگئی تھی' اندھیرا چھا گیا تھا' یہ کرتہ جو بھیجا ہے تو اِذۡهَبُوۡا بِقَمِيۡصِىۡ هٰذَا فَاَلۡقُوۡهُ عَلٰى وَجۡهِ اَبِىۡ يَاۡتِ بَصِيۡرًا ۚ (12:93) قرآن ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے بات تو یہ تھی کہ اس کرتے سے وہ پہچان لیں گے کہ مرتبہ کیا ہے لیکن کہنے کا انداز یہ ہے کہ ایک وہ کرتہ تھا کہ جس نے دنیا اندھیر کر دی ان کے سامنے' ایک یہ کرتہ بھی میرا ہے اسے لے جاؤ' ساری دنیا روشن ہو جائے گی ان کے سامنے۔ جیسا میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا' یہ بات نہیں تھی کہ (معاذ اللہ) وہ روتے روتے جیسے عام تفاسیر میں ہے کہ اسی سال تک روتے رہے اور پھر اندھے ہو چکے تھے اور پھر وہ جو کرتہ آ کے ان کے چہرے پہ ڈال دیا تو اس سے ان کی آنکھیں کھل گئیں' یہ چیزیں کہیں نہیں ہیں ان کہانیوں کے اندر' یہ وہی چیز جسے میں نے کہا SUPER NATURAL قرآن اس کے اندر نہیں لاتا۔ یہ بصیرت ہے کہ ہر چیز واضح ہو جائے گی' ان کے اوپر روشن ہو جائے گی' سارا قصہ روشن ہو جائے گا' جاؤ میرا کرتہ دکھاؤ اور کہو کہ یہ ہے اس کا کرتہ۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیز اس میں آپ دیکھئے کہانی کے طور پہ بھی' کرتہ بھیجا ہے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ایک کرتے نے وہ قیامت ڈھا دی تھی' دوسرا کرتہ بھی انہیں بھائیوں کے ہاتھوں بھیجا جا رہا ہے۔ اس انداز کے اندر بڑا ہی حسنِ لطافت ہے۔ حضرتِ یوسفؑ نے جو کیا وہ بھی اور قرآن نے جو بیان کیا ہے يَاۡتِ بَصِيۡرًا ۚ (12:93) عزیزانِ من! بڑی عجیب چیز ہے انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کے الفاظ کے انتخاب کو دیکھئے تو واقعی وجد میں آ جاتا ہے' جاؤ یہ کرتہ دکھاؤ۔ تو وہ وہاں سے پھر چلے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ کی خوشبو کا محسوس کرنا

وَ لَمَّا فَصَلَتِ الۡعِيۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ اِنِّىۡ لَاَجِدُ رِيۡحَ يُوۡسُفَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ (12:94) یہاں پھر ایک مقام ذرا غور طلب آتا ہے کہ وہاں سے قافلہ چلا ہے' قافلے آتے جاتے رہتے تھے۔ وہاں یہ چیز نہیں تھی کہ وہ بستیوں والے آپس میں پھر کٹ آف ہو جاتے تھے' اس زمانے کی صورت یہ تھی کہ آپس میں CONTACT کا رابطے کا سلسلہ ہی یہ مسافر' راہرو' قافلے ہوتے تھے اور یہ ایک ہی

قافلہ نہیں تھا جو وہاں گیا تھا' اس بستی سے متعدد قافلے گئے۔ وہ تو قحط پڑا ہوا تھا تو غلہ لانے کے لئے سارے علاقے کے لوگ وہاں نکل جاتے تھے اور آتے تھے تو آمد و رفت کا یہ سلسلہ کھلا ہوا تھا' آتے جاتے رہتے تھے۔ تو میں نے عرض کیا کہ خود اس بستی کے بھی تو دوسرے لوگ وہاں غلہ لینے کے لئے جاتے تھے' آتے تھے' آنے جانے کا سلسلہ موجود تھا۔ تو اس سلسلے سے یہ چیزیں یہ جو خبریں ہیں یہ تو عام ہو جاتی تھیں۔ یہاں یہ انداز ہے کہ کہا کہ اُدھر سے وہ جو قافلہ چلا ہے تو حضرتِ یعقوبؑ نے لوگوں سے کہا کہ (جو ہمارے ہاں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ریح کا ترجمہ ''خوشبو'' کیا جاتا ہے میں عام ترجمہ ہی کر رہا ہوں) مجھے یوسفؑ کی خوشبو آ رہی ہے اور ساتھ ہی کہا کہ اگر یہ نہ تم کہو کہ بڑھاپے اور مصیبتوں کی وجہ سے میری مت ماری گئی ہے بوڑھا ہو گیا ہوں مخبوط الحواس جسے کہتے ہیں اگر یہ ذہن میں نہ تم سمجھ لو کہ مخبوط الحواس کہیں ہو گیا ہوں تو میں تمہیں بتا رہا ہوں (ترجمے کی رو سے) کہ مجھے یوسفؑ کی خوشبو آ رہی ہے۔

لفظ ریح کا مفہوم غلبہ' قوت اور منصب بھی ہوتے ہیں

عربی زبان میں یہ ٹھیک ہے میں نے پچھلی دفعہ بھی آپ سے کہا تھا جب ریح کا لفظ آیا تھا' رَوح کا لفظ آیا تھا اسی ضمن میں یہ ریح کا لفظ آتا ہے اس کے معنی شان و شوکت اور قوت اور جاہ اور منصب بھی ہیں۔ خود قرآنِ کریم میں یہ ریح کا لفظ جو آیا ہے ان معنوں کے اندر آیا ہے' سورۃ انفال میں آپ دیکھئے وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ لَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا (8:46) اطاعت کرو خدا اور رسول کی' آپس میں جھگڑو نہیں' تنازعات پیدا نہ کرو' اختلاف پیدا نہ کرو ایسا اگر کرو گے تو یاد رکھو تم کمزور ہو جاؤ گے وَ تَذۡہَبَ رِیۡحُکُمۡ (8:46) یہ لفظ میں نے کہا ہے اس کا استعمال یہاں آپ دیکھ لیجئے قوت کے معنوں میں' غلبہ' قوت' اقتدار' یہ سارے معنی اس کے اندر آتے ہیں' تو اگر ایسا کرو گے تو یاد رکھو تم میں انتشار پیدا ہو جائے گا خلفشار پیدا ہو جائے گا' کمزوری آ جائے گی' ضعف آ جائے گا اور تمہاری قوت اور غلبہ جو تم نے حاصل کیا ہے' جاتا رہے گا۔ ریح کے معنی قوت' غلبہ' منصب' یہ سارے معنی اس کے آتے ہیں۔ یہاں یہی معنی ہیں۔

عزیزِ مصر (حضرت یوسف) کی نیک نامی اور کردار کی بلندی کی خوشبو تو یقیناً پھیل چکی تھی

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ قافلے والے آنے جانے والے اس عزیزِ مصر کی باتیں سناتے ہوں گے یعنی حضرتِ یوسفؑ کی۔ پھر یہ ان کے لڑکے آتے جاتے تھے تو ہر دفعہ آ کے' ان کے کردار کا ایک واقعہ یہ سناتے تھے۔ ان کو نظر آتا تھا کہ یہ ایک عام سطح کا انسان نہیں ہو سکتا اور پھر فراعنہ میں سے تو ہو ہی نہیں سکتا ان کا تو پتہ ہے فرعون ضرب المثل ہے' ان فراعنہ میں سے یا ان کے اہلِ دربار میں سے یا ان کے اہلِ کردار میں سے اس سیرت و کردار کا انسان کون ہو سکتا تھا؟ پھر خود ان کے ساتھ' بھائیوں کے ساتھ حضرتِ یعقوبؑ کے بیٹوں کے ساتھ جو انہوں نے کیا ہے کہ غلہ بھی دے رہے ہیں اور اس نے ان کی پونجی بھی لوٹا دی ہے۔ پیسے تھوڑے ہیں جا کے کہا کہ غلہ پورے کا پورا دے

دیجئے ہم بڑے محتاج اور غریب ہیں' انہوں نے یہ بھی کر دیا۔ یہ ساری باتیں بھی وہ آ کے سناتے تھے۔ قافلے والے دوسرے بھی لوگ سناتے ہونگے آنے جانے والے بھی بتاتے ہونگے' چرچا ہو گیا ہوگا حضرتِ یوسفؑ کی اس تمام حسنِ اخلاق اور سیرتِ کردار کی بلندی اور پاکیزگی کا اتنے بڑے مرتبے کا انسان اور اس کے کریکٹر کی یہ کیفیت ہے۔

خدا تعالیٰ نے اکثر مقامات پر انسانی صلاحیتوں کو اپنی طرف منسوب کیا ہے

میں یہاں یہ عرض کر دوں کہ اس کہانی میں تین چار مقام پہ یہ بات آئی ہے جہاں حضرتِ یعقوبؑ نے کہا ہے وہی جو یہاں بھی آئے گی اِنِّیۡ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ(12:96) میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے معنی وحی کی رو سے جاننے کے نہیں ہیں اور میں نے قرآنِ کریم کی مختلف مقامات کی مثالیں دی تھیں جہاں عام فطری طریق سے انسان جو حاصل کرتا ہے' اسے بھی خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے' خود اس کا فاعل خدا بتاتا ہے' عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ (55:4) 'عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ (96:4)۔ یہ چیزیں جتنی بھی ہیں ہم نے انسان کو لکھنا سکھایا یعنی اب تو سیدھی سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ آ کے کہیں تختی اور قلم لے کے تو لکھنا تو نہیں سکھاتے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ یہ صلاحیتیں ہم نے انسان کے اندر رکھی ہیں کہ وہ اس کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس کی بین مثال تو میں نے عرض کیا تھا وہ جو سورۃ مائدہ میں ہے جہاں یہ کہا ہے کہ وہ جانور بھی تم پہ حلال ہیں جو شکاری کتے پکڑ کے لاتے ہیں اس سلیقے کے مطابق جنہیں خدا نے تمہیں سکھایا ہے۔ شکاری کتوں کو سدھانا اور ان کے ذریعے سے شکار کرنا اور کہا یہ کہ اس طریق سے جسے خدا نے تمہیں سکھایا ہے تو خدا بہرحال وہ یہ شکار کرنے والوں کو شکاری کتوں کو سدھانے کا علم تو خدا براہِ راست کسی کو نہیں سکھاتا۔ تو قرآنِ کریم کے ان مقامات میں ذرا گہرائی میں جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے وہ چیزیں کہ جو اس نے صلاحیت دے رکھی ہوئی ہے۔ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ گویائی کی طاقت' قوت تو انسان کے اندر ہوتی ہے لیکن بچوں کو باتیں کرنا تو ہم سکھاتے ہیں۔ بچے کو قبل اس کے کہ وہ باتیں کرنا جانتا ہو کسی جنگل میں بھیج دیجئے جہاں کوئی دوسرا انسان نہ ہو جو اسے بات سکھائے یا بات اس کی کان میں پڑے' وہ بالکل جانوروں کی طرح ہوتا ہے حالانکہ اس میں قوتِ گویائی یا صلاحیت اس میں موجود ہے لیکن اس صلاحیت کو بروئے کار لانے کے لئے ایک طریقہ ہے' باتیں سکھانے کا طریقہ۔ پھر جو قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے انسان کو لکھنا سکھایا' لکھنا تو جیسا میں نے عرض کیا ہے' اگر انسان دوسرے انسان کو نہ سکھائے یا وہ نہ سیکھے تو اسے خود لکھنا نہیں آ جاتا' خدا براہِ راست لکھنا نہیں سکھاتا۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ اس کے اندر یہ صلاحیت دی ہوئی ہوتی ہے۔

غور وفکر کرنے سے عقل انسانی کی رفعت پرواز میں مزید تیزی آتی ہے

یہ لوگ جو تدبر سے، تفکر، شعور سے، عقل سے، علم سے، ادراک سے کام لیتے ہیں آہستہ آہستہ ان کے ادراک کی قوت اتنی زیادہ تیز ہوتی چلی جاتی ہے کہ جو باتیں عام انسان نہیں بھانپ سکتا' ان کی نگاہ اس تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ اور ہمارا روزمرہ کا یہ تجربہ ہے' مشاہدہ ہے کہ صاحب! بات تو وہی ہوئی لیکن اس نے تو ایک سیکنڈ میں ساری بات بھانپ لی۔ پھر اہلِ فن بھی اس معاملے میں ہوتے ہیں' سراغ رساں جو ہیں ہم بھی راستوں پہ چلے جا رہے ہوتے ہیں' کچھ بھی نظر نہیں آتا' وہ انہی راستوں پہ چلتے ہیں۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے آپ کو اس چور کا یا اس مجرم کا سارے کا سارا حلیہ تک بیان کر دیتے ہیں۔ یہ وحی نہیں ہوتی' یہ الہام نہیں ہوتا' یہ فراست ہے۔ یہ چیز جسے حتیٰ کہ INTUITION کہا جاتا ہے' وجدان کہا جاتا ہے' وجدان وہ چیز کہ وہ بیٹھے بیٹھے ایک خیال آتا ہے جس کا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ خیال کیوں آیا یا۔ جب انسان کی فکر کی حس نہایت لطیف ہو جاتی ہے' شاعر جسے اپنے ہاں آمد کہتے ہیں' آورد اسے نہیں کہتے' وہ کہتے ہی یہ ہیں کہ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں اور پھر وہ اس کو منسوب کرتا ہے کہ غالب سریر خامہ نوائے سروش ہے۔ انہوں نے سروش ایک فرشتہ رکھا ہوا ہے جسے یونانی میں می کہتے ہیں کہ وہ ہے جو ہمیں الہام کرتا ہے۔ یہ صاحبِ الہام' حفیظ جالندھری صاحب میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ تو وہ یہ چیزیں جو ہیں کسی فن کے اندر آپ' تدبر' فکر مرکوز کرتے چلے جائیں مرکوز کرتے چلے جائیں' انسان کا ذہن ایسی لطافت اختیار کر جاتا ہے' اسے وجدان کہتے ہیں اسے INTUITION کہتے ہیں۔ خود ہمارے ہاں INTUITION کا سب سے بڑا اس دور کا فلاسفر جس نے INTUITION کا فلسفہ دیا' برگسان ہے۔ وہ INTUITION کی DEFINITION یہ کرتا ہے THE HIGHER AND DEFINER FORM OF INTELLECT ۔ یہ INTELLECT سے الگ چیز نہیں ہے' شعور کی نہایت بلند اور لطیف شکل ہے۔

پختہ شعوری کی صفات سے مالا مال شخصیت کا آئینہ ادراک بڑا روشن ہوتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ وہ اس طرح پیدا ہوتی ہے۔ ہر سپیشلسٹ جو ہوتا ہے' اس کی نگاہ کسی اور طرح کام کرتی ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے وہ جس کی نگاہ کام کرتی تھی' اس نے دیکھا تھا کہ ''خارے دید و احوالِ چمن گفت'' یہ کہا ہے اقبالؒ نے ''ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست'' کہتا ہے یہ سب تمہیں ملیں گے صاحبِ عقل اور صاحبِ فکر لیکن بتاؤ وہ کون ہے کہ کانٹا دیکھے اور سارے باغ کا حال بتا دے' وحی کے ذریعے سے نہیں۔ اور یہ تو محتاط تھا یہ شخص' وہ جو اس کا شعر ہے جس میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو سکتا تھا وہیں بات صاف کر گیا۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے

عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں

کوئی اس مقام کے اوپر ہوتا تو بڑا وہ ہوتا ولی اللہ اور مجدد' معلوم نہیں کیا کیا آسمان کی باتیں بیٹھا ہوا' سوچ کے لاتا ہے۔ عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے۔ اور واقعی ادراک کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے جس فن میں بھی انسان اپنے آپ کو زیادہ منہمک کر لے' گہرائیوں میں چلا جائے فکر کو اس چیز کے اوپر مرکوز کر لے اس میں اس کی حس بڑی ہی لطیف اور بیدار ہو جاتی ہے اور اس کی کیفیت پھر یہ ہوتی ہے کہ حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے' عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے۔

پیغمبر کی حس بڑی لطیف اور بیدار صفات کی حامل ہوتی ہے

یہ جہاں جہاں یہ پیغمبران مقامات میں یہ بات کرتے ہیں کہ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (12:96) وہاں وہ یہ بات کہتے ہیں کہ عام سطحی لوگ جس بات کو نہیں بھانپ سکتے' میری نگاہ ان چیزوں کو بھی دیکھ لیتی ہے۔ یہ وحی نہیں ہے۔ اور اس داستان میں تو بات صاف ہے۔ پہلے دن سے ان کے سامنے ایک جھوٹ بولا گیا' کرتہ لا کے بتایا گیا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا۔ ٹھیک ہے' بھیڑیا کھا گیا والی بات جو تھی وہ قرائن سے انہوں نے دیکھا کہ جھوٹ بولتے ہیں یہ انداز نہیں ہوا کرتا' قمیص کہیں سے بھیڑیا کھاتا تو نوچ نوچ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ میں ویسے کہہ رہا ہوں' قرائن سے یہ چیز پتہ چل جاتی ہے۔ یہ پولیس والوں میں جو سراغ رساں ہوتے ہیں وہ CIRCUMSTANCIAL, EVIDENCE سے بہت سی چیزوں کے اوپر اندازوں سے صحیح پہنچ جاتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کی گمشدگی کے باعث والد کی داستانِ غم اور ہمارے ہاں کے مفسرین کی سوچ کا جائزہ

لیکن پہلی بات وہ تھی انہیں معلوم نہیں ہوا کہ یوسفؑ کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ اور ساری داستان میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ آہیں بھر رہے ہیں' روبھی رہے ہیں' آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی رہتی' لوگ یہ کہتے بھی ہیں' وہ بیٹے خود یہ کہتے تھے کہ ابا جان! کیا ہر وقت آپ یوسفؑ اور یوسفؑ۔ دوسری دفعہ وہ چھوٹا بیٹا بھی وہاں رکھ لیا گیا انہوں نے آن کے یہ کہہ دیا کہ تیرے لاڈلے نے وہاں چوری کی ہے' ان کے ساتھ معلوم ہے یہاں کیا ہوا' کہا یہ کہ کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے جیسے تم نے پہلے کہا تھا' وحی نہیں ہے۔ اور پھر میں نے عرض کیا ہمارے ہاں عام طور پہ مفسرین جو ہیں وہ دو کڑیاں آپس میں نہیں ملاتے یہ ساری داستانیں ان مقامات پہ ہر جگہ وہ یہ کہتے ہیں کہ وحی کے ذریعے سے خدا نے انہیں بتا دیا۔ وحی کے ذریعے خدا نے بتا دیا ہو کہ یوسفؑ وہاں چلا گیا ہے' اب وہاں گیا ہے' اب مصر میں ہے' اب وہاں کا وہ حاکم ہو گیا ہے' وہاں کا منصب دار ہو گیا ہے تو باپ کے لئے پھر یہ رونے کا مقام ہے!! ساتھ دوسری جگہ لکھ دیتے ہیں کہ اسی سال تک روتے رہے اور وہ اندھے بھی ہو گئے۔ یعنی نبیؑ' جن کے سامنے اتنا عظیم مشن اور کیفیت انّ کی یہ کہ ایک بیٹا گم ہو گیا ہے تو نہ دین کے نہ دنیا کے بیٹھے ہوئے اسی سال تک روتے رہے۔ اور پھر یہ نہیں کرتے کہ دو کڑیاں ملانا' جو میں کہتا ہوں' ایک طرف وہ ہر مقام پہ کہتے ہیں کہ وحی نے

سب کچھ بتا دیا تھا اور اس کے بعد وہ رو بھی رہے ہیں اسی سال تک۔ نبیؑ ہو اور خدا براہِ راست وحی کے ذریعے ہر چیز اس کو بتاتا چلا جائے اور اس کے باوجود وہ ہیں کہ آہیں بھی بھر رہے ہیں' سسکیاں بھی اٹھ رہی ہیں' روتے چلے جاتے ہیں روتے روتے اندھے ہو جاتے ہیں۔ دو کڑیاں نہیں ملاتے۔

وحی کی روشنی تو انسانی ذہن میں کسی قسم کا خوف وحزن باقی رہنے ہی نہیں دیتی

آپ کو معلوم ہے کہ جب یہاں آ کے افتاد پڑتی ہے تو پھر کیا کہتے ہیں؟ اب وہ بھائی واپس آ گئے انہوں نے آ کے بتایا تو انہوں نے کہا کہ دیکھا نا میں کہتا تھا' تو وہاں ہمارے ہاں کے یہ مفسر لکھتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے وحی نے بتا تو دیا ہوا تھا لیکن یقینی صورت اب پیدا ہوئی (معاذ اللہ)۔ نبیؑ کو خدا وحی کے ذریعے بتاتا ہے اور اس کے بعد اس کی کیفیت کچھ اور ہی طرح کی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے عجیب بات کہی ہے **مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ** (6/91;22/74;39/67) انہوں نے خدا کا اندازہ ہی نہیں لگایا جیسا اندازہ لگانا چاہئے۔ وہ وحی کے' ذریعے یہ بات بتا دے قیامت تک کی بات بتا دے اور اگر رسول کی بھی کیفیت یہ ہو کہ خدا وحی کے ذریعے براہِ راست بتائے اور پھر اس کو یقین نہ آئے' روتا ہی رہے۔ اس رسول کی وحی پہ دوسرے کیا یقین کریں گے۔ اور یہ تو سارا اس یقین کے اوپر ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ حق ہے' اس یقین سے تو آپ مسلمان ہوتے ہیں' رسول اسی لئے کہتا ہے **اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ** (6:163) اسے سب سے پہلے اس پہ یقین آتا ہے۔ کہتے ہیں نہیں! وہ بتا بھی رہا تھا اور وہ جب آئے ہیں تو آ کے انہوں نے پھر کرتہ منہ پہ ڈال دیا اس سے آنکھیں روشن ہو گئیں اس کو ان کو پھر یقین آیا' وحی نے بتا تو دیا تھا لیکن ''کتھے ٹھہرا ای نہ دتا ہووے'' (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔

حضرت یوسف کا کُرتا وصول کرنے کے بعد حضرت یعقوب کے تاثرات

یاد رکھئے! یہ سارے مقامات وہ ہیں' وہ جو چیز ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے تو اب (یہ جو میں نے عرض کیا کہ) **رِيْحَ يُوْسُفَ** مجھے یوسفؑ کی خوشبو آ رہی ہے۔ لیکن ریح کے معنی عربی زبان میں ہمارے سامنے ہیں اور قرآن نے اس کو استعمال کیا ہے: اعزاز' منصب' قوت' غلبہ' اقتدار۔ باتیں ساری ہو رہی ہے اب اندازہ ہو گیا ہے کہ ہے تو وہی' تو وہ ان کو کہہ رہے ہیں کہ ہاں! یہ جو آمد و رفت سے باتیں کر رہے ہیں یقینی طور پہ تو ان میں سے کوئی نہیں یہ کہتا ہو گا کہ وہ وہی ہے لیکن ان کی فراست جو ہے کہ خدا نے مجھے جو فراست عطا کی ہے میں سمجھ سکتا ہوں مجھے تو ان قرائن سے نظر آتا ہے کہ وہ یوسفؑ ہی ہے اور پھر بڑے بلند مرتبے کے اوپر بھی ہے۔ یوں کہئے گا کہ مجھے تو ان قرائن سے یوسفؑ کی بلندیٔ مرتبہ کی مہک آ رہی ہے۔ حسین انداز ہے بات کہنے کا۔ انہوں نے کہا **قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ** (12:95) انہوں نے کہا کہ وہی پرانی بات جو تم کرتے چلے آئے تھے وہی کہتے ہیں۔ اب یہ دونوں کی فراست میں فرق ہے'

ان واقعات کا چرچا وہاں بھی ہو رہا ہے' اس باپ کے سامنے بھی ہو رہا ہے'' او جنوں لگی ہوئی ہووے او ہور طراں گل سمجھدا ہیگا اے' دوسریاں نالوں ذرا وکھ گل سمجھدا ہیگا اے''۔ بات آگے چلتی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ رسول کو ذاتِ خداوندی قدم قدم ہر بات کے متعلق وحی کے ذریعے آگاہ نہیں کرتی تھی

میں نے عرض یہ کیا تھا کہ ان مقامات میں یہ چیز ہر وقت نہیں یہ سوچنی چاہئے کہ ہر بات خدا' رسول کو وحی کے ذریعے بتا دیتا تھا۔ وہ دو مقام جو ہیں جو رسول کی زندگی کے دو حصے ہیں وہ کیوں بار بار کہتا ہے **قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ**(18:110-41/6) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں اس فرق کے ساتھ کہ مجھے وحی ملتی ہے تمہیں وہ وحی نہیں ملتی' جب مجھے وہ وحی نہیں ملتی جن مقامات میں' میں تمہارے جیسا بشر ہوتا ہوں۔ ایک دفعہ نہیں بیسیوں مقام پہ یہ چیز کہی جا رہی ہے۔ کچھ تو معنی ہیں اس کے اور وہ یہی معنی ہیں۔ یاد رکھئے! دین سے متعلق جو معاملات ہونگے وحی اس کے متعلق آئے گی' خود نبی کے بھی اپنے معاملات جو ہیں' ذاتی معاملات وغیرہ ان میں وحی نہیں آتی۔ ان لوگوں نے بظاہر تو یہ سمجھا کہ ہم نبی کا مقام بڑا بلند کر رہے ہیں کہ صاحب! ایک ایک سانس میں رسول' رسول ہوتا تھا ہر بات خدا کی طرف سے اس کو بتائی جاتی تھی۔

نبوت ملنے کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ کی زندگی ایک عظیم شہادت ہے

عزیزانِ من! اگر یہ بات ہو رسول کی ذاتی سیرت و کردار کی عظمت باقی کوئی نہیں رہتی۔ یعنی اگر ہر بات خدا بتائے اور ہر بات خدا کرائے اس کا اس میں کردار کیا' اس کا میرٹ کیا' اس کی اپنی خوبی کیا!! اور پھر نبوت یہ بات نہیں تھی کہ آگ لینے کو جائیں' پیمبری مل جائے۔ بات میں سے بات نکل آتی ہے صاحب! یہی پھر آگ لینے جو گئے تھے ٹھیک ہے انہوں نے وہاں یہی کہا تھا اور کہا تھا کہ موسیٰؑ دیکھئے یہ ایک وحی ہے **مَحبة** ہے **مَحبة** احسان ہوتا ہے وہ خود اپنے کسب و ہنر کا نتیجہ نہیں ہوتا وحی خدا کی طرف سے **محبة** ملتی ہے اور بڑی عظیم **محبة** ہے شکریہ ادا کرتا ہے۔ بڑے حسین انداز ہیں جب وہاں ہم آئیں گے' دیکھئے گا وہ جو باہمی بات ہے اللہ کی اور حضرتِ موسیٰؑ کی بڑی حسین داستان ہے وہ بھی۔ تو کہا یہ کہ آپ کا شکریہ اس احسان کا' کہا موسیٰؑ! اسی احسان کا شکریہ' شکریہ اگر کرنا ہے تو پیچھے سے چلو۔ یہ بات نہیں ہے کہ تم نے دور سے دیکھا یہاں کوئی دمکتا ہوا انگارہ سا اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں جاتا ہوں کچھ آگ لاتا ہوں' کچھ راستے کا اتا پتا لاتا ہوں' اتفاقاً تم یہاں آگ کی تلاش میں نکل آئے' تم آ گئے ہمارے ہاتھ میں' یہ تاج رکھا ہوا تھا کسی کے سر پہ تو ہم نے رکھنا ہی تھا' تم آ گئے تمہارے سر پہ رکھ دیتے ہیں' تم شکریہ ادا کرتے ہیں بہرحال شکریہ ادا کرنا'' ساہڈے ہتھوں

تے بوجھ ٹلیا''

نبوت کے انتخاب کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کا ایک اپنا معیار ہے

کہا موسیٰؑ ! یہ بات نہیں ہے کہ تم آگ کی تلاش میں آ گئے اور یونہی ہم نے تم کو نبی بنالیا' موسیٰؑ ! ہماری نگاہ اس دن سے تمہارے پیچھے چلی ہوئی تھی جب تمہاری ماں سے کہلا کے بھیجا تھا کہ بچے کو صندوق میں ڈال کے فرعون کے محلوں میں ڈال دو۔ اور اس کے بعد پھر گنائے ہیں جب تم مدین کے پیاؤ پہ گئے تھے' وہاں تم سے جو ظہور میں آیا تھا' نبوت سے پہلے کی باتیں ہیں' جب وہاں گئے تھے وہاں جو تم نے یہ سب کچھ کیا۔ اس کے بعد ہے کہ موسیٰؑ ! ہم نے تمہیں ان کٹھالیوں میں سے نکالا اور جب تم ہمارے معیار پہ پہنچے ہو تو پھر یہ **محبۃ** ہم تم کو دے رہے ہیں۔ نبی تو ان کٹھالیوں میں سے نکلتا ہے اس کا ایک ایک قدم WATCH کیا جاتا ہے کہ کس کردار' کس صلاحیت' کس فراست کا انسان ہے۔ اسے منتخب کیا جاتا ہے AT RANDOM یونہی نہیں ہوتا کہ بادشاہ مر گیا اور بادشاہ کا وارث کوئی نہیں تھا تو وہ تاج لے کے دروازے پہ بیٹھ گئے کہ صبح جو پہلے آئے گا اس کے سر پہ رکھ دیا جائے گا' یوں نہیں ہوتا۔ نبی جو ہے یہ ساری چیزیں بحیثیت انسان اور بشر کے ہوتی ہیں اس کا کریکٹر' کردار' فراست' صلاحیت ساری چیزیں جتنی بھی ہیں۔ دین کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ انسان کی فکر اور انسان کی عقل پیدا نہیں کر سکتی' اس مقام کے اوپر وحی ہوتی ہے۔ جتنی چیزیں خواہ کتنی ہی بلندیٔ فکر کی کیوں نہ ہوں انسان کی فکر خود پیدا کر سکتی ہے وحی وہ نہیں کئے دیتی' وہ وہاں دیتی ہے یہ چیز وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ (53:3-4) اپنی فکر سے یہ بات پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

مکہ کے رہنے والے لوگوں کے مقابلے میں مدینے والے منافقین کی طرف سے مخالفت کہیں زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک تھی

ہم نے وحی دی۔ اور باقی چیزیں جو فکر کی ہیں وہ دیکھا ہے اس میں تدبیر کی غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ جو معاشرے میں منافقین کا وجود ہوتا ہے بڑا ہی تنگ کرنے والا ہوتا ہے' دشمنوں سے تو آدمی بڑی آسانی سے نمٹ لیتا ہے۔ قریش آئے حملہ کیا' مقابلہ ہوا جنگِ بدر میں' کبھی اُحد میں' کبھی حنین میں' آمنے سامنے کا ٹکراؤ' کھلے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ یہ جو مدینے کے اندر تھے آستین کے اندر چھپے ہوئے سانپ' وہ بڑی ہی تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ میدانِ جنگ تک میں ساتھ چلے جاتے تھے۔ عین وقت کے اوپر جب کلائمکس وہاں آتا تھا' تو اس وقت وہ شوشے چھوڑ دیتے تھے۔ اب ان کے متعلق کہ وہ مسلمان بن کے درمیان میں ساتھ رہے ہوئے تھے۔ منافق کی تو یہی چیز ہوتی ہے۔ قدم قدم کے اوپر وہ بے حد پریشانی کا باعث بنتے تھے۔ اذیت کا باعث بنتے تھے' جی چاہتا ہوگا رسول اللہ ﷺ کا کہ

ان کے متعلق کچھ علم تو ہو جائے۔

نبی اکرم کے اسوۂ حسنہ کا ایک ایک پہلو جو پوری نوع انسانی کے لیے مشعلِ راہ ہے

غور کیجئے یعنی یہ معاملات جو ہیں رسول اللہ ﷺ کے ذاتی نہیں ہیں۔ یہ سارا نظم و نسق' مملکت کے معاملات' جنگ میں جانا' جہاد وغیرہ کی صورتیں' یہ اسی کا حصہ ہیں لیکن اس میں وحی نہیں یہ کچھ بتا رہی۔ کہا ہم نے یہ حدود مقرر کر دی ہیں یہ خطوط دیدئے اصول دیدئے ان پہ عمل پیرا کرنے کے لئے اب اپنے تدبر اور فراست سے کام لو' لڑائیاں خود لڑو' مقامات پہ خود جاؤ' فوجوں کو خود درست کرو۔ شکست بھی ہوگی اس کے بعد سوچو' کیوں شکست ہوئی ہے۔ یہ کریڈٹ اسی صورت میں جا رہا ہے کہ رسول یہ ساری چیزیں اپنی فراست اور بلندیٔ سیرت و کردار کی رو سے کرے۔ میں کہہ رہا تھا کہ منافقین کے متعلق کہ اتنا تو دل میں ہوتا ہے کہ کچھ معلوم تو ہو جائے' ہماری آپ کی بھی یہ صورت ہے کہ کوئی آدمی ذرا تھوڑا سا دھوکہ دیتا ہے' ادھر اُدھر سے پوچھتے ہیں کہ صاحب! کچھ اس کا حدود اربعہ بتا دیجئے یہ کیا ہے کچھ اس قسم کی چیز۔ وہ گروہِ منافقین ہیں' رسول ﷺ ہیں جن پہ قدم قدم پہ وحی آ رہی ہے لیکن **اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ** (47:29) کہا کہ یہ منافق کیا سمجھ رہے ہیں کہ وہ ساری عمر دھوکہ دیتے چلے جائیں گے اور ان کی یہ منافقت' دھوکہ دہی جو ہے یہ کبھی ظاہر ہی نہیں ہوگی؟ خدا کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے' ذہن میں یوں آ رہا ہے کہ بس! اگلی آیت میں وہ اللہ میاں ایک پوری کی پوری فہرست رسول اللہ ﷺ کو دیدیں گے کہ یہ لیجئے یہ ہیں سارے۔ پہلے انہیں کہا ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا یہ پردہ ہی منافقت کا چاک نہیں ہوگا' یہ ہونے والا ہے۔ **وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ؕ** (47:30) رسول اللہ ﷺ کو اس کا انتظار ہو گیا ہوگا' پہلے تو آپ ﷺ کو یہ کہا کہ ٹھیک ہے اگر ہمارا قانونِ مشیت یہی ہوتا کہ یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں' اسی فوق الفطرت طریقے سے' وحی کے ذریعے سے کرنی ہیں تو ہمارے لئے مشکل ہی نہیں تھا کہ ان کے ایک ایک کے ماتھے پہ لکھ دیتے اور تم جان لیتے کہ یہ منافق ہے۔ **وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ** (47:30) تمہیں خود ان کی باتوں سے اندازہ لگانا ہوگا کہ منافق کون ہے اور کون نہیں۔ **وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ** (47:30) ہم تو جانتے ہیں' یہ بات نہیں ہے کہ معاملہ ہم پہ بھی مشتبہ ہے' ہمیں تو معلوم ہے لیکن یہ بات نہیں ہے کہ ہم پھر اس طرح سے رسول کو بھی اگر ہم بتائیں تو اس کشمکش میں آمنے سامنے مقابلہ جو ہے ''ایہدے اچ تے فیر رعی ہوگئی جناب''۔ یہ بچے شام کو یہاں کھیلا کرتے ہیں وہ چور اور سپاہی' وہ چھپ جاتا ہے وہ جو چھپتا ہے تو میں یہاں بیٹھا ہوتا ہوں' چھوٹے چھوٹے بچے کہتے ہیں'' بابا جی! دسنانہ' دسنانہ'' وہ کھیل کا لطف ہی اس میں ہوتا ہے کہ ''دسنانہ' جے اوہدے اچ دس دئے تے مزہ ای جائے'' زندگی کے کھیل کا تو مزہ ہی اس کے اندر ہے'' جے چوردی گل جیہڑی ہیگی اے ایووں کر کے دس دتی جائے'' تو کھیل کا لطف اٹھ جاتا ہے۔ زندگی کے کھیل

کا بھی لطف یہ ہے کہ الجھن کا مقام آیا ہوا ہو اور اس میں پھر کہیں سے رعی یا رعایت کی بات نہ ہو' ٹھیک ہے خود بوجھو۔

وحی کے مقام کے علاوہ اسلامی مملکت میں مرکزِ ملت کی حدود اور اس کی ذمہ داریوں کی نشاندہی

یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ہم ان کے اعمال کو جانتے ہیں۔ ہم چاہتے تو مشکل بھی کچھ نہیں تھا' ہمارے لئے کیا مشکل ہے ان کی پیشانیوں پہ لکھ دیتے یہ کون ہے لیکن وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ط (47:30) تمہیں تو ان کی باتوں سے خود پہچاننا ہوگا لَتَعْرِفَنَّهُمْ (47:30) اور تم پہچان سکتے ہو' یہ جو ہے 'ل' والی بات جس انداز سے یہاں یہ VERB آیا ہے بڑا خوبصورت VERB ہے یعنی تم یہ کر سکتے ہو' ہم نہیں کر کے دیں گے۔ ایک چیز اگر کسی کی استعداد میں ہی نہ ہو تو وہ تو بات پھر ایسے کہنا کہ نہیں! تم خود کرو یہ بھی زیادتی ہے لیکن یہ چیز ایسی ہے کہ کر سکتے ہو اور پھر اگر تمہیں وحی سے بتا دیں تو قیامت تک کے لئے تمہاری زندگی اسوۂ حسنہ ﷺ تمہاری امت کے لئے کیسے بن سکتی ہے' اور وہ بھی ہر مقام پہ کھڑے ہو کے کہیں گے کہ ہمیں بھی بتاؤ۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ہر مقام پر جہاں یہ چیزیں آئیں 'وہاں یہ معنی نہیں ہوتے کہ خدا وحی کے ذریعے یہ بتا دیتا ہے' قرائن سے' بصیرت سے' اپنی فراست سے خود سمجھنا ہوتا ہے۔ اور اسی لئے قرآنِ کریم میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے کہ جہاں میں بالکل ٹھیک ٹھیک' سیدھے راستے کے اوپر تمہیں لاتا ہوں یا اس کی راہنمائی کرتا ہوں' تو وہ وحی کے ذریعے ہوتی ہے اور جہاں کہیں کوئی غلطی ہوتی ہے میری تدبیر کی وجہ سے ہے۔ تو دونوں میں ہمیشہ فرق کرنا چاہئے۔

زندگی میں گزرنے والے یا ہونے والے واقعات کی کڑیوں سے حقیقت کا اندازہ کرنا انسان کی بصیرت پر موقوف ہے

یہاں بھی معاملہ وہ چلا آ رہا ہے کہ حضرتِ یعقوبؑ کو وحی کے ذریعے' یہ چیزیں علم نہیں دیا جا رہا تھا' انہوں نے خود قرائن سے اندازے سے پہچاننا تھا۔ واقعات یوں کہئے کہ یہاں تک پہنچ چکے ہوئے ہیں کہ اگر ان کڑیوں کے اوپر غور کیا جائے یا ہم عام طور پہ دیکھتے ہیں ٹی وی پہ یا سینما کے اندر وہ بہت سی MYSTRY کی فلمیں آتی ہیں۔ میں بچوں کو دیکھتا ہوں' وہ آتی ہیں وہ ساتھ FOLLOW کرتے چلے جاتے ہیں ابھی وہ کہانی کا آخر نہیں آیا ہوتا' ایک پہلا CHAPTER ہی ابھی ہوتا ہے تو بچے کہتے ہیں کہ یہ مر جائے گا' اس کو یہ مار دے گا۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ وہ کڑیوں سے کڑیاں ملیں اور اگر وہ لکھنے والا ایسا ہو کہ وہ آگے جا کے کچھ اور تو اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جس انداز سے جا رہا ہے یہ اس کا انجام ہوگا۔ میں عام واقعات آپ کو بتاتا ہوں۔ اور جسے نبی منتخب کیا جاتا ہے اس کی تو فراست اور سیرت بھی بہت بلند ہوتی ہے۔ تو اس بنا پہ وہ سارا کچھ کہہ رہے تھے۔

طویل سفر کے بعد حضرت یعقوبؑ کے لیے خوشخبری یہ ایک عظیم نعمت سے کم نہ تھی اس سلسلہ میں دیکھیے اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ کا مفہوم

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ (12:96) یہاں پھر وہی جو ہمارے ہوتا ہے کہ وہ آیا تھا' وہ خوشخبری دینے والا' وہ قافلہ ذرا باہر ہی ہوگا انہوں نے اپنے میں سے جس کے پاس وہ کرتہ تھا' اس کو پہلے بھیجا ہوگا کہ بھاگ کے جاؤ۔ پہلے یہ سارا کچھ کیا ہوا تھا اب جو یہ سب بھید کھلا ہے تو پھر کہتے ہیں بھاگ کے جا پہلے' باپ کو انتظار ہوگا خوامخوہ کے لئے کیوں تکلیف میں رکھیں۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

وہ ہمارے ہاں جو وہ کہانی تھی کہ حضرتِ یعقوبؑ روتے روتے اندھے ہوگئے تھے اور پھر وہ یوسفؑ کا کرتہ چہرے پہ ڈال دیا تو وہ آنکھیں روشن ہوگئیں' بات یہ نہیں۔ یعنی عربی مبین کی یہ صاف چیزیں ہیں اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ (12:96) کے معنی ہیں کسی کے سامنے پیش کر دینا' سامنے پھینک دینا' رکھ دینا۔ ورنہ وَجْهِهٖ (12:96) کے معنی چہرا ہی ہو کہ اس کے اوپر ڈال دینا تو وَجْهِ اللّٰه جہاں قرآن نے کہا ہے وہاں ہم لوگ کیا کریں گے۔

قرآن حکیم کے مفہوم کو سمجھنے کا طریق تصریفِ آیات بھی ہے

یاد رکھئے! یہ باتیں جو ہیں' میں آپ کو عرض کروں قرآن کو جو کہا گیا ہے کہ یہ عربی مبین میں' اس قوم کی زبان میں اس کو نازل کیا گیا ہے' قرآن کے معنی سمجھنے کے لئے ان لوگوں کی زبان ضرور سمجھئے۔ وہ قرآن نے جو خود کہا ہے کہ ان کی زبان میں ہے۔ زبان میں محاورے بھی ہوتے ہیں' زبان میں ضرب الامثال بھی ہوتی ہیں اور زبان میں مرادفات تو پوچھو نہیں کتنے ہوتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ قرآن نے یہاں جو کہا ہے دیکھنا یہ چاہئے کہ عرب یہ جو لفظ بولتے تھے' اس کا مفہوم کیا لیتے تھے۔ یہ قرآن نے یہ الفاظ خود قائم نہیں کئے ہیں اس صورت میں سمجھنے میں واقعی DIFFICULTY ہوتی پھر تو خدا کو ایک لغت ساتھ بھیجنا پڑتا۔

قرآن حکیم کے باطنی معنی حاصل کرنے کا تصور قرآنی تعلیم کے قطعی خلاف ہے

یہ ہے جو آگے جا کے ہم نے ایک نیا عقیدہ وضع کیا کہ قرآن کے الفاظ کے وہ معنی نہیں ہیں جو الفاظ کے معنی ہیں' وہ الفاظ جو ہیں وہ تو استخواں ہیں یونہی پیش پا' اصل معنی ان کے نیچے ہیں باطنی معنی' اور وہ باطنی معنی جو ہیں وہ ہم جانتے ہیں ہم نے خدا سے حاصل کئے ہیں اور ہم پھر آگے سینہ بہ سینہ دیتے ہیں' ہمارا علمِ لدنی ہے۔ یہ تصوف کی اصطلاحیں ہیں: خدا سے براہِ راست اور ہم پھر آگے اس کو عام نہیں کرتے' سینہ بہ سینہ اپنے جو خلفا ہوتے ہیں' مرید ہوتے ہیں' ان کو یہ دیتے ہیں۔ تو گویا قرآن کی کیفیت یہ ہوگئی کہ ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ

(12:104) **بصائر للناس** کہتے رہو صاحب! شاعری ہے (معاذ اللہ) اصل میں یہ ہے کہ یہ سارے الفاظ یہ جتنے یہ سارا قرآن آ گیا ہوا ہے' کہنے لگے یہ تو یونہی الفاظ ہوتے ہیں بات تو اس کے اندر ہے اور وہ براہِ راست خدا سے حاصل ہو سکتی ہے۔ سوچئے پھر اس کی کیا حیثیت رہ گئی۔ سارا باطنی علم' قرآن کے باطنی علم' باطنی معنی کے اوپر تفسیریں لکھی ہوئی ہیں۔ اور پھر جب ان کو دیکھتے ہیں سر پیٹ کے رہ جاتے ہیں کہ ٹھیک ہے باطنی معنی کا کیا ہے جو جی میں آئے اس کے معنی آپ کر دیجئے۔ یہ لکھا ہوا ہے جی! اس کے باطنی معنی یہ ہے' سند کیا ہے؟ ہم خدا سے پوچھ کے آئے ہیں ''کر لو کی کر دے ہو''۔

قرآن حکیم کے متعلق یہ کہنا کہ یہ عربی مبین میں نازل ہوا اس کی ایک خاص وجہ ہے

میں سمجھتا ہوں کہ قرآن نے جب یہ کہا ہوتا ہے بظاہر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں یہ کہا کہ یہ عربی زبان کی کتاب ہے۔ کتاب اردو کی آپ لکھیں اور اس میں لکھیں کہ یہ اردو زبان کی کتاب ہے' ہر ایک کہے گا یہ اردو زبان کی کتاب کے متعلق لکھنا کہ اردو زبان کی کتاب ہے !! یہ تو لکھ دو سائنس کی کتاب ہے' اردو زبان کی کتاب ہے!!! یہ جو قرآنِ کریم نے لکھا ہوا ہے کہ عربی مبین میں' تمہاری قوم کی زبان میں' وہ اسی لئے ہے کہ وہ تو قیامت تک کا علم رکھنے والا تھا' اسے پتہ تھا کہ یہ کہنے والے آ جائیں گے کہ الفاظ کے معنی کچھ اور ہیں۔ انہوں نے کہا بالکل نہیں! وہ تمہاری قوم ان الفاظ کے جو معنی لیتی ہے وہی معنی ہیں۔ تمہاری قوم میں جو مستعمل الفاظ ہیں' یہ وہی الفاظ ہیں' تمہاری قوم کی زبان میں ہم نے اس کو اتارا ہے۔ اور پھر جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' زبان کا سمجھنا اور اس میں پھر استعارات' تشبیہات' محاکات' زبان کے محاورات' ضرب الامثال' یہ ساری چیزیں اور پھر عام معنی۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے علامہ پرویزؒ کی طرف سے لغات القرآن کو پیش کرنے کی سعادت کا ذکر

عزیزانِ من! یہ چیزیں بڑی ضروری ہیں۔ بات پھر وہ اپنی نہیں' میں عرض کر رہا ہوں آپ احباب کی معلومات کے لئے کہ میں نے جو قرآن کو سمجھا وہ اس طرح سے: پہلی اس میں کڑی یہ تھی کہ ان الفاظ کے معنی' عرب محاورے کی رو سے کیا ہیں۔ ایک عمر اس میں لگی بہر حال لگنی چاہئے تھی لیکن بہر حال میں نے یہ کیا ہے کہ اپنے لغات القرآن میں ان چیزوں کو اپنی توفیق سے اس میں رکھ دیا ہے۔ کوئی چیز اس میں الہامی نہیں' کشف نہیں' الفاظ نہیں ہے عربی زبان کے جو معنی اس زمانے کے انہوں نے رائج کئے ہوئے ہیں' مستند کتبِ لغت کے اندر وہی اس میں آئے ہوئے ہیں اس فرق کے ساتھ کہ قرآن نے جہاں جہاں پھر ان کی خود توضیح کی ہے' وضاحت کی ہے' ان کا بھی میں نے ساتھ حوالہ دے دیا ہے۔

تصریفِ آیات اور محاورہ عرب کو پیش نظر رکھے بغیر قرآن حکیم کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا

قرآن کے سمجھنے کے لئے دو ہی طریقے ہیں: محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات۔ عرب ان الفاظ کے معنی کیا لیتے تھے اور قرآن نے مختلف مقامات پر ان کو کس طرح استعمال کیا ہے۔ عزیزانِ من! سارا قرآن سمجھ میں آ جاتا ہے۔ نہ سمجھ میں آئے تو کہنے والے کی بات جو ہے کہ بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (3:138) ہے ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (12:104) ہے تمہارے لئے ہم نے اس زبان میں اتارا تا کہ تم سمجھ سکو۔ تو اگر پھر بھی نہ آدمی سمجھ سکے تو پھر یہ کہنا اس کا کہ ہم نے اتارا تم سمجھ سکو۔ پھر اس کے بعد تو اس کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔ عزیزانِ من! ایسی بات نہیں ہے۔ تو قرآن کے معنی لیتے وقت اس چیز کو سامنے رکھئے یہ چیز کہ یہ جو لفظ ہمارے ہاں ہیں کہ اس کے چہرے کے اوپر یوں ڈال دیا' دیکھو کہ عرب ان کو کس طرح استعمال کرتا تھا' بات سامنے آ جائے گی۔ اس کے سامنے جب انہوں نے کرتہ پیش کیا دیکھتے ہی انہوںؑ نے یہ بات کہی کہ کیوں! میں نہ کہتا تھا کہ یوسفؑ کے منصب کی مہک آ رہی ہے۔ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (12:96) یہ وہ پھر آئی یہاں' تیسری چوتھی بار آئی ہے یہ بات۔

قصہ آدم کی ساری کہانی آدم کے اعترافِ جرم اور انسان کے اپنے سرکش جذبات کی سرکشی کے گرد ہی گومتی ہے

بات کھل گئی' بیٹوں نے جو کچھ کیا تھا باپ کے سامنے آ گیا۔ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ (12:97) اس میں اعتراف کی بات آ گئی صاحب! یہیں سے قصۂ آدم کی بات شروع ہوئی تھی جو میں بتایا کرتا ہوں کہ معصیت تو ابلیس سے بھی ہوئی' معصیت آدم سے بھی ہوئی۔ آدم سے کہا کہ یہ کیوں کیا؟ کہا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا (7:23) اعتراف میں نگاہیں جھک جائیں تو اصلاح کی گنجائش ہو جاتی ہے۔ ابلیس سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگے میں کون کرنے والا' تو قادرِ مطلق' تیرے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا' مجھ میں یہ قوت کہاں تھی' تم نے کرایا میں نے کر دیا' کہنے لگے کہ یہ اپنی ذمہ داری سے جی چرا رہا ہے اور دوسرے کے سر تھوپ رہا ہے قیامت تک تیری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ نہ ابلیس' ابلیس ایک فرد تھا نہ آدم' آدم کوئی آدمی تھا بات تو بتائی یہ ہے کہ اصلاح کی گنجائش کہاں ہوتی ہے اور کہاں نہیں ہوتی ہے۔ اعتراف کیجئے اپنی غلطی کا' اصلاح کی گنجائش نکل آتی ہے' آگے تو پھر اس کا طریقہ آئے گا' گنجائش ہو گی۔ آپ اعتراف ہی نہیں کرتے کہ اس کے بعد ہزار راہیں کھلی ہوں' ہو ہی نہیں سکتی۔ پہلی چیز یہ اعتراف ہے رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا (7:23) اور پھر جرم کسی اور کے خلاف نہیں ہے ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا (7:23) اپنے خلاف ہے۔ کسی کا کچھ لیا دیا ہو اس کی چوری کر لی' دس روپے چرا لئے اس کی معافی تو یہ ہے کہ اسے دس روپے آپ دے دیجئے' دس نہیں وہ بیس مانگتا ہے دے دیجئے' معاملہ صاف

ہوگیا جرم کا۔لیکن وہی بات اس چوری کرنے سے جوتم نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے‘وہی نیٹشے کی بات آپ کوتو حفظ‘ یاد ہوگئی ہوگی لیکن دہرانی پڑتی ہے‘اس کملے کی بات‘ وہ (اقبال) اسے مجذوبِ فرنگی کہتا ہے‘ اس نے یہ بات کہی تھی کہ تم نے جو جرم میرے خلاف کیا ہے‘ اسے تو میں معاف کردوں گا لیکن اس سے جو جرم تم نے اپنے خلاف کیا ہے‘اسے کون معاف کرے گا اُسے تو میں بھی معاف نہیں کرسکتا۔

اپنی غلطی کا برملا اعتراف اور پھر اصلاح کی پوری پوری کوشش یہی تو ہے مرضِ کہن کا چارا

آپ کی اپنے کسی جرم سے‘ پستیٔ کردار سے آپ کی اپنی ذات کے اندر جو ایک فرق آ گیا ہے‘ کمزوری آ گئی ہے‘ تخریب آ گئی ہے‘ اثر اس کے اوپر ہوگیا ہے‘ دنیا کا کوئی انسان اسے نہیں دھوسکتا۔اسے تو آپ نے خود ہی دھونا ہوگا۔اسے کہتے ہیں خدا سے استغفار‘ یعنی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی سے آپ کی ذات کے اوپر ایک غلط اثر پڑا اس کی طرف آپ نے رجوع کیا جسے توبہ کہتے ہیں‘ یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے ایک دوسرا قانون ساتھ بنا رکھا ہوتا ہے کہ اگر اس کی اطاعت تم کرو گے تو وہ جو پہلی غلطی کا نقصان اور کمی ہوئی ہے‘ وہ پوری ہوجائے۔یہ خدا سے یہ جو کہتے ہیں استغفار کرنا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ یہ نہیں بات ہے‘ اعترافِ جرم کے بعد‘ رجوع کرنا اس طرف کہ اب اس کی تلافی کے لئے خدا نے کیا قانون دیا ہے۔جیسے ہر بدپرہیزی کے بعد آپ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں پوچھنے کے لئے‘ (بدپرہیزی کیا ہوتی ہے؟ ایک قانونِ طبعی ہے جس کی خلاف ورزی ہوتی ہے)

لفظ استغفار کا لغوی مفہوم اور پھر برادران یوسف کا اپنے والد حضرت یعقوب سے ایک اہم سوال اور اس کا واضح تر دوٹوک جواب اور پھر لفظ ''ذنب'' کا قرآنی مفہوم

آپ پوچھتے یہ ہیں کہ کوئی اور قانون بھی ہے اس کا جو اس کی تلافی کردے‘ اس کو اس کا علاج کہتے ہیں‘ وہ کہتا ہے ہاں! تم نے ہاتھ جلا لیا‘ آگ میں اس نے یہ تاثیر رکھی تھی کہ اس میں ہاتھ ڈالو تو جل جائے گا۔یہ اس نے ایک دوسری بوٹی اگا دی ہوئی ہے کہ جلے ہوئے ہاتھ پہ لگا دیجئے تو اس سے شفا ہوجاتی ہے۔یہ جو ہے اس کے معالجے کے لئے قانون کی تلاش میں رجوع کرنا‘ اسے استغفار کہتے ہیں۔قَالُوْا یٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا کُنَّا خٰطِئِیْنَ (12:97) ابا جان! یوسفؑ کے خلاف جو کچھ ہم نے کیا تھا اس نے وہیں ہمیں معاف کردیا تھا آپؑ تو اس سے پہلے ہی قدم قدم کے اوپر ہمیں معاف کرتے چلے جاتے ہیں لیکن اس سے جو جرم ہم نے اپنے خلاف کیا ہوا ہے اسے تو آپ بھی معاف نہیں کرسکتے‘ ہمیں بتایئے کہ خدا کے قانون کی رو سے ہم کیا کریں جو اس کی تلافی بھی ہوجائے۔یہ ہے اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا کُنَّا (12:97) کیا لفظ استعمال کرتا ہے!! ذنوبنا کیا انتخاب ہے صاحب!! ٹھیک ہے یہ معافی یہاں ہوگئی‘ معاشرے کی نگاہ کے اندر بھی ہم پاکباز ہوگئے‘ معزز بھی بن گئے‘ وہ جو کمی اندر ہے وہ تو پیچھے لگی ہوئی ہے جہاں جائیں۔ذنب کہتے ہیں

جانور کی دم کو کہ یہ جہاں جائے اس کے پیچھے چپکی ہوئی ہے یعنی کوئی مقام ہے ہی نہیں کہ یہ کم بخت کہیں چلا جائے اور وہ پیچھے نہ چپکی رہے' پانی میں ڈبکیاں مارے وہ چپکی ہوئی ہے' پہاڑ پہ چڑھ گئے پیچھے لگی ہوئی ہے' وہ زمیندار ڈنڈا مارنے والا جو ہے اس کی گرفت سے یا اس کی حد سے تو آگے چلا جاتا ہے' اس سے تو بچ جاتا ہے۔ یہ جو پیچھے چپکا ہوا یہ کم بخت یہ ہے' یہ چھٹتا ہی نہیں ہے۔ اسے ذنب کہتے ہیں کہ پیچھے چپکا ہوا۔ عقوبت بھی اسے ہی کہتے ہیں عاقبت اسی کا ہی نام ہے' پیچھے آنے والا۔ یہ ذنب آنے والا ہی نہیں ہے' ساتھ چپکا ہوا ہے کہ وہ جو علیحدہ' الگ ہونے والی چیز تھی اس کی معافی تو آپ نے دیدی' یہ جو ہے کم بخت جو ہر جگہ ہمارے پیچھے چپکی ہوئی ہے' اس کے لئے خدا کے قانون سے ہمیں اس سے حفاظت ہماری کرائیے **غفر** ہے حفاظت کا سامان' اس سے محفوظ کسی طرح سے کیجئے' یہ چین ہی نہیں لینے دیتی 'جینے نہیں دیتی' کہیں جائیں یہ پیچھے ہوتی ہے۔ اور پھر جب پیچھے کی کیفیت یہ ہو کہ مرنے کے بعد بھی یہ چپکی رہتی ہے کس طرح سے اس چھٹکارا ہو سکے گا' یہ تو پھر اسی کے قانون سے چھٹکارا ہو سکتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی بارگاہ میں جرم اور سزا کا فلسفہ بڑا غور طلب ہے اور صرف اسی کے تحت انسان کی بردمندی ہو سکتی ہے

قرآن کا یہ جرم اور سزا کا فلسفہ عجیب ہے' دونوں میں وہ فرق کرتا ہے دوسرے انسانوں کے خلاف کوئی جرم' اس کی معصیت اس کا استغفار تم سے ہو سکتا ہے اور اس کے بعد بھی جو یہ چپکی ہوئی چیز رہ جاتی ہے' یہ کوئی دوسرا انسان نہیں چھڑا سکتا اسے' اس کا تو وہ یہی طریقہ ہے **اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ** جو ایک غلطی سے کمزوری واقع ہوئی ہے اس کو رفع کرنے کا' اس چپکی ہوئی دم کو چھڑانے کا طریقہ یہ ہے کہ حسنات اتنے زیادہ کرو کہ اس کا وزن بھی پورا ہو جائے اور پلڑا بھی جھک جائے۔ عزیزانِ من! قرآن میں توبہ کا ایک طریقہ ہے: حسنات اتنے زیادہ کرو' ٹھیک ہے اس SUBJECT میں فیل ہو گئے تھے' سپلمنٹری ہونے والا ہے بیٹا! اس دفعہ اتنی محنت کرو کہ اس کے اندر 50 مارکس آ جائیں' یہ ہے جی استغفار اور توبہ **اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ** (11:114)۔ **اِسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕیْنَ** (12:97) **قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ ؕ** (12:98) ٹھیک ہے میں تمہیں بتاؤں گا (الفاظ وہی ہیں کہ) خدا سے تمہاری حفاظت چاہوں گا۔

خدا تعالیٰ کی صفات رحیم اور کریم کی عملی شکل اور اس کا محسوس نتیجہ

عزیزانِ من! قرآن میں جہاں بھی یہ خدا آتا ہے' اس کی ہدایت' اس کی رہنمائی' اس کا قانون' یہ سب چیزیں اس میں آتی ہیں۔ **اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ** (12:98) یہ ساری چیزیں ہیں جو اس نے دے رکھی ہیں' دونوں چیزیں اس میں ہوتی ہیں غفور: جو یہ

کمی ہوگئی ہے اس کو بھی پورا کرے گا' ان خطروں سے حفاظت کرے گا اور پھر اس دوران میں نشو ونما بھی تو تمہاری رکی رہی ہے' بیماری کے زمانے میں' دوائی سے تو یہ علاج ہو جائے گا۔ غفور یا مغفرت اور جو نشو ونما رک گئی کچھ غذا بھی ساتھ بتاتا ہے' یہ رحیم ہوتا ہے۔ لیکن یہ عمل جو ہے یہ ایک عمل مسلسل کرنے کا ہوتا ہے یہ عربی زبان میں جہاں یہ صفت آتی ہے اس باب کی فعیل کے باب کی' صفت جو رحیم آتا ہے اس میں ہمیشہ تسلسل ہوتا ہے' مسلسل ایک کام کرتے چلے جانا۔ اور وہ جو دوسرا باب اس میں آتا ہے فعلان کا' وہ رحمان ہوتا ہے کہ فوری کچھ کرنے کی ضرورت۔ جب آپ مریض کو ہسپتال میں لے جاتے ہیں تو ایمرجنسی کے وارڈ کے اندر سب سے پہلے رکھتے ہیں اگر کوئی چیز سیریس ہو تو' وہ اس وقت ہنگامی طور پر کچھ زیادہ چیز کرتے ہیں' نارمل علاج سے زیادہ وہاں کچھ ایمرجنسی میں کرنا پڑتا ہے عربی زبان میں یہ فعلان کے وزن پہ آتا ہے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ جو آتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں یہ چیز ہو پہلی چیز جو ہے ایمرجنسی ہے' صفتِ رحمانیت آئی ہوئی ہے پھر GRADUALLY آہستہ آہستہ جب OUT OF DANGER ہو جائے گا' ہوتا چلا جائے گا۔ زبان بھی عجیب ہے' الفاظ چننے والا بھی عجیب ہے۔ ایمرجنسی میں اگر آپ وہی طریقہ رحیمیت کا برتتے چلے جائیں' مریض ہی ختم ہو جائے' وہاں بڑی OUT OF THE EMERGENT پوزیشن جا کے کام کرنا پڑتا ہے اسے عربی زبان میں رحمانیت کہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ اس قدر پُر معنی' وسیع و بلیغ ہیں کہ ان کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا

کونسی زبان اس کا ترجمہ کرے گی!! ترجمہ یہی ہے کہ بخشنے والا مہربان' مہربان بہت مہربان۔ یہ بات نہیں ہے۔ انگریزی زبان کی طرف آ جائیں صاحب!, MERCIFUL۔ اسی لئے جنہوں نے ترجمے کئے ہیں حالانکہ وہ ترجمے رحم دل وغیرہ کے اپنے ہاں وہ سمجھتے ہیں رحم دلی کے اعتبار سے بڑے عمدہ ہیں' اس نے لتاڑا ہے اس نے انہیں کہا ہے (یہ عربی زبان کے فاضل تھے' میں نے کہا ہے کہ لین پول کی تو ڈکشنری ہمارے ہاں اس کا جواب نہیں ہے) کہ تم عربی میں بڑے فاضل تھے لیکن تم اس کتاب کا ترجمہ کرنے کے لئے بیٹھ گئے' وہ کہتا ہے قرآنِ کریم کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ کہتا ہے یہ تو ہم سمجھ ہی نہیں سکے کہ اس زبان کو کیا کہیں یہ تو کچھ زبان ہی الگ اس کی ہوتی ہے' وہ کہتا ہے وحی کی زبان ہی الگ ہوتی ہے۔ وہی زبان ہوتی ہے' ترجمہ نہیں کیا جا سکتا وہ کہتا ہے۔

علامہ پرویزؒ نے قرآن حکیم کا ترجمہ نہیں بلکہ اپنی اسطاعت کے مطابق مفہوم بیان کیا ہے

عزیزانِ من! بس یہ چیز تھی جہاں میں نے بھی ترجمہ قرآن کا نہیں کیا' کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مفہوم کو بیان کیا جا سکتا ہے اپنی استطاعت کے مطابق' اس کا مرادف لفظ کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔

جلال الدین کی تفسیر میں بھی وحی زبان کے مرادفات کی جگہ عربی میں مرادفات نہیں ملتے

مرادف کی کیفیت یہ ہے کہ عربی زبان میں آپ کو معلوم ہے کہ ایک ایک لفظ کے سینکڑوں مرادفات ہوتے ہیں۔عربی زبان میں اس کے لئے مثلاً جلالین ہمارے ہاں ایک تفسیر ہے وہ باپ بیٹا تھے جلال الدین ان کے نام تھے۔دونوں نے مل کے کیا جلالین اس لئے کہتے ہیں' انہوں نے کیا یہ ہے کہ وہ قرآن کا لفظ جو ہے اس کے بعد بریکٹ کے اندر عربی زبان کا دوسرا مرادف لفظ دیا ہے' وہ اسی طرح سے دیتے چلے جاتے ہیں' سارے قرآن کا یہ انہوں نے کیا ہے ہر آیت کے ہر لفظ کے آگے بریکٹ میں اس کا عربی کا مرادف۔تو اب یہ جو بریکٹ کے اندر قوسین کے اندر یہ لفظ آ گئے' عبارت آ گئی یہ عربی زبان کی ہے اور یہ لوگ جو تھے' یہ بھی بلاغت وفصاحت کے امام تھے وہ عربی چنی ہے کہ کیا کہنے ہیں۔لیکن وہ قوسین والی عربی والا جو قرآن ہے اس کو ذرا رکھ کے دیکھئے آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا کہتا ہے اور یہ کیا معنی میں دے گئے ہیں۔تو جس زبان کی کیفیت یہ ہو کہ عربی کا لفظ عربی میں اس کا مرادف نہ ملے' دوسری زبان میں کیا ملے گا۔

نیٹشے جو خود کو زرتشت کہلاتا تھا وہ بھی قرآن حکیم کی زبان کو وحی کی زبان کہنے پر مجبور ہو گیا تھا

یہ کم بخت نیٹشے اس بات کو بھی پہچانتا تھا وہ جو اس نے آخری کتاب لکھی ہے اور وہاں یہ اپنے آپ کو زرتشت کہتا ہے۔شاید کچھ ایسا ہی ہے کہ بہرحال! اس کا بھی آخری وقت میں آخری زمانے میں آ کے (فلاسفر تو بہت بڑا تھا) کچھ دماغ خراب ہو گیا تھا' جب یہ کچھ کہا ہے۔تو کچھ یہ ایسی چیز ہے ہی جس کا دماغ خراب ہوتا ہے' وہ اپنے آپ کو نبی سمجھنے لگ جاتا ہے۔ختمِ نبوت ﷺ کے بعد کی بات کر رہا ہوں۔اس نے اپنا نام زرتشت رکھا تھا اور اس نے کہا کہ یہ انسان کی باتیں نہیں ہیں' وہ خدا کو نہیں مانتا' عجیب بات ہے۔اس کتاب پہ جب آیا ہے تو اس نے یہ لکھا ہے کہ یہ بات جو ہے' یہ الہامی بات ہے یہ INSPIRATION کی رو سے میں کر رہا ہوں وہ عام جرمن زبان میں نہیں لکھی جا سکتی' جس زبان میں میں نے پہلے کتابیں لکھی ہیں' اس میں بھی نہیں لکھی جا سکتی' الہام کی اپنی زبان ہوتی ہے اور میں اس میں اپنی زبان قائم کر کے اس کو لکھوں گا۔اور اس نے اپنی طرف سے جو کچھ کیا ایک اور زبان' اسی زبان جرمنی کو اس کا انداز اور سٹائل بدلنے لکھنے کی اور میں نے جرمنی میں تو نہیں پڑھی' میں نہیں جانتا' جرمنی میں جنہوں نے پڑھی ہے انہوں نے کہا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ عجیب سطح کے اوپر وہ لے گیا ہے زبان کو۔یعنی وہ شخص بھی محسوس کرتا تھا کہ اس قسم کی بلندیٔ فکر جو ہے اس کی متحمل عام زبان نہیں ہو سکتی۔

ذاتِ خداوندی نے قرآن حکیم لکھنے کے بعد اپنا قلم ہی توڑ دیا

اور پھر جہاں کیفیت یہ ہو کہ وہ خدا کا کلام ہو اور کلام بھی وہ میں جیسا کہا کرتا ہوں کہ ترا کشید و دست از قلم کشید اس کی تصنیف آخری

تصنیف اس کرۂ ارض کے اوپر تو اس میں تو پوچھو نہیں کوٹڈ کہہ رہا ہوں کہ کیا کمال نہیں کر دیا ہوگا اس نے۔عزیزانِ من! اس کتاب کی موجودگی میں پھر یہ بات کہ کوئی الہام ہے اور یہ ہے' ہم نہیں کہہ سکتے۔جس کے ایک لفظ کا SUBSTITUTE عربی زبان میں نہیں مل سکا اس کی بجائے پھر دوسری آپ کہہ رہے ہیں۔فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰٓی اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ(12:99) جیسا میں نے کہا ہے' قرآن درمیان کی کڑیاں چھوڑتا جاتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کی طرف سے اپنے تمام افراد کو اپنے پاس بلا لینے کی دعوت

حضرتِ یوسفؑ نے کہ جاؤ۔باپ کو بھی اور اپنے اہلِ خاندان کو یہاں لے آؤ' اب وہاں کیوں مشکلات کے اندر رہتے ہو یہاں آرام رہے گا۔جب وہ یوسفؑ کے پاس آئے اٰوٰٓی اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ(12:99) باپ کو تو انہوں نے تعظیماً اپنے ساتھ جگہ دی انہیں بہرحال مہمان خانوں میں دوسرے مکانات دئے ہونگے۔وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ (12:99)واہ واہ! انشاءاللہ: ہمارے ہاں تو آپ کو پتہ ہے انشاءاللہ کہاں کہتے ہیں یعنی یقینی طور پہ نہیں کہا جا سکتا ہے' انشاءاللہ ہے۔یہاں تم امن میں رہو گے لیکن یہاں شرط یہ ہے اگر تم نے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی تو پھر تم امن میں رہو گے' مشروط ہے۔یہ نہ جان لینا کہ بھائی اب مصر کا عزیز ہے اتنے منصب پہ بیٹھ گیا ''سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا'' یہاں لفظ اٰمِنِیْنَ(12:99) ہے یہاں بھی امن میں رہنا چاہو گے تو یہ یہاں شرط ہے کیونکہ یہاں قانون کی حکمرانی ہے میرے ہاں بھی۔ایک تو وہ مقام ہوتے ہیں کہ جہاں آپ قانون کی اطاعت بھی کرتے چلے جائیں تو پھر بھی آپ اپنے آپ کو مامون نہیں سمجھ سکتے' دھڑکا لگا ہی رہتا ہے۔یہ وہ خطے ہیں اور یہی وہ خطے ہیں جہاں حقیقی امن نصیب ہو سکتا ہے۔تو اگر تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے رہے تو پھر میں تمہیں یہاں امن کی ضمانت دیتا ہوں۔اور یہی ضمانت ہے کہ جو خدا کی طرف سے مومنین کو ملتی ہے فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ(2:38) شرط ہے' جو اس رہنمائی کا اتباع کرے گا' خوف بھی نہیں ہوگا' حزن بھی نہیں ہوگا۔خوف بیرونی خطرہ ہوتا ہے اور حزن ہے جس سے کہ سبب معلوم نہیں ہوتا مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے' کہا یہ کیفیت بھی یہاں نہیں ہوگی۔

ہمارے ہاں برادران حضرت یوسفؑ کی طرف سے حضرت یوسفؑ کی تعظیم کو سجدۂ تعظیمی کی سند میں بدل دیا جو کہ تذلیل انسانیت ہے

وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ(12:100) والدین کو اس نے عزت کے مسند پہ بٹھایا اور یہ جو تھے یہ سب ان کی تعظیم بجالائے۔اب یہاں وہ آ گیا خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ(12:100) بس سجدے کا لفظ یہاں آیا اور یہاں سے چلا پھر قصہ اور مرشد

کو سجدۂ تعظیمی۔ آپ کو معلوم ہے کتاب لکھی ہوئی ہے خواجہ حسن نظامی صاحب نے' یہ سارے سجدہ کراتے ہیں۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِیْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ (2:26) اسی قرآن سے گمراہ ہو گئے۔ اس آیت سے لائے ہوئے ہیں صاحب! دیکھئے کہ وہ سجدہ کیا انہوں نے یوسفؑ کے ماں باپ کو اور یوسفؑ کو تو مرشد کو کیوں نہیں کیا جا سکتا' چل بھئی! سند مل گئی قرآن سے۔ سجدہ کرنا اور تعظیم کرنا' احترام کرنا بڑا فرق ہے۔ کہو تعظیم ہے' ٹھیک ہے' کی جائے گی' بڑے کی تعظیم کی جاتی ہے' عمر میں بڑا بزرگ ہوتا ہے' اس کی بھی تعظیم کی جاتی ہے' تعظیم اور بات ہے۔ کسی کی عظمت کا اعتراف یہ ہے تعظیم' احترام کیا جاتا ہے۔ سجدہ یہ جس کو ہم یہ PHYSICALLY اس طرح سے' پاؤں چومتا ہے یہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ تعظیم شرفِ انسانیت ہے' تعظیم کرنے والے کے لئے بھی تعظیم کرانے والے کے لئے بھی۔ سجدہ کرنا علامت ہوتی ہے ذلت کی' SALVATION کی' یہ انسانیت کی تذلیل ہے کرنے والے کی تذلیل ہے' جس کو کیا جاتا ہے اس میں غلو ہے۔

کسی کو اس کے مقام سے بڑھا چڑھا کر پیش کرنا' غلو ہے

اس کو اس کے مقام سے اونچا لے جاتے ہیں۔ قرآن نے غلو کو بھی منع کیا ہے اور تذلیل کو تو اس نے پتہ نہیں کیا کچھ جرم قرار دیا ہے۔ تعظیم اور احترام اس کے معنی ہیں۔ انہوںؑ نے پھر تعظیم کی احترام کیا۔ وہ خروا کے لئے قرآن نے یہاں وہ فاعل تو بتایا نہیں کہ کون کون' سارے اہلِ دربار' ان کے کارندے' ملازم' وہاں کے لوگ' یہ سارے بھائی جنہیں ایک عزیز مصر عزت کی مسند پہ بٹھائے ویسے بھی وہ اس کے ماں باپ ہوں' وہ جتنے بھی وہاں تھے' انہوں نے بھی ان کی تعظیم کرنی تھی۔ تعظیم کتنی سیدھی سی بات ہے۔ نہیں! وہ غلام کے طور پہ سر رکھ کے سجدہ کیا جائے گا کیونکہ مرشد کو کراتے ہیں۔

اس منظر کشی کے پیشِ نظر حضرت یوسفؑ نے کہا کہ یہ تو میرے اس خواب کی ہی تعبیر معلوم ہوتی ہے

انہوں نے بھی اس کی تعظیم کی۔ یوسفؑ نے اس مقام پہ کہا کہ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَایَ مِنْ قَبْلُ ۫ (12:100) وہ جو بچپن میں میں نے خواب دیکھا تھا گیارہ ستارے اور چاند اور سورج وہ میرے سامنے جھکے ہوئے ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی خواب کی تعبیر نظر آتی ہے۔ آہاہا! منظر کیسا حسین تھا۔ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ (12:100) وہ تو خواب ہی تھا وہ ایسے تو نہیں لیکن دیکھئے میرے خدا نے کس طرح سے خواب کو سچا کر دکھایا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر خواب سچا ہی آئے۔ یہاں تو جناب ختمِ نبوت ﷺ کے بعد وحی کی جو قسمیں گنانی شروع کی ہیں پوچھو نہیں پھر وہ مخاطبات اور مکالمات اور مبشرات اور رءیائے صادقہ یعنی سچے خواب وحی کے ذریعے سے ہو رہے ہیں۔ کہنے والوں کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ وہاں کیا ہے۔ خیر! وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ بات کچھ ایسی نہیں تھی کہ یقیناً ایک سچی بات تھی'

خدا نے یوں سچا کر دکھایا ہے' ایسا نظر آتا ہے اس سے کہ یہ اسی انداز کا خواب ہے۔ اور اسی وقت یہ بات نہیں ہوئی' اب گنایا اسی طرح جیسے حضرتِ موسیٰؑ کے متعلق خدا نے گنایا تھا وَ قَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ (12:100) اس نے تو بڑے ہی احسان کئے مجھ پہ' جب اس نے مجھے قید خانے سے نکالا۔

قید و بند کی اذیت ناکیاں آپ کا سیرت کردار' بادشاہ کی طرف سے رہائی کا حکم نامہ لیکن آپ کی پروقار شخصیت کا انکار اور پھر خدائے رحیم کا احسان عظیم اور تخت نشینی کے دل کش مناظر

آپ نے غور کیا کہ یہاں کونسا وہ احسان بتایا ہے' کیا بات ہوئی تھی جس کا وہ احسانِ خداوندی' خدا کے حسن کارانہ انداز جسے آپ کہیں گے' بڑا حسین انداز تھا قید خانے سے نکلنے کا' غور کیجئے گا ایسے نگاہ جاتی ہے کہ ٹھیک ہے' جی میں قید میں پھنسا ہوا تھا ابا جان! وہاں تو بڑی تکلیف تھی بڑی مشکل میں تھا' اللہ تعالیٰ نے وہاں سے مجھے نکال دیا یا اللہ تیرا احسان ہے۔ اَحۡسَنَ بِیۡ اور بات ہے' آپ کو یاد آ گیا یا یاد دلاؤں۔ جی! قید خانے میں تھے وہ جو تھا پوچھ گیا کہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر کیا ہے اس نے جا کے بادشاہ کو بتایا تھا' بادشاہ بھونچکا رہ گیا کہ میرے نورتن کہتے تھے کہ یہ تو سارا وہی ہذیان ہے' اس شخص نے اس کی ایسی عمدہ تعبیر بتائی ہے کہا کہ یہ شخص تو بہت بڑا نظر آتا ہے۔ پھر انہوں نے یہ بھی کہا کہ صاحب! قید خانے میں ہم نے اس کو دیکھا ہے اس کا تو کردار بڑا اونچا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اس سے کہو کہ ہم نے معاف کیا' قید سے باہر آ جاؤ۔ انہوں نے جا کے کہ بادشاہ نے یہ کہا کہ قید سے باہر آ جاؤ۔ ٹھیک ہے بادشاہ کا حکم ہے اپنے آپ پہ یقین ہے کہ وہ بے گناہ تھے' بے گناہ پھنسا ہوا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ باہر آ جاؤ اتھارٹی بھی موجود ہے قانون کے اعتبار سے تو اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ اب وہ نہ کر دے۔ عزیزانِ من! یہاں ہے وہ چیز' یہ جو لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔ یوں وہاں سے نکل آتے تو یہ بات نہ ہوتی۔ اس سے کہا یہ تھا کہ تیرے بادشاہ کا' اس سے جا کے کہو کہ میں ترحمِ خسروانہ کی بنا پر قید سے باہر نہیں آنا چاہتا' اگر وہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو اس سے کہو میرے مقدمے کی ازسرِ نو تفتیش کرائے اگر بے گناہ ثابت ہوں' اس وقت باہر آؤں گا' یوں باہر نہیں آؤں گا۔

عزت و وقار کے ساتھ قید سے رہائی پر فرشتوں کی طرف سے گل فشانی کا منظر قید بھی باوقار اور اگر آزادی ہے تو وہ بھی باوقار.....

قَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ (12:100) یا اللہ! تیرا یہ احسان تھا اس وقت جو میں نے یہ بات کہی تھی یوں تو نے مجھے اس قدر حسن کارانہ' اس قدر حسین انداز تھا میرا قید خانے سے نکلنے کا' خدا اور اس کے فرشتے تبریک و تہنیت کے پھول برسا رہے ہوں گے۔ عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ ہیں' صرف نبی کے لئے قرآن نے کہا مومنین کے لئے بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔ اور یہ تو نبی

تھے ہی میں کہتا ہوں' میں کہہ بھی دوں تو کیا حرج ہے فرشتے جلو میں آ رہے ہونگے قربان ہوتے۔ کیا انداز ہے تیرا قید خانے سے نکلنے کا۔ یہی ہے دعا جو میں نے کہا ہے کہ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ (17:80) کہیں اگر بھیجنا ہے وہ بھی سچائی کے ساتھ بھیج' کہیں سے نکالنا ہے تو سچائی کے ساتھ باہر نکال۔ یوسفؑ سچائی کے ساتھ باہر نکلا' بڑا کریکٹر ہے صاحب۔ اے ہماری روایتو' اے ہماری تفسیر' اس دن بھی کہا تھا کہ کلیجہ شق ہو گیا پھر دہرا دوں کہ کلیجہ شق ہو جاتا ہے۔ عزیزانِ من! آپ کے ہاں بخاری کی حدیث ہے' وضعی روایت ہے یہودیوں کی وضع کی ہوئی کہ یہاں جب پہنچے اس آیت پہ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوسفؑ نے تو اس وقت یہ کہا اگر میں ہوتا تو فوراً باہر چلا آتا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ جو یہ دعا کہہ رہا ہے رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ (17:80) کہ کہیں اگر بھیجنا ہے تو وہ بھی صدق کے ساتھ بھیج کہیں سے نکالنا ہے تو وہ بھی صدق کے ساتھ نکال اس کی یہ کیفیت ہوتی!! اور در آں حالیکہ قرآن بتا رہا ہے اسوۂ یوسفؑ کی بلندی رسول ﷺ کے سامنے ہے اور رسول ﷺ یہ کہہ رہے ہیں۔ نظر آ رہا ہے خاص یہود کی سازش کہ اپنے نبی (وہ تو ان کو اپنا نبی سمجھتے ہیں) کا کردار اتنا اونچا ہے اور آپ کے جو نبی تھے اس کے متعلق ایک چیز وضع کی اور اپنے ہاں تالمود میں اس کو نہیں داخل کیا آپ کی اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے اندر اس کو داخل کیا۔ سینے سے لگا رہے ہیں اور آج تو وقت یہ کہہ دے کہ ناموسِ رسالت ﷺ کا احترام مجھے اس سے مانع ہوتا ہے کہ میں اس کو سچا سمجھوں' یہ وضعی ہیں' کہتے ہیں بخاری کی حدیث سے انکار کفر ہے' کفر کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ قَدْ اَحْسَنَ بِیْ (12:100) کیا بات ہے صاحب! قید خانے سے نکلنا ہی نہیں' جس حسن کارانہ انداز سے اس قید خانے سے مجھے اس نے نکالا ہے وہ بھی بڑا احسان ہے۔ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ (12:100)

خدا تعالیٰ کی صفت علیم اور حکیم کے سامنے عقلِ انسانی سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے

اب حضرت یوسف کے متعلق بھائیوں کے خلاف جرم سارا سرزد ہو رہا تھا انہیں براہِ راست مطعون نہیں کیا' بھائیوں سے ان کے جذبات کی سرکشی نے جو کچھ کیا تھا اس سے تو بڑا ہی بُعد پیدا ہو گیا تھا' اس صحرا میں جہاں تم رہتے تھے اور جس انداز سے برادرانِ یوسف تم اس صحرا سے یہاں آئے اور پھر جس عزت و تکریم سے یہاں یہ کچھ ہوا ہے یہ ساری چیزیں جو ہیں' اس کے پیشِ نظر اس کی درگاہ میں سجدۂ شکرانہ ادا کرتا ہوں۔ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ (12:100) یہ سب کچھ اس کے قانونِ مشیت کی رو سے ہوتا ہے لیکن ایسا وہ کچھ لطیف انداز میں ہوتا ہے کہ محسوسات کی خوگر نگاہیں اس کو جلدی سے بھانپ نہیں سکتیں۔ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ (12:100) وہ سب کچھ جانتا بھی ہے جاننے والے کے لئے کیا مشکل ہے کہ اسے وہ یوں کر دے' نہ! حکیم' کرتا سارا کچھ حکمت کی رو سے ہے کہ اس میں عقل و فکر کہیں عاجز نہ آ جائے۔ حکمت تو وہ چیز ہوتی ہے جسے عقل و فکر کی رو سے سمجھا جائے۔ علم جو اس کا ہے وہ تو ہماری عقل و فکر کے

کوائف سے بالاتر ہے' ٹھیک ہے براہِ راست سمجھتا ہے۔لیکن اس علم کو جب وہ بروئے کار لاتا ہے تو اس انداز سے لاتا ہے کہ ہم آپ اپنی فراست وبصیرت کی رو سے اسے سمجھ سکتے ہیں' یہ ہے اس کا لطیف ہونا۔رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ (12:101) اب اس کے بعد خدا کے حضور جسے کہتے ہیں سجدۂ شکرانہ' اے پروردگار! اے نشوونما دینے والے! تیرے بہت بڑے احسانات ہیں اس حالت سے نکالا۔ مِنَ الْمُلْکِ(12:101) اقتدارِ قوت' جو میں نے عرض کیا تھا وہاں جو کہا جاتا ہے کہ صاحب! وہ آ گئے وہاں سے اور ایک کافر بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی' یعنی اندازہ لگاؤ کیا گستاخانہ انداز ہے۔وہاں بھی اس بادشاہ نے بھی یہ چیز کہی تھی ان سے اور وہاں یہ چیز موجود ہے کہ اتنے اختیارات دئے کہ وہاں جہاں بھی یوسفؑ جائیں ان کو اقتدار و اختیار حاصل تھا ۔تو جس کی کیفیت یہ ہو جائے اسے یہ کہہ دینا چاہئے کہ اس نے نوکری کر لی ہے۔قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ(12:101) یہ ہے جو کچھ ملا ہے وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ (12:101) اور اتنی ہی بات نہیں ہے کہ مملکت مل گئی' مملکت تو ہلاکو اور چنگیز کو بھی مل جاتی ہے' اس کے ساتھ ہی یہ کیفیت بھی ہوگئی کہ جو واقعات رونما ہوں' نگاہ وہ دیدی کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت بات سامنے آئے تو اس کا انجام میری نگاہ کے سامنے آئے' یہ تیرا بہت بڑا احسان ہے۔عزیزانِ من! ملک اگر کسی کو ملے اور یہ خصوصیت اس کے ساتھ اس کو مل چکی ہوئی ہو' پھر وہ ملک جو ہے وہ بڑا ہی خطرات سے مامون ہو جاتا ہے۔خوش بخت ہے وہ ملک کہ جس کو ان نگاہوں والے مل جائیں۔ نگاہوں والے ہی نہیں پھر ان کی کیفیت یہ بھی تو ہو کہ جب تک اپنے آپ کو سچا نہ ثابت کر لیں' قید خانے سے ہی نہ نکلیں کریکٹر اتنا اونچا ہونا چاہئے۔لیکن یہ نگاہ اگر ہو تاویل الاحادیث کی کہ آنے والے واقعات کا اندازہ لگا لیں کہا کہ تیرا احسان تھا تو نے مجھے یہ اتنی بڑی مملکت دی یا اختیارات دئے تو یہ سمجھ بوجھ بھی ایسی عطا کر دی آنے والے واقعات کا اندازہ لگا لینا۔کہا بس اتنی سی چیز ہے کہ یہ اندازہ' قیاساً یہ ہے جو تو نے علم عطا کیا ہے فراست کا۔کہا یہ کوئی خدائی صفت نہیں اس کے اندر پیدا ہوگئی' خدائی صفت تو یہ ہے کہ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قف(12:101) کوئی چیز جو نہیں ہے اس کو وجود میں لانا یہ تو صرف تیرے اختیار کی بات ہے کسی انسان کے اختیار کی بات نہیں ۔غیب کے علم کے معنی ہوتے ہیں جو آج بات نہیں ہے اس کو آج وجود میں ہم لے آئیں جبھی اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قف(12:101) نہ نہ نہ! یہ بات نہیں ہے کہ NOTHINGNESS اگر ہو تو اس کو میں BEING کے اندر لے آؤں یہ بات بالکل نہیں۔وہ واقع جو ہوتا ہے وہ وہاں کڑیاں چلتی ہیں وہ واقع آخر میں ہوتا ہے کڑیوں کے ذریعے سے ہم وہاں پہنچتے ہیں۔یہ کہ ہو کچھ نہ اور اس کو وجود میں لے آئیں یہ تیرا ہی کام ہے۔اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ (12:101) تو ہی دوست ہے' تو ہی پناہ دینے والا ہے' تیرا ہی سہارا ہے فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ مومن کی یہی کیفیت ہوتی ہے' یہیں نہیں وہ چاہتا' مستقبل میں بھی یہی چاہتا ہے۔ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (12:101) دعا یہ ہے کہ جس طرح اب تک تیرے قوانین کے سامنے جھکا رہا

ہوں، کہیں تجھ سے سرکشی نہیں برتی، یا اللہ! ملکِ عظیم ملا ہے، صلاحیتیں بھی تو نے بڑی دی ہیں، دعا یہ ہے کہ تیرے حضور جھکا ہی رہوں جھکا ہی رہوں، تَوَفَّنِیۡ (12:101) تا آنکہ موت آ جائے۔ قرآن نے ہم سے بھی کہا ہے فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (2:132) مسلم ہونا ہے تو اس انداز سے مسلم ہو کہ زندگی کے ہر سانس کے اندر اس کے سامنے جھکے ہو تا آنکہ آخری سانس آ جائے۔ کیا بات ہے صاحب!! ہر سانس میں یہ رہو تا آنکہ آخری سانس تمہارا آ جائے۔ کہا کہ یہ کیفیت ہو اور آخری سانس آنے تک تو میں جھکا ہوا رہوں، دعا یہ ہے کہ اس کے بعد جب میں اٹھوں تو اس زمرے کے اندر میں جاؤں کہ جن کے کام سنورے ہوئے ہوں، ان کے ساتھ مجھے آگے لے جانا۔ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ آگے فرد تو اکیلا جاتا نہیں ہے فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ۙ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ (89:29-30) ہے میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو اور یوں جنت میں آ۔ یہ معیت والی بات آج وقت ہو گیا ہے پھر بتاؤں گا کہ فرد فرد بھی رہتا ہے اور جماعت کے ساتھ بھی شامل ہوتا ہے انفرادیت بھی اس کی باقی رہتی ہے اور وہ ملت کا رکن بھی رہتا ہے۔ اسی لئے اس نے کہا ہے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ کی اہمیت

خزاں کے موسم میں خشک پتہ اگر شاخ سے جدائی اختیار کر کے ٹوٹ کے گر پڑے وہ آج کی اصطلاح میں علیحدگی پسند ہو جائے تو اس کے بعد ہزار اس درخت کے اوپر بہاریں ناچتی رہیں، مسکراتی رہیں وہ تو پامال ہو گیا، ختم ہو گیا، اس کے نصیب میں زندگی نہیں ہے۔ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ (12:101) وہاں اس شجرِ طوبیٰ کی شاخوں کا پتہ بنا جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیتیں ہوں۔ ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡکَ (12:102) عزیزانِ من! داستان عجیب وغریب ہے حضرتِ یوسفؑ کی، اتنی نور ونکہت کی خاموش داستان یہ جو ہمارے سامنے آئی، واقعی آج کچھ افسوس سا ہو رہا ہے کہ ختم کیوں ہو گئی۔ اور ختم ہونے کے بعد یہ بات آگے نبی اکرم ﷺ سے خطاب کیا گیا ہے آخری چند آیتیں جو ہیں وہ دوسری طرف آ گئیں۔ یہ داستانِ حضرتِ یوسفؑ کا مقطع کا بند تھا، اللہ کا شکر ہے کہ اس کی دی ہوئی فراست کے مطابق ہم نے اس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ باقی تو یہ باتیں سمجھی جائیں گی قیامت تک سمجھی جائیں گی، ہر سمجھنے والا اس سے بہتر سمجھے گا۔ ہم سورۃ یوسفؑ کی آیت 101 تک آ گئے 102 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

دسواں باب: **سورۃ یوسف** (آیات 102 تا 106)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1974ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ یوسف کی آیت 102 سے ہو رہا ہے (12:102)۔

قرآن حکیم میں بیان کردہ داستانوں کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی ذات پہلے واقف نہ تھی

آپ کو معلوم ہے کہ اس سورۃ میں حضرتِ یوسفؑ کی حسنِ سیرت مسلسل بیان ہوتی چلی آ رہی تھی اور گذشتہ درس میں وہ اس داستان کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اب اس ختم ہونے کے بعد اب نبی اکرم ﷺ کو خاص طور پہ مخاطب کیا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡکَ ۚ وَ مَا کُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ اِذۡ اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ وَ هُمۡ یَمۡکُرُوۡنَ (12:102) کہا یہ گیا کہ یہ دیکھئے یہ غیب کی خبریں ہیں جو تمہیں وحی کے ذریعے بتائی جا رہی ہیں' اے رسول! تم تو وہاں موجود نہیں تھے جب وہ یوسفؑ کے بھائی اس کے خلاف اس قسم کی سازشیں کر رہے تھے' تم وہاں نہیں تھے۔ اور اب یہ جو اتنی تفصیل سے یہ سب کچھ بیان ہو رہا ہے تو یہ چیزیں تمہارے اپنے ذاتی علم کے بس کی تو نہیں تھیں یہ غیب کی چیزیں تھیں اور کہا یہ کہ انہیں ہم تمہیں بتا رہے تھے وحی کے ذریعے سے۔

تورات اور انجیل میں بیان کردہ تاریخی واقعات کی نوعیت قرآن حکیم کے بیان سے مماثلت نہیں رکھتی

یہ چیز بڑی اہم ہے پہلے بھی میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے بار بار یہ کہا ہے کہ غیب کا علم اور یہاں تو غیب کہا گیا ہے ماضی کے واقعات جن کا حضور ﷺ کو عام طریقے سے علم نہیں تھا اور نہ ہی ان تفاصیل کا کہیں اور ذکر موجود تھا۔ تورات میں یہ قصے آئے ہیں لیکن

ان میں اور جس انداز سے قرآنِ کریم میں یہ بیان ہوئے ہیں' بڑا فرق ہے۔ اور میں آگے چل کر جب وہ کشمکشِ صاحبِ ضربِ کلیم حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی داستان آئے گی تو اس میں کئی مقام آئیں گے جہاں میں عرض کروں گا کہ قرآن میں بیان کردہ حصہ اور وہ جو تورات میں بیان کیا گیا ہے اس میں کتنا فرق ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ عصرِ حاضر کی تحقیق کی رو سے' اور یہ چیز زیادہ تعجب انگیز ہے کہ وہ تحقیق خود یہودیوں کی کی ہوئی ہے' جن کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآنِ کریم' تورات' بائبل بھی انبیاء پر نازل ہوئی ہوئی کتابیں ہیں۔ تو خود یہودیوں کی تحقیق کی ہوئی ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تورات میں جس طرح سے وہ بات لکھی ہے تاریخی شہادت نے اس کی تردید کی ہے اور جس طرح قرآن میں کہا گیا ہے اس کی تصدیق کی گئی ہے۔ تو گویا یہ واقعات اس زمانے میں صرف بائبل میں مذکور تھے اور بائبل اور قرآن میں جس طرح سے ان کا ذکر آیا ہے ان میں اختلاف ہیں۔ ان اختلافات کے متعلق صورت اب یہ ہے کہ جوں جوں تاریخی تحقیقات سے وہ علم پہ پڑے ہوئے پردے اٹھتے جا رہے ہیں' قرآن میں جس انداز سے یہ بات آئی ہے اس کی تصدیق ہوتی جا رہی ہے اور جس دوسری جگہ یہ باتیں جس طرح تھیں ان کی تردید ہوتی چلی جا رہی ہے۔

علم غیب کی اور پیشین گوئی کی نوعیت اور انسان کی اپنی شخصیت

تو جتنی چیزیں ماضی کی تھیں جن کا علم اس زمانے میں تھا ہی نہیں انہیں بھی قرآن نے کہا ہے کہ یہ غیب کی باتیں ہیں اور زیادہ تر پھر اس کے بعد کہا ہے کہ آنے والے جو واقعات ہیں وہ تو بہرحال غیب ہیں۔ خاص طور پہ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا' کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اس کی موت کہاں واقع ہوگی۔ مثال کے طور پر اس نے مستقبل کی باتیں جو ہیں' FUTURE جسے کہتے ہیں' اس کے متعلق خصوصیت سے کہا کہ یہ غیب کی باتیں ہیں۔ غیب کے متعلق قرآنِ کریم نے بالتصریح ایک جگہ نہیں متعدد بار کہا ہے کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔ موضوع سے ہٹ کر بات لمبی ہو جائے گی' جب میں آؤنگا اس علمِ غیب کی کسی آیت پہ تو وہاں عرض کروں گا کہ دنیا میں' جسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہو' اس کے متعلق آپ پیش گوئی کر ہی نہیں سکتے۔ ''یہ کل کیا کرے گا'' قرآن نے کہا ہے کہ یہ تو تم خود اپنے متعلق بھی بالیقین حتمی طور پہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ میں کل کیا کروں گا۔ کتنے ہی واقعات اور ایسے ہونگے جو تمہارے علم میں نہیں اور جن کا تمہیں احاطہ بھی نہیں ہوگا ان کی رو سے معلوم نہیں کہ کل کیا واقعات پیش آئیں۔ اور جن میں انسان کو اختیار دیا گیا ہو' اس کے متعلق تو پہلے سے کوئی پیش گوئی کی ہی نہیں جا سکتی' پیش گوئی ان کے متعلق کی جا سکتی ہے کہ جنہیں اختیار تو نہ ہو۔ مشین کے متعلق کی جا سکتی ہے' اس کا اگر قانون معلوم ہو' اس کی حرکت کا' اس کے چلنے کا' اس کے متعلق پیش گوئیاں کی جا سکتی ہیں' اسے پیش گوئی کہا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ تو کہا جائے گا کہ ایک قانون FACT ہے اس FACT قانون کے جو نتائج ہیں جس کو بھی اس قانون کا

علم ہے' وہ بتا دے گا۔علم الافلاک کے ماہرین سو برس پہلے بتا دیں گے کہ سورج کو کب گرہن لگے گا' اس لئے کہ یہ سارا انداز MECHANICAL ہے مشینی انداز ہے۔وہ تابع ہے ایک قانون کے اور انہیں اختیار نہیں ہے کہ اس قانون میں ذرا سی بھی تبدیلی کریں۔جنہیں اس قانون کا علم ہے وہ سو برس کیا ہزار برس پہلے کہہ سکتے ہیں کہ سورج کو یہ چیز یوں ہوگی' زمین کی کیفیت یہ ہوگی۔اسے علمِ غیب نہیں کہا جاسکتا کہ جو FACT قانون کے تابع ہو لیکن وہ ہوسکتا ہے انہی کے متعلق جنہیں اس کا اختیار نہ ہو کہ وہ قانون کی خلاف ورزی بھی کرسکتے ہیں۔تو انسان کے متعلق تو یہ کہا ہی نہیں جاسکتا۔

عملی دنیا میں اختیار و ارادہ رکھنے والی مخلوق کا کردار اور اس کا نتیجہ

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ایک درس میں یہ بتایا تھا کہ انسان تو خیر اتنے اختیار و ارادے کا مالک ہے' یہ نیچے حیوانات وہ بھی کچھ تھوڑے سے اختیار کے مالک ہوتے ہیں۔تو وہ SLIMUN نے کہا ہے "LIMITATIONS OF SCIENCE" ان کی کتاب ہے بہت اچھی کتاب ہے اس میں وہ اسی موضوع پہ گفتگو کرتا ہوا خارجی کائنات کے نظم و نسق کے متعلق کہ وہ کس قدر حسابی قاعدے کے مطابق چل رہا ہے جس میں ایک ثانیہ اور ایک بال کا بھی فرق نہیں آتا۔اور اس کے مقابلے میں انسان کہ جس کے متعلق کہا ہی نہیں جاسکتا کہ یہ اگلا قدم کیسے اٹھائے گا۔اس نے کہا انسان تو ایک طرف رہے (اسی کی مثال پھر دہراتا ہوں) اس نے کہا یہ تھا کہ ایک میز کے گرد دس سائنٹسٹ بیٹھے ہوں اور وہ خارجی کائنات کے متعلق ہزار برس بعد کی باتیں بھی بتا سکیں گے کہ یہاں یوں ہوگا' اس طرح سے ہوگا' وہ سب ٹھیک ہوگا۔لیکن اسی میز پر جو مکھی بیٹھی ہوئی ہوگی وہ دس کے دس زور لگا کے بھی نہیں کہہ سکیں گے کہ یہاں سے یہ اڑ کے کہاں بیٹھے گی۔اس لئے کہ اس میں وہ MECHANICAL حسابی قاعدہ نہیں آتا۔انسان کی دنیا تو ان مکھیوں سے کہیں زیادہ صاحبِ اختیار ہے۔یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ وہ راز ہے جسے خدا کے سوا کوئی اور نہیں جان سکتا حتیٰ کہ اس نے رسولوں کے متعلق بھی کہا ہے کہ وہ بھی از خود اسے نہیں جان سکتے' ہم اپنے غیب کے علم میں سے جتنا چاہتے ہیں کسی رسول کو بذریعہ وحی اس کا علم دیدیتے ہیں۔تو جو شخص یہ کہتا ہے کہ کل کو یہ ہوگا۔

حسابی قاعدے سے ہٹ کر کل کو کیا ہوگا کا دعویٰ کرنے والا شخص وحی ملنے کا دعویٰ کرتا ہے

اس حسابی قاعدے سے نہیں جس سے وہ سائنٹسٹ کہتا ہے بلکہ وہ انسانوں کی دنیا کے متعلق کہتا ہے کہ یہ ہوگا قرآنِ کریم کی رو سے وہ دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی آئے گی کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ وحی کے علاوہ دوسرا طریقہ ہی نہیں کہ تمہیں غیب کا علم ہو جائے۔لہٰذا یہ پیشین گوئیاں کرنے والے بظاہر تو ہم ان چیزوں کو بڑا LIGHTLY لیتے ہیں' یہ بڑی گہری چیزیں ہیں۔کوئی شخص

جو دعویٰ کرتا ہے پیشین گوئی کرنے کا' صرف یہ دعویٰ کہ میں یہ پیشین گوئی کل کے متعلق کر رہا ہوں انسانی دنیا کے متعلق کر رہا ہوں یہی دعویٰ دعویٰ نبوت ہے یہی دعویٰ دعویٰ وحی ہے۔ کیونکہ قرآن کی رو سے تو غیر از نبی کی طرف وحی نہیں ہوتی اور وحی کے بغیر یہ علمِ غیب حاصل نہیں ہوسکتا' سیدھی سی بات ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تو پوچھو نہیں کس کس کو پیش گوئیاں ہوتی ہیں! حضرت صاحب نے فرما دیا تھا بالکل ٹھیک آ گیا صاحب یہ۔ کوئی نہیں سوچتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں' یہ قرآن کو ماننے والے۔

قیاس کو علم و یقین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا

باقی رہا یہ کہ یہ عام طور پہ وہ یورپ میں بھی اور امریکہ میں بھی کئی ہیں وہ سال سے پہلے پیشین گوئیاں کیا کرتے ہیں۔ یہ ہوگا' وہ ہوگا وہ خود یہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا قیاس ہے' اندازہ ہے' آنے والے واقعات کے اوپر نگاہ رکھ کے ہم اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ یوں ہوگا۔ اور یہ اندازِ بصیرت کے مطابق' فراست کے مطابق' یہ ظن ہے' یہ قیاس ہے' یہ علم نہیں ہے' یہ یقین نہیں ہے' یہ حتمی طور پہ نہیں کہا جا سکتا۔ کسی صاحبِ اختیار کے متعلق آپ حتمی طور پہ کہہ نہیں سکتے کہ وہ اپنے اختیار کا استعمال کس طرح سے کرے گا۔ یہ صرف خدا جانتا ہے کہ جس کے علم میں ماضی اور حال اور مستقبل کا کوئی فرق نہیں ہوگا۔ وہ تو اقبالؒ کے فلسفیانہ الفاظ میں خدا کا علم تو ہر آن میں NOW ہوتا ہے اس میں ماضی اور حال اور مستقبل کے فرق نہیں ہوتے' وہ تو انسانوں کی دنیا میں ہی ہوتے ہیں۔

رسول کو بھی غیب کا علم خدا کی طرف سے ہی ملتا ہے۔ غیب کا علم جاننے کے لیے وحی کے علاوہ کوئی حتمی ذریعۂ علم انسان کے پاس نہیں

تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیز انسانوں کی دنیا کے متعلق یہ کہنا کہ یہ یوں ہوگا' اس کی یہ کیفیت ہوگی' اس پہ یہ کچھ گذرے گا یہ غیب ہے۔ غیب کے متعلق قرآن کی تصریح ہے کہ یہ صرف خدا کو معلوم ہے اور وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا تھا اس کا علم وحی کے ذریعے دیتا تھا یعنی رسول کو بھی از خود علم نہیں ہوتا تھا۔ الفاظ پھر دیکھ لیجئے ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡہِ اِلَیۡکَ (12:102) یہ تو ماضی کے متعلق کہا گیا ہے کہ جس کے متعلق کچھ نہ کچھ تو ذرائع علم ہو سکتے ہیں لیکن کہا کہ یہ تم جو DEFINITELY ماضی کے متعلق بات بتا رہے ہو جس کا اور کوئی ذریعہ علم نہیں ہے' یہ صرف وحی کے ذریعے تمہیں بتایا گیا ہے تم نہیں اس کے متعلق جانتے تھے۔ اور مستقبل کے متعلق تو کوئی جان ہی نہیں سکتا۔ اس کے متعلق تو حتمی طور پہ کوئی ذریعۂ علم ہے ہی نہیں انسان کے پاس' اور یہ وہ غیب ہے جسے وحی کے ذریعے سے خدا صرف اپنے رسولوں کو بتاتا تھا' وہ بھی جتنا وہ چاہتا تھا۔ اب تو وحی کا سلسلہ ختم ہوگیا' نبوت ختم ہوگئی تو جو بات وحی کے ذریعے آنی تھی' وہ بات تو ختم ہوگئی۔ اب پیشین گوئی کرنے والے سے کوئی یہ پوچھتا نہیں ہے کہ صاحب! قرآنِ کریم تو یہ کہہ رہا ہے آپ کس بنا پہ یہ کہہ

رہے ہیں! وہ تو صرف رسولوں کے لئے اور وہ وحی کے ذریعے سے۔ DEFINITE چیزیں ہیں مصیبت یہ ہے کہ وہ ہم نے تو کبھی قرآن کو دیکھا ہی نہیں کہ یہ کیا کہتا ہے' مانتے چلے جاتے ہیں ساری دنیا کی باتیں۔ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡہِ اِلَیۡکَ (12:102) یہ بڑی اہم چیز ہے یہیں سے ہی نبوت کا پتہ چلتا ہے' یہاں سے رسالت کا معلوم ہوتا ہے' یہاں سے یہ دعاوی جو ہیں ان کی پرکھ ہوتی ہے۔یا وہ دعویٰ نبوت کرتا ہے کہ میری طرف خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے جو مجھے غیب کا علم ہے اور اگر یہ چیز نہیں ہے تو پھر وہ مفتری ہے' غلط کہتا ہے' جھوٹ کہتا ہے' قرآن کے خلاف کہتا ہے' خدا کو چیلنج دیتا ہے۔

رسولوں کے بعد آج علم غیب کا دعویٰ کرنا دراصل خدا کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے

قرآن حکیم کہتا ہے کہ ہم صرف اپنے رسولوں کو وحی کے ذریعے سے غیب کا علم دیتے تھے۔اگر ایک شخص کہتا ہے کہ نہ میں رسول ہوں' نہ مجھ پہ وحی آتی ہے' غیب کا علم مجھے معلوم ہے تو خدا کے اس دعوے کو وہ چیلنج کرتا ہے۔قرآن کو نہ ماننے والوں کے متعلق تو ہم یہ بات نہیں کریں گے ان کو یہ اجازت ہے جو جی میں آئے کہیں' قرآن کو مانتے ہی نہیں ہیں لیکن ایک شخص جو قرآن کو مانتا ہے اس کے بعد یہ چیز کہنی بڑی جسارت ہے' بڑی جرأت ہے۔

حضرت یوسف کے متعلق یہ تمام واقعات وحی کے ذریعے ہی بیان کیے گئے تھے

ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡہِ اِلَیۡکَ ۚ وَ مَا کُنۡتَ لَدَیۡہِمۡ اِذۡ اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَہُمۡ وَ ہُمۡ یَمۡکُرُوۡنَ (12:102) تم ان کے پاس نہیں کھڑے تھے جب وہ یوسفؑ کے بھائی یوسفؑ کے خلاف سازشیں کر رہے تھے ہم نے تمہیں یہ وحی کے ذریعے سے بتایا ہے۔اب یہ چیزیں بتائیں وحی کے ذریعے سے' یہ باتیں ایسی تھیں کہ جس کے بعد واقعی دوسروں کو ایمان لے آنا چاہئے تھا۔کہا وَ مَاۤ اَکۡثَرُ النَّاسِ وَ لَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِیۡنَ (12:102) لیکن اس کے باوجود تم دیکھو گے بیشتر لوگ' اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔یہاں ہے وَ لَوۡ حَرَصۡتَ عام معنی تو یہی ہونگے یہ حرص کا لفظ ہے' تو میں نے عرض کیا ہے کہ دوسری زبان میں آ کے یہ الفاظ اپنے اور یجنل معنی کھو دیتے ہیں اور کتنے دوسرے غلط معنی آتے ہیں۔

لفظ حرص کا لغوی قرآنی مفہوم کسی کی منفعت کے لیے' شدتِ آرزو کے ہیں

حرص ہمارے ہاں ہمیشہ برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے حرص و ہوس' بڑا حریص ہے۔اور یہ چیز تو نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ (9:128) اور حضور ﷺ کی بہت بڑی خصوصیت بتائی ہے۔مؤمنین کے متعلق کہا ہے کہ کتنا بڑا یہ احسان ہے کہ اس قسم کا ایک نبی تمہارے ہاں پیدا ہوا' تمہارا ساتھی اس قسم کا' حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ (9:128)۔حرص کے بنیادی معنی شدتِ آرزو کے ہوتے ہیں

اور یہ آرزو اچھی بھی ہوسکتی ہے بری بھی ہوسکتی ہے۔لہٰذا صرف مجرد لفظِ حرص جو ہے یہ نہیں کہ یہ برائی کے معنوں میں ہی آتا ہے بلکہ شدتِ آرزو اگر اچھی چیز کے لئے ہے تو یہ تو بہت بڑی خصوصیت ہوگئی۔اور عربی زبان میں تو جب وہ علیٰ اس کے بعد آتا ہے تو اس کے معنی ہمیشہ منفعت کے لئے ہوتا ہے کسی کی منفعت کے لئے شدتِ آرزو۔ یہاں بھی یہ کہا ہے کہ **و لو حرصت** تمہیں کتنی ہی شدید آرزو کیوں نہ ہو کہ یہ کسی طرح ایمان لے آئیں اور یہ باتیں بھی ان کے سامنے آجائیں کہ اس قسم کی چیزیں جو آج انسانی علم کے ذریعے سے نہیں کہی جاسکتی تھیں یہ وہ باتیں بھی بتا رہا ہے' کہا اس کے باوجود تم دیکھو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ بھی ایک بڑی عجیب چیز ہے۔رسول کا ایک فریضہ جیسا میں نے عرض کیا تھا نبوت ہے خدا سے وحی پانا' رسالت ہے اس وحی کو آگے لوگوں تک پہنچانا' پہنچانا اس غرض سے کہ لوگ سیدھے راستے پہ آجائیں' غلط راستے کو چھوڑ دیں۔

فریضہ نبوت دوسروں کو حقائق سے آگاہ کرنا ہے زبردستی کسی کو اس پر چلانا نہیں ہے

اب سوال یہ ہے کہ کیا رسول کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ بالضرور ہدایت کو اختیار کرلیں۔کسی شخص کو یہ بتا دینا کہ بھئی! یہ راستہ سیدھا شہر کو جاتا ہے۔ یہ تو ہے اس کو راستہ بتا دینا یہ ہدایت ہے اب یہ چیز کہ اس کو راستے پر چلا دینا ضرور کہ وہ اس کے اوپر چل پڑے' یہ چیز نہ فریضۂ رسالت ہے نہ کسی اور شخص کی ذمہ داری ہے۔ یہی تو دین میں اکراہ ہے۔دین میں رسول کا فریضہ بھی راستہ بتا دینا ہے۔وہ ہادی ہوسکتا ہے۔راستے پہ لگا دینا جو ہے اس راستے کے اوپر چلا دینا ہے وہ کہا **لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ** (88:22) ہم نے تمہیں ان پر داروغہ بنا کے نہیں بھیجا ہے کہ ڈنڈا تمہارے ہاتھ میں ہے اور جناب ضرور اس راستے پہ لگانا ہی ہے۔رسولوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔

ہمارے ہاں چار لفظ پڑھ لینے والوں کی حالت کفر کا فتویٰ اور پھر قتلِ مرتد کی سزا

یہ جو چار لفظ پکی روٹی کے پڑھ لیتا ہے اس کے بعد وہ اپنے آپ کو داروغہ ایسا سمجھتا ہے کہ لٹھ ہاتھ میں لئے ہوئے ہے' چلا ہوا ہے ہر شخص کے پیچھے ''تم یہ کیوں نہیں کرتے' تم وہ کیوں نہیں کرتے' وہ یہ کیوں نہیں مانتے' تم وہ کیوں نہیں مانتے''۔اور جونہی کسی نے کوئی ایسی بات کہی کہ جو اس کے کسی عقیدے کے خلاف ہے' جھٹ سے کفر کا فتویٰ اس کے اوپر عائد۔اور کفر کا فتویٰ یہ بات کوئی یونہی نہیں ہے کہ مذاق ہے' وہ تو غنیمت ہے کہ اختیار اتنا ہی ہے فتویٰ لگانے کا' ورنہ اس کا اگلا فطری نتیجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ جس مسلمان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے' وہ مرتد ہوجاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہوتی ہے۔کڑیاں ملایئے ان کے کسی عقیدے کے خلاف آپ عقیدہ رکھئے' نظریہ رکھئے' کوئی خیال رکھئے' تو وہ کفر ہوگیا اور چونکہ آپ مسلمان ہیں یعنی کافر تو کافر رہے' ہزار بار کافر ہو' اس کے خلاف کچھ نہیں ہے' اس نے جو ان کے عقیدے کے خلاف کوئی بات کی تو یہ کفر کا فتویٰ لگا اس سے ہوگیا مرتد' مرتد کی سزا قتل ہے۔آپ کو کیا معلوم ہے کہ آپ کی

تاریخ میں تاریخ کے کتنے اوراق آپ کے ان خون کے چھینٹوں سے رنگین ہیں جو اس بنا پر بہائے گئے مسلمانوں کی جماعت در جماعت کے' افراد کے نہیں گروہوں کی تعداد سے' ایک عقیدے کے اختلاف کے اوپر بغداد کی ندیاں خون سے سرخ ہو جاتی تھیں۔ یہ نہیں کہ معیار اس کے متعلق کہیں کوئی کتاب اللہ ہے یا یہ ہے کہ صاحب! قرآن کے خلاف ہے' جی نہیں صاحب! ان کے عقیدے کے خلاف ہے۔ قرآن رسول اللہ ﷺ سے کہہ رہا ہے سنئے کیا کہہ رہا ہے؟ کہا یہ کہ تجھے ہم نے یہ صحیح راستہ بتا دیا' تیرا فریضہ یہ ہے کہ اس راستے کو عام کرتا جا' دوسروں کو بھی بتا دے کہ یہ راستہ ادھر کو جاتا ہے۔

اسلام قبول کرنے کے سلسلہ میں خاندان نبوت کا ذکر

اب اس کے بعد کہ وہ بالضرور اسی راستے کے اوپر چلیں۔ اِنَّکَ لَا تَھۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ (28:56) یہاں مَنۡ اَحۡبَبۡتَ (28:56) ہے کہ تمہیں کسی سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو' یہ ہو نہیں سکتا کہ تو بالضرور اسے اس راستے کے اوپر چلا دے۔ یہاں ہے لَوۡ حَرَصۡتَ (12:103) کتنی ہی شدتِ آرزو کیوں نہ تیرے اندر ہو کہ اے کاش! یہ تباہی سے بچ جائے صحیح راستے پہ چلے۔ یہاں یہ ہے کہ وہ تیرا کتنا ہی محبوب کیوں نہ ہو' کتنی ہی محبت تجھے اس سے کیوں نہ ہو۔ اور اگر اعزہ کی محبت سامنے آ جائے تو نبی اکرم ﷺ کے عزیز ترین رشتے دار جو تھے' والد تو پہلے ہی فوت ہو چکے ہوئے تھے ان کے بعد چچا ہی آتے ہیں اور چچا تو یہ ابولہب جیسے تھے' بھائی بھی کوئی نہیں تھا بہر حال وہ چچا اور ان کے بیٹے ہی بھائی ہو سکتے ہیں' ان کے بیٹوں کی کیفیت یہ تھی کہ سب سے زیادہ دشمن۔ یہ حضرتِ عباسؓ وہ بھی بعد میں جا کے مسلمان ہوئے' اپنا داماد وہ بھی بعد میں جا کے مسلمان ہوا' ایک عرصے تک وہ سب کے سب اسی طرح سے کافر کے کافر رہے سخت دشمنیاں کرتے تھے۔ اب ان سے زیادہ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ (28:56) میں کون اور آئے گا۔ لہٰذا صرف یہ بات کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے رشتہ دار تھے' رسول اللہ ﷺ کو ان سے بڑی محبت بھی تھی' ہونی چاہئے لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ تجھ پر یہ فریضہ نہیں عائد ہوتا نہ ہی یہ تیرے بس کی بات ہے کہ کتنے ہی محبوب کیوں نہ ہوں' کتنی ہی شدتِ آرزو تیرے دل میں کیوں نہ ہو کہ تو ضرور ان کو رستے پر لگا کے ہی رہے' یہ بات نہیں۔ یہ تو خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہے وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ ھُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُھۡتَدِیۡنَ (28:56) خدا کے قانون کے مطابق کفر اور اسلام کی بات ہے' ایمان اختیار کیا جاتا ہے اس کے قانون کے مطابق۔

ایمان لانے کے لیے عقل وفکر کو بروئے کار لانا ضروری ہے

سورۃ یونس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے' وہ ایمان پہ نہیں آ سکتے' یہ ہے قانونِ خداوندی۔ اور رسول کا کوئی کتنا ہی محبوب کیوں نہ ہو اور رسول کتنی ہی شدتِ آرزو کسی کے متعلق کیوں نہ رکھے کہ وہ ضرور صحیح راستے پہ چل پڑے اختیار کر لے' اگر وہ

غور وفکر سے خالی الذہن ہو کر ان چیزوں پہ غور نہیں کر رہا' تو قرآن کہتا ہے اس قانون کے مطابق ممکن ہی نہیں کہ وہ ایمان اختیار کرے اور تجھے ہم نے داروغہ نہیں بنایا کہ تو ان کے پیچھے لٹھ لے کے چلتا پھرے کہ چلتے ہو کہ نہیں چلتے۔ یہ ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ(2:256)۔ عزیزانِ من! ایمان کے تو معنی ہی یہ ہے کہ وہ دل اور دماغ کی کامل رضامندی کے ساتھ کسی صداقت کو صحیح قبول کرنا ہے' جبر سے تو قبول ہی نہیں کیا جا سکتا صداقت کو۔ کہا یہ کہ یہ باتیں دکھا کے' بتا کے بھی ان کو کہ جو نظر آتا ہے کہ ان کے علم میں بھی نہیں تھیں وہ جانتے ہیں کہ تیرے علم میں بھی نہیں تھیں' رسول اللہ ﷺ تو اس سے پیشتر اَن پڑھ تھے اس مکے کی زندگی میں' کہاں سے یہ علم حاصل کرنا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہا کہ خواہ کتنی ہی شدتِ آرزو کیوں نہ ہو' اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اور اگلی بات یہ اور کہی کہا کہ یہ عجیب چیز ہے ان کی بہتری کے لئے تو سب کچھ کرتا ہے' جان کھپا رہا ہے اور وہاں ہی یہ کہا' خدا کہتا ہے رسول سے کہ ہمیں تو یہ خطرہ نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے' یہ تباہیوں سے کیوں نہیں بچتے(26:3)۔ یہ طبیب اس قدر مشفق ہے کہ مریض کی بد پرہیزی پر' یا علاج سے انکار پر اپنی جان گھلا رہا ہے کہ یہ مریض کیوں نہیں یہ بات مانتا۔ ماں ہی کی محبت ایسی ہو سکتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے ماننے والوں کے لیے قوم کی بجائے امت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے آخر کیوں؟

بات میں سے بات ہے صاحب! اسی لئے ہی حضور ﷺ کی جو پیدا کردہ ایک قوم تھی' قوم نہیں اسے امت کہا گیا ہے امت تو ''ام'' سے نکلی ہے' رسول ﷺ کے ساتھ ماں کا رشتہ تھا۔ میں اعتراض نہیں کرتا' باپ تو یوں ہی کہتا ہے ان کے ہاں' باپ کا وہ رشتہ نہیں ہوتا جو ماں کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ بات کہ بچے کی بیماری کے غم میں جان گھلا لے' بالعموم' میں استثنا کو چھوڑ دیتا ہوں کہ یہ نہیں ہے کہ باپ ایسا نہیں کرتے' وہ اس کے اندر ایک نفسیاتی چیز ہے' ماں اس چیز کو کرتی ہے کہ اپنی جان گھلا لیتی ہے۔ باپ کی تو عام طور پہ کیفیت یہ ہے کہ وہ تو رات رات بھر جاگتی ہے اس بچے کے لئے ہلکان ہو رہی ہوتی ہے' سردیوں کی راتوں میں وہ جہاں کہیں پیشاب کرتا ہے' بستر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اُدھر آپ سو جاتی ہے' بچے کو گرم جگہ پہ سلاتی ہے۔ لیکن اگر درد کے مارے وہ بیچارا رات کو تھوڑا سا رویا تو تیسرے کمرے سے صاحب بہادر کی آواز آیا کرتی ہے سونے بھی دے گی یا نہیں' لے جاؤ اس کو کہیں جھنجنے کو۔

کسی کے مخلص ہونے کی دلیل کہ اس میں اپنا لالچ یا مفاد پوشیدہ نہ ہو

بہرحال! لَوْ حَرَصْتَ سے میری بات چلی تھی۔ کتنا مشفق ہے یہ طبیب۔ کہا اگلی بات یہ وَ مَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (12:104) اتنی سی بات نہیں ان کی سمجھ میں آتی کہ طبیب ہے' مشفق ہے' تمہاری شفا کے لئے حریص ہے' آتا ہے سب کچھ دیکھتا ہے' دوائی بھی خود دیتا ہے پر اس کے لئے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ بات بھی کسی کی صداقت کے پرکھنے کی بڑی چیز ہوتی ہے۔ پھر اس کا

اپنا اس میں کوئی لالچ نہ ہو' کوئی اپنا مفاد اس کے اندر پوشیدہ نہ ہو۔ یہ جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ وہ انسان تو جھوٹ بھی نہیں بولتا اگر اس کا اپنا فائدہ نہ ہو' وہ جو روز ہم کہا کرتے ہیں جو کہتا ہے''اوئے جھوٹ بولیا؟ او کہندا اے مینوں کی لوہڑ پئی ہوئی سی جھوٹ بولن دی یعنی لوہڑ پیندی اے تے جھوٹ بول دیندا اے' سیدھی جئی گل اے''۔اس میں ایک چیز ہے یہ عدالتوں میں بھی اچھے اچھے مقدمے یہ بڑے بڑے سنگین مقدمے جن میں یقینی شہادات نہیں ملتیں تو ان میں ایک چیز وہ مفاد کیا تھا اس کا جو اس نے اس کو قتل کیا ہے' اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ اس میں اس کا فلاں مفاد پوشیدہ تھا تو بات آگے چل پڑتی ہے۔اگر یہ صفائی والا DEFINITELY ثابت کر دے کہ اس میں اس کا کوئی بھی مفاد نہیں تھا' نوے فیصد مقدمہ اسی پہ گر جاتا ہے۔

خدا کی طرف سے ہر آنے والا رسول یا نبی نہ تو ذاتی لالچ کا متمنی ہوتا ہے اور نہ ہی ناامیدی کا شکار

یہ بڑی چیز ہوتی ہے''اس میں اس کا اپنا فائدہ'' اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ جتنے انبیائے کرامؑ کے قصے قرآن نے بیان کئے ہیں وہ بات ہی یہاں سے شروع کرتا تھا۔سورۃ ہود ہم دیکھ چکے ہیں وہ آکے یہ کہتا تھا کہ میں تو یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ لا الہ الا اللہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار ہستی نہیں لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (11:51) دوسرا فقرہ اس کے ساتھ یہ ہوتا تھا''اور میں اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا''۔خیر خواہ ہوتا ہی یہ ہے جس کا اپنا کوئی معاوضہ اس کے عوض میں نہ ہو۔وَ مَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (12:104) نہیں مانگتا۔اب یہ صورت ہوئی کہ اس قسم کی غیب کی خبروں پر مبنی یہ باتیں بھی سنائی ان کو' پھر بھی نہیں' حریص بھی تو اتنا ہے شدتِ آرزو بھی ہے کہ یہ صداقت کو مان لیں تباہی سے بچ جائیں اس کے باوجود بھی نہیں بچتے' تم اس کا اجر بھی نہیں مانگتے۔اب حضورﷺ کو یہ تسکین دی جا رہی ہے کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے اس لئے کہ یہ یہی نہیں ہے کہ یہی جو تمہاری مخاطب قوم ہیں یہ اسی کے لئے قرآن ہے' انہوں نے اگر یہ نہ مانا تو یہ تو ختم ہوا سلسلہ' دعوت بے کار گئی' اس کا کوئی مقصد نہ رہا' یہ بڑی ناکامی ہے' کہا کہ نہیں! سوال یہ نہیں ہے۔

خدا کا پیغام ذکر للعالمین کی صفات کا حامل ہوتا ہے نہ کہ کسی خاص قوم یا خاص دور کے لیے بلکہ یہ تو للناس کے لیے ہے

کس طرح کڑی سے کڑیاں ملتی چلی جا رہی ہیں۔کوئی بات گھبرانے کی نہیں ہے اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (12:104) یہ صرف اسی قوم کے لئے نہیں ہے یہ تو تمام اقوامِ عالم کے لئے ہے۔یہ نہیں مانتے' نہ مانیں اور قوم جو اس پہ غور و فکر کرے گی' وہ مان لے گی۔ اور جب تم نے کوئی اجر' کوئی معاوضہ ہی نہیں لینا ہے تو تمہاری یہ تو بات نہیں تھی کہ یہی مان لیں' یہ مان لیں گے تو ان سے کچھ ملے گا

اگر یہ نہ مانے اور میں نہ رہا' کسی دوسری قوم نے اس کو مان لیا تو مجھے کیا ملے گا۔تم نے تو کچھ لینا نہیں ہے تم تو انسانیت کی خاطر یہ چاہتے ہو کہ وہ بچ جائیں۔ٹھیک ہے جو سب سے پہلے تمہارے قریب ہیں' ان کا حق ہے کہ تم پہلے ان کو بچاؤ' یہ نہیں مانتے تو نہ مانیں' ذکر للعالمین ہے آج بھی' پوری باقی اقوامِ عالم کے لئے بھی ہے اور قیامت تک کے لئے یہ تو تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے۔جو بھی اس کو اس طریق سے مان لیں گے اس سے فائدہ اٹھائیں گے اس وقت' تیرا مقصد پورا ہو جائے گا کیونکہ قرآن نے اس کو للناس کہا ہے کسی خاص قوم کے لئے نہیں' کسی خاص ملک کے لئے نہیں' کسی خاص زمانے کے لئے نہیں' تمام نوعِ انسانی کے لئے' تمام زمانوں کے لئے۔تو جب اور جہاں بھی کوئی قوم اس کو مان لے گی' وہ مقصد پورا ہو جائے گا۔وہ جو رسولِ حریص کا تھا کہ انسان تباہی سے بچ جائیں کسی دور کے انسان بچ جائیں۔بات تو وہ اپنے قریبی حلقے سے شروع کرتا ہے۔اسی طرح سے شروع کرنی چاہئے لیکن یہ نہیں ہے کہ وہاں اگر یہ آواز نتیجہ خیز نہیں ہوتی تو وہ سمجھ لے مایوس ہو کے بیٹھ جائے کہ صاحب! میں تو بڑا ہی ناکام رہا کچھ بھی نہ بنا' یہ سوال نہیں ہے۔نوعِ انسانی کے لئے فائدے کے لئے جو چیزیں ہیں' وہ زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہوتی ہیں۔طب کی دنیا کے اندر' MEDICINE کی دنیا کے اندر' طبعی دنیا کے اندر بھی ٹھیک ہے۔جالینوس نے جو نسخہ دیا تھا ہو سکتا ہے کہ اس کے زمانے کے لوگوں نے اس کو اپنایا ہی نہ ہو' استعمال ہی نہ کیا ہو اس کو پھینک دیا ہو۔لیکن دو ہزار سال سے وہ انسانوں کے لئے نافع ثابت ہو رہی ہے۔تو اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کے لئے یہ نفع بخش ہو تو وہ تو حاصل ہو گیا مدعا مل گیا۔اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (12:104)۔اب آگے بات اور اہم آتی ہے۔

قرآن حکیم انسان کی توجہ اس محسوس کائنات کے محیر العقول سلسلہ کے نظم و ضبط کی طرف دلاتا ہے

کہا یہ جو کچھ تم ان سے کہتے ہو یہ تو نظری بحثیں ہیں THEORATICAL سی ہیں کیفیت تو ان کی یہ ہے وَ كَاَيِّنۡ مِّنۡ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ يَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهَا وَ هُمۡ عَنۡهَا مُعۡرِضُوۡنَ (12:105) یہ محسوس کائنات کے اندر کے یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں جہاں قدم قدم پر ہماری نشانیاں ابھری ہوئی ان کے سامنے آ رہی ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان سے بھی یہ پہلو تہی کرتے ہوئے' اعراض برتتے ہوئے' گذر جاتے ہیں کہ جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس محسوس دنیا میں بھی اپنے حواس سے کام نہیں لیتے' نہ آنکھوں سے' نہ کانوں سے' نہ سمجھنے سے' نہ سوچنے سے۔محسوس کائنات میں جو اس طرح سے ان چیزوں سے کام نہیں لیتے' وہ اس غیر محسوس دنیا کے اندر عقل و فکر سے کام لے کے اس طرح کسی نتیجے پہ پہنچیں گے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ ان کی تو کیفیت یہ ہے۔بڑی اہم چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ صاحب! یہاں تو تعلیمِ قرآنی کا ذکر تھا جو انسانوں کے اخلاقیات کے متعلق تھی' ان کی بہبود سے' انسانی ذات کی اصلاح سے متعلق تھی' یہ باہر کی دنیا کے متعلق درمیان میں کیا بات آ گئی۔

خدا تعالیٰ نے کائنات کے ذرے ذرے کے لیے کائناتی قوانین بنا رکھے ہیں (یعنی ان کی طرف وحی کر رکھی ہے)

عزیزانِ من! قرآن کا تو مسلک' مؤقف یہ ہے وہ تو خارجی دنیا میں بھی بتاتا ہے کہ اسی خدا کے قوانین نافذ اور رائج ہیں جس خدا نے انسانی دنیا کے لئے وحی کے ذریعے سے یہ ضابطۂ قوانین دیا ہے۔ یہ LAWS OF NATURE جنہیں ہم قوانینِ فطرت کہتے ہیں یہ خدا ہی کے قوانین ہیں اور اس نے یہ کہا ہے کہ ہم نے ان اشیاء کی طرف یہ وحی کی ہوئی ہے۔ اور فرق اتنا ہے کہ ان کی طرف جو وحی کی' انہیں اس کا اختیار نہیں کہ اس وحی سے سرتابی برتیں وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ (3:113)۔ اس نے یہ کہا ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں جتنی بھی ہیں وہ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيحَهٗ (24:41) اپنی تسبیح بھی جانتی ہیں اپنی صلوٰۃ کو بھی جانتی ہیں۔ تم میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ وہ جاننے کے بعد اس کی خلاف ورزی کر نہیں سکتیں' تمہیں ہم نے علم دینے کے بعد یہ کہہ دیا کہ جی چاہے تو سنکھیا پھانک لو جی' چاہے تو مصری کی ڈلی کھا لو۔ تو کائنات پہ قرآنِ کریم بڑا زور دیتا ہے اور کائنات کا صحیح مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے' جس قسم کا خدا پر ایمان ان لوگوں کا ہے' ہم لوگ جو محض نظری باتوں میں الجھے رہتے ہیں' اس قسم کا علیٰ وجہ البصیرت جسے کہتے ہیں' علی رؤس الاشہاد جسے کہتے ہیں اس قسم کا ایمان تو ہمیں بھی حاصل نہیں ہوتا۔

کائنات کی اکائی پر غور و فکر کرنے والوں سے ایک سوال اور اس کا جواب

یہ جو خارجی کائنات میں ریسرچ کرنے والے سائنٹسٹ ہیں کبھی ان کی کتابیں پڑھ کے دیکھئے۔ میں کبھی کبھی ذکر کیا کرتا ہوں میں نے ''انسان نے کیا سوچا'' جو کتاب لکھی ہے اس میں بہت سے حوالے دئے ہیں اس کتاب "THE GREAT DESIGN" کے بڑی اچھی کتاب ہے' اس میں اس کے ایڈیٹر نے کیا ہی یہ کہ جو اس قدر اس وقت مختلف علوم اور سائنس کے شعبے ہیں (وہ حال کی کتاب ہے ہمارے ہاں) اس کے جو بڑے بڑے THINKERS اور ریسرچ سکالرز اور سائنٹسٹ اور اس علوم کے آئمہ ہیں اس نے ان کی طرف ایک سوال صرف بھیجا کہ مجھے آپ یہ بتا دیجئے کہ آپ کی مدتوں عمر کی فکر اور ریسرچ کے بعد آپ کس نتیجے پہ پہنچے ہیں! کیا اس نتیجے پہ کہ یہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے' یونہی اتفاقیہ ہی ہو رہا ہے یا یہ کسی خاص نظم وضبط کے تابع ہو رہا ہے اور اس کے پیچھے کوئی اتھارٹی ہے جو اس نظم ونسق پہ کنٹرول رکھے ہوئے ہے' اس سوال کا جواب دیجئے۔ اور اس نے اس میں ان کے جوابات اسی طرح سے رکھ دئے ہیں۔ وہ میں نے جیسا کہا ہے اپنے علوم کے امام' آئن سٹائن جیسے بھی لوگ اس میں موجود ہیں' جیمز جینز بھی ہے جو علم الافلاک کا ماہر ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو ہماری آپ کی اصطلاح کے مطابق خدا کو بھی نہیں مانتے اور ان میں سے ہر شخص

اس نتیجے پہ پہنچا ہے کہ یہاں کوئی چیز اتفاقی نہیں ہو رہی، ہر چیز ایک نظم وضبط کے ماتحت ہو رہی ہے اور نظم وضبط قائم نہیں رہ سکتا تاوقتیکہ اسے قائم رکھنے والی کوئی قوت نہ ہو۔

علم الافلاک کے ماہر جیمز جینز کا کائنات کے متعلق بیان

جب میں نے کہا ہے کہ ہر سائنٹسٹ نے یہ کہا ہے تو علم الافلاک کے ماہر جیمز جینز نے بھی یہ کہا ہے اگرچہ اس نے یہ چیز کہی ہے، وہ تو اس کا اپنا شعبہ ہے اپنا فن ہے یہ علم الافلاک جو ہے وہ تو MATHEMMTICS پہ چلتی ہے، حساب پہ چلتی ہے۔ یہ نیویارک میں بیٹھے ہوئے کمرے کے اندر حساب کرتے ہیں جس سے وہ کنٹرول کر رہے ہوتے ہیں چاند کے اوپر جو گاڑی جا رہی ہوتی ہے اس کو، صرف حساب سے۔ تو اس نے یہ چیز کہی جو اس دور کا سب سے بڑا علم الافلاک کا ماہر ہے اس کا کہنا ہے کہ میں یہ تو جانتا نہیں کہ پادری جسے خدا کہتے ہیں، وہ کون ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ GREATEST MATHEMATICIAN IN THE UNIVERSE (کائنات کا سب سے بڑا ریاضی کا ماہر) وہ کوئی ہے جو اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ تم یہی کہہ لو۔ وہ یہ کہہ رہا ہے۔

ایک ایک پتے کی رگ میں جو Naked Eye سے اوجھل ہیں، دنیائیں اس کے اندر رقصاں ہیں

وہ ایک باٹنی والا ہے اس نے ایک پتے کے اوپر مضمون لکھا ہے۔ عزیزانِ من! کیا بات ہے اس پہ ریسرچ اس نے کی ہوئی ہے۔ اس پتے کے متعلق جو وہ لکھ رہا ہے اس میں وہ بتا رہا ہے کہ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اس کی ایک ایک رگ میں جو NAKED EYE سے تمہیں نظر بھی نہیں آتی، کتنی دنیائیں رقصاں مجھے نظر آتی ہیں اور ان میں سے ہر رقص ایک قاعدے کے مطابق ہو رہا ہے۔

مذہب کی دنیا کے بعد اہل تصوف کے ہاں کائنات کے متعلق پایا جانے والا تصور

عزیزانِ من! قرآن نے اسی لئے زیادہ زور کائنات کے شواہد پہ غور کرنے پہ دیا ہے۔ مذہب کی دنیا اور پھر جو آگے ہم چلے تصوف کی دنیا، یہ ساری کائنات نہایت ذلیل، نہایت پلید، اس کے قریب مت جاؤ، چھوؤ نہیں۔ مادے کا تو لفظ ہی آپ کے ہاں ایسا آ گیا کہ کتنا بڑا کفر یعنی مادہ پرستی اور کفر ہمارے ہاں ایک ہی معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ مادہ پرستی کیا ہے؟ پرستش تو کوئی بھی نہیں کرتا مادے کی۔

ہمارے ہاں تسخیر کائنات کو مادہ پرستی اور سرسید کو نیچری کہہ کر کافر کہنے کی کوشش

قرآن نے کہا تھا کہ آدم کو ہم نے فطرت کی تمام اشیا کا علم دے دیا تھا اور پھر کہا تھا کہ **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا** (45:13) کائنات کی ہر شے آدم کے تابع تسخیر کر دی تھی۔ وہ انہی قوانین کے علم کی رو سے تسخیر کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں اس کا نام مادہ پرستی رکھا چل بھئی! الحاد ہو گیا۔ اور اس سے بھی آگے چل کے صاحب! آپ کو پتہ ہے کہ سرسیدؒ پہ جو کفر کا فتویٰ لگا تھا

تو اس فتوے کی بنیاد کیا تھی؟ سرسیدؒ کے متعلق کہا جاتا تھا یہ نیچری ہے۔ وہ نیچری تو اب یوں ہمارے ہاں نظر آتا ہے جیسے یہ کوئی فرقہ ہوتا ہے مذہب کا۔ بریلوی اور دیوبندی اور سہروردی جیسے ہوتے ہیں' اسی میں ایسا نظر آتا ہے کہ کوئی نیچری بھی یوں تھا۔ وہ نیچری بیچارہ یہ تھا کہ وہ کہتا یہ تھا کہ بابا! نیچر کے اوپر بھی تو غور کرو کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ یہ اس نے کہیں لفظ استعمال کر دیا۔ اب ان سے یہ چیز کہنا نیچر پہ غور کیجئے' اس سے کفر کا فتویٰ لگا۔ یہاں کا فتویٰ کنبہ تو کچھ کمزور سا ہے۔ یہ الحاد تو بہت بڑے درجے کا الحاد ہے' مکے سے جا کے فتویٰ لائے کہ جی! یہ شخص نیچری ہے۔ اور اس کے بعد جس کسی کے پیچھے پھر یہ گلی محلے کے لونڈے لگانے ہوئے ڈگڈگی دے کے' اس کے متعلق اتنا کہتے تھے نیچری ہے یعنی نیچر کے اسرار و رموز جو ہیں ان کو معلوم کرنے کی تحقیق کر رہا ہے۔ یہاں تک ہمارے ہاں یہ بات پہنچائی گئی۔

قرآن حکیم تو نیچر پر ہر ہر قدم پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم آپ دیکھئے گا آدھا قرآن نیچر سے بھرا ہوا ہے اور وہ ان پہ غور کرنے والوں کو (دو چار آیتیں میں عرض کروں گا ورنہ میں یہ تو موضوع الگ ہے' کتنے درس اس کے اوپر آ سکتے ہیں اور آئے بھی ہیں) اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ(3:190) کائنات کی تخلیق میں اور لیل و نہار کی گردش میں' صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ آیت کے معنی ہوتا ہے کسی محسوس شے کو دیکھ کے کسی نتیجے پر پہنچانا۔ دھواں اس بات کی آیت ہوتا ہے کہ آدمی دور سے دیکھ کے کہے کہ نیچے آگ جلتی ہے۔ اندھیری رات میں' سنسان جنگل میں دور سے کہیں سے آپ کو اگر دیے کی ٹمٹماہٹ نظر آ جائے تو یہ آیت ہوتی ہے اس بات کی کہ وہاں کوئی انسان ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تخلیقِ ارض و سما اور گردشِ لیل و نہار حقیقت میں آیت ہے اس بات کی کہ یہ جو دیے کی لو نظر آتی ہے' وہاں کوئی انسان ہے۔

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ اصطلاحات کا مفہوم بدل دینے سے قرآن حکیم کی پوری کی پوری تعلیم ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی

کائنات کی اشیاء جو ہیں وہ آیات ہیں' کن کے لئے؟ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ(3:190) صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے۔ وہ کہہ دیا کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے یورپ کے جوہریے ہیں ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہا یعنی ان کے لئے الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ (3:191) ان کے لئے کہ جو اٹھتے بیٹھتے لیٹے ہوئے یذکرون اللہ ذکرِ خداوندی میں مصروف رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا جی! ٹھیک ہے جی! اٹھتے بیٹھتے چلتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ بازار میں چلے جا رہے ہیں تسبیح ہاتھ میں ہے۔ آپ سے باتیں ہو رہی ہیں۔ گالیاں بک رہے ہیں دانے پہ دانہ کھٹا کھٹ چلا جا رہا ہے ''اے کی ہوندا پیا ہیگا اے؟'' کہ جو

وہ قرآن نے کہا ہے چلتے پھرتے بھی ذکرِ خداوندی کیا جارہا ہے۔ میں تو گیا نہیں عرب ممالک والے تو بتاتے ہیں وہاں خاص طور پہ جو عراق میں جو ہے وہ جیسے ہمارے ہاں چھڑی ہاتھ میں لے کے بیٹھ جاتے ہیں' ہر شخص ان میں سے تسبیح لے کے بیٹھ جاتا ہے۔ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (3:191) ۔عزیزانِ من! یہ تو قرآن ہے جسے ذکر کہا گیا ہے نہ بھی یہ چلتے پھرتے ذکر کا ہو تو ذکر اب آپ کو معلوم ہے پہلے تو آپ کو معلوم نہیں ہوا کرتا تھا' وہ وہیں رہتا تھا اب تو یہ لاؤڈ سپیکر کے دور میں آپ کے گھر بیٹھے اس ذکر کی آواز جو ہے وہ آپ کے ہاں آرہا ہوتا ہے اور وہ اتنا تصوف کی یہ اصطلاحیں ہیں' خفی سے جلی اتنا ہو گیا ہے کہ وہ تو بہرحال شب بیدار ہوتے ہی ہیں گھروں میں مریضوں کو سونے نہیں دیتے۔ اس کا نام ذکر آ گیا' یہ ذکر ہو رہا ہے خدا کا۔ قرآن میں آیئے ''وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں'' ذکر کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کو سامنے رکھنا' بات صاف ہو جائے گی۔ اٹھتے بیٹھتے سوچتے گردشِ لیل ونہار' تخلیقِ ارض وسما اس میں جو اللہ کی چیز ہے' وہ اس کے قوانین ہیں' ان کو سامنے رکھتے ہیں یہ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ (3:191) ہوا اور اس کے بعد کہا وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ (3:191) یعنی وہ غور وفکر کرتے ہیں اس تخلیقِ ارض وسما پہ۔ یہ ہوا ذکر اللہ۔ عزیزانِ من! قرآن کی آیتیں ہیں میں اپنی طرف سے تو نہیں کہہ رہا۔ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ (3:191) اور گہرے غور وفکر کے بعد غور وفکر بھی اس طرح کا کہ اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر وقت یہ چیز سامنے رہتی ہے۔ یہ جو ان امور پہ ریسرچ کرنے والے ہیں' ان کی آپ زندگیاں پڑھ کے دیکھئے' ساری ساری زندگی اس ایک نے ایک کیڑے پہ ریسرچ کرنے میں وقف کر دی۔ ہر وقت اس کے سامنے وہ رہتا تھا۔ یہ سارا کچھ غور وفکر کے بعد کہتا ہے کہ پھر وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ (3:191) اے ہمارے نشوونما دینے والے ! میں علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتا ہوں کہ تو نے اس سلسلۂ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا ہوا۔

قرآن حکیم نے اپنے ہاں مومن کی جو بنیادی تعریف متعین کی ہے انسانیت کے لیے وہی ایک آخری سہارا ہے

دیکھتے ہیں ذکرِ خداوندی کا نتیجہ۔ یہ ہے کائنات' ان میں آیات ہیں جہاں یہ کہا ہے کہ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (3:190) صاحبانِ عقل وبصیرت کے لئے۔ دوسری جگہ ہے اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ (45:3) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اندر یہ نشانیاں ہیں حقیقت تک پہنچنے کی۔ نشانیاں ہیں کن کے لئے؟ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (45:3)۔ ابھی اگلا ٹکڑا آیت کا آتا ہے۔ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (45:3) مومن تو انسان کہلا ہی اس سطح پہ جا سکتا ہے کہ جب اس کی یہ کیفیت ہو کہ خارجی کائنات کے اندر کی کھلی ہوئی نشانیاں اس کے سامنے ہوں اور وہ ان نتائج کے اوپر پہنچے۔ ساتھ ہی آیت ہے وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (45:4) وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ

وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ(45:5) زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کی' مختلف سمتوں میں یہ ہوائیں چلائیں ان تمام کے اندر آیات ہیں' کن کے لئے؟ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (45:5)۔تو اب قومِ مومن ایمان لانے والے' قومِ یوقنون یقین رکھنے والے' قوم یعقلون عقل وفکر سے کام لینے والے' یہ سارے ایک ہی کیٹگری کے لوگ ہوئے۔لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (45:5) عقل وفکر سے کام لینے والے۔یہاں ان پہ حکم چلایا جاتا ہے کہ صاحب! شرع میں دو باتیں جو ہیں ان کو تو دخل ہی نہیں ہوتا''شرع اچ اک تے شرم نئیں ہوندی تے'عقل نوں کوئی دخل نئیں ہوندا' بے شرم وی ہونا پیندا اے تے نالے (معاف رکھنا)''۔لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ(45:5) کہا اتنا کچھ۔

قرآن حکیم کی اس قدر واضح اور بیّن آیات کے باوجود انکار کرنے والوں کا کیا علاج

عزیزانِ من! آگے سنئے کیا کہا ہے!! کہا فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (45:6) اگر انہیں دیکھ کے بھی کوئی ایمان نہیں لاتا تو پھر کونسی بات باقی رہ گئی ہے' جسے دیکھ کے پھر یہ ایمان لاسکیں گے۔۔یا اللہ!!۔عزیزانِ من! سوچئے ایمان کسے کہتے ہیں' قرآن ان چیزوں کے لئے کیا کہتا ہے۔بیچ کا ٹکڑا اور رہ گیا تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ(45:6) یہ خدا کی آیات ہیں جسے ہم پیش کرتے ہیں۔نَتْلُوْهَا(45:6) کے معنی ہم تو صرف تلاوت ہی لیتے ہیں' یہ خارجی کائنات کی آیات کو بھی قرآن کہہ رہا ہے کہ جس طرح قرآن کی وحی کی آیات کو تمہارے سامنے نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ(45:6) ہے ان کو بھی ہم پیش کرتے ہیں تمہارے سامنے اور اس کے بعد ہے فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (45:6) اللہ اور اس کی ان نشانیوں کے بعد اگر اس پہ بھی ایمان نہیں لاتے تو اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کس چیز پہ ایمان لائیں گے۔تو میں نے کہا کہ مومنین کی قوم' موقنین کی قوم' عقل مندوں کی قوم' ان کے لئے قرآن نے یہ کہا ہے کہ آیات ہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک تو متقی وہ ہے جو کائنات کی ان بکھری آیات پر صبح وشام غور وفکر کرے

ایک درجہ ابھی باقی تھا جسے ہم متقی پرہیزگار کہتے ہیں وہ عام مسلمان' عام مومن سے اگلا درجہ ہوتا ہے۔تصور اس کا تو آپ کے ذہن میں آ گیا ہوگا''بڑا متقی پرہیزگار ہے'' قرآن سے پوچھئے وہ کسے کہتا ہے اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (10:6) جو کچھ بھی کائنات میں خدا نے پیدا کیا ہے اور یہ جو لیل ونہار کی گردش ہے اس کے اندر لَاٰيٰتٍ (10:6) آیات ہیں نشانیاں ہیں' کن کے لئے؟ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ(10:6) متقیوں کے لئے۔مؤمنین کے لئے' موقنین کے لئے' متقیوں کے لئے یہ نشانیاں ہیں۔اور کہا کہ ان کے بعد بھی اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو پھر کونسی اور بات باقی رہ جائے گی جس کے بعد پھر یہ ایمان لائیں گے۔

دنیا بھر کے مذاہب میں کائنات کو نفرت کی نگاہ سے ہی دیکھا جاتا ہے

عزیزانِ من! بات میں یہ کہہ رہا تھا قرآن یا اسلام دین کی سٹیج سے بات کرتا ہے۔اور دنیا کے جتنے RELIGIONS آپ کو ملیں گے ان کے نزدیک یہ دنیا' یہ کائنات ان کی یہ تمام چیزیں جتنی بھی ہیں' سب قابلِ نفرت قرار دی گئیں ہر مذہب میں۔ان کے ہاں ہر مذہب میں جو برگزیدہ لوگوں کا مقام ہے' یہودیت کے اندر ان کے احبار و رہبان' رہبانیت وہاں سے ہے' ان کی خانقاہیں تھیں ترکِ دنیا کرنے والی۔عیسائیت کے اندر ان کے سینٹس ہیں جنگلوں میں جا کے رہنے والے۔ہندوؤں کے ہاں ان کے سنیاسی اور جوگی' انسانوں سے کٹ کے جنگلوں کے اندر رہنے والے۔مسلمانوں کے ہاں یہ آپ کے ہاں کے جو اربابِ شریعت' اربابِ علم جو ہیں یہ تو بڑا گھٹیا سا مقام ہے۔ان کے ہاں بلند ترین مقام جو ہے جو بزرگوں کا ہے' اولیاء اللہ کا ہے' اہلِ تصوف کا ہے' وہ وہ ہیں جو دنیا سے نفرت کر کے الگ ہو کے بیٹھ جاتے ہیں' خلوت گاہوں کے اندر' خانقاہوں کے اندر۔اور دنیا قابلِ نفرت جو ہے۔یہ بات تو اہلِ تصوف ہی نہیں اہلِ شریعت کے ہاں بھی تو آپ صبح سے شام یہی سنتے ہیں۔''دنیا ایک لاش ہے اور اس کا چاہنے والا کتا'' ہمیں بتایا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے''دنیا مومن کے لئے جیل خانہ ہے''۔تو ترکِ دنیا یا قابلِ نفرت ہے یہ' یہ ہر RELIGION کے اندر یہ چیز موجود ہے بلکہ مغز جو تھا RELIGION کی تعلیم کا وہ یہ تھا۔یہ اسلام بھی ہم شامل کر دیتے ہیں بدبختی سے RELIGIONS کی صف کے اندر۔تو چلئے RELIGION کی سٹیج کے اوپر ایک آتا ہے RELIGION کے مسلمات میں سے بنیادی مسلمہ یہ ہے کہ یہ کائنات اور دنیا قابلِ نفرت اور وہ آ کے آدھا قرآن بھرا ہوا ہے اسی سے کہ یہ ساری دنیا اور اس کی کائنات کی اشیاء جو ہیں یہ وہ ہیں کہ جن پہ غور و فکر کے بعد انسان صحیح نتیجے پہ پہنچتا ہے اور ان کو مسخر کرنا جو ہے یہ ہے مومن کا مقام۔

انسانی افکار کی بنیاد پر دین خداوندی کو مذہب میں بدل دینے کا نتیجہ

عزیزانِ من! مذہب کی سٹیج سے آ کے یہ چیز کہنا نظر آتا ہے مذہب دین کی بگڑی ہوئی شکل کا نام ہوتا ہے' انبیائے کرامؑ دین دینے کے لئے آتے تھے اور وہ خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ملتا تھا جب ان کے نام لیوا اس دین میں انسانی افکار کی آمیزش کر دیتے تھے تو وہ مذہب بن جاتا تھا۔نزولِ قرآن کے وقت دنیا میں مذاہب ہی تھے' دین نہیں تھا اسی لئے تو ایک نبی کی ضرورت پڑتی تھی۔حضور ﷺ نے آ کر دین دیا' قرآن کے اندر پورے کا پورا تکمیل تک پہنچا' قرآن کو محفوظ کر دیا' دین محفوظ ہو گیا۔

تسخیر کائنات کے فریضہ کو نظر انداز کرنے والا انسان خواہ کوئی بھی ہو وہ دوسروں کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے

قرآن پہ اگر دین کی بنیاد رکھی جائے تو یہ مذہب نہیں بن سکتا۔لیکن یہاں تو مذہب بنائے بغیر چارہ ہی نہیں۔یہ جو مذہب کے نام

کے اوپر یہ ان کے ہاں ہوتی ہے مفتی فوج' یہ ہم سمجھتے ہیں یہ صرف عیسائیوں کے ہاں ہوتی ہے یہ تو سارے مذاہب کے اندر مفتی ہوتے ہیں' مفت کی کھانے والے۔ قرآن کے ہوتے ہوئے تو مفتی فوج نہیں ہوتی' کیسے بنایا جائے؟ اسے رکھا جائے صرف ثواب حاصل کرنے کے لئے اور اسلام بتایا جائے تمام ان چیزوں کا مجموعہ جن سے مذہب بنتا ہے: یعنی وہ یہ کہ دنیا قابلِ نفرت' آپ کے ہاں بھی یہ ہے کہ قرآن کی ان آیتوں کے پڑھنے سے آخرت میں ثواب ہوتا ہے' دنیا قابلِ نفرت' حضرت صاحب دنیا سے منہ موڑ کے توکل علی اللہ حجرے میں بیٹھے ہیں۔ ''حضرت صاحب دے گوڈے وی چومو' تے حلوہ وی لیا کے دیو'' دو تین دن کے لئے وہ اگر تارکِ دنیا ہو جائے تو حضرت جی کو پتہ چل جائے کہ ترکِ دنیا ہوتی کیا ہے۔

زمین و آسمان پر مختلف قسم کی پیدا کردہ نعمتوں کا تذکرہ اور پھر اُن پر غور و فکر کرنے کی دعوت

عزیزانِ من! ہم کہاں پہنچ گئے۔ یعنی تسخیرِ ارض و سما قرآن یہ مومن کا فریضہ قرار دیتا ہے' انہیں آیات اللہ قرار دیتا ہے' ان سے آنکھیں بند کر کے گذرنے والے کے متعلق کہتا ہے کہ وہ ایمان ہی نہیں لا سکتے۔ پھر قرآن کے نزدیک عالم کسے کہتے ہیں؟ قرآن میں دو ہی جگہ یہ لفظ علماء کا آیا ہے ایک تو بنی اسرائیل کے علماء کے متعلق ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں کی بات ہے علماء' اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا ؕ (35:27) کیا تم نے ان باتوں کے اوپر کبھی غور کیا (تر عام طور پہ ان چیزوں کے لئے آتا ہے جو محسوسات کی دنیا میں ہوتی ہیں) خدا نے آسمان سے کس طرح بارش برسائی' کس طرح سے مختلف رنگا رنگ کے اس میں سے پھل پیدا کئے' قسم قسم کے رنگوں کی چیزیں اس میں سے پیدا کیں' کبھی تم نے ان کے اوپر غور بھی کیا۔ وَ مِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيۡضٌ وَّ حُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَ غَرَابِيۡبُ سُوۡدٌ (35:27) اور تم نے ان پہاڑوں کے اوپر بھی غور کیا۔ اللہ اکبر! سائنس کے کن کن شعبوں کی طرف لئے جا رہا ہے۔ چلئے صاحب! چلنے پھرنے والی چیزوں پہ یہ اردگرد والی چیزوں پہ تو ہوا' کہتا ہے پہاڑوں پہ بھی غور کیا اور غور کے لئے بتایا یہ کہ کبھی اس پہ بھی غور کیا کہ ان کے اندر جو مختلف LAYERS آ جاتی ہیں یہ سفید' یہ سیاہ' یہ کالی بھجنگ' یہ اس قسم کی' کبھی اس پہ بھی ریسرچ کیا کہ یہ کس طرح سے یہ مختلف LAYERS کیسے آ جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! یہ وہ علم تھا جس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ صرف ہمارے اس دور میں آ کے ریسرچ شروع ہوئی ہے کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ وہ اب یہ بتا رہے ہیں کہ جنہیں تم یہ جامد پتھر سمجھتے ہو اس کے اندر بھی زندگی ناچتی نظر آتی ہے۔ یہ یونہی نہیں کہ کوئی ایک LAYER یہ بن گئی اور وہ بن گئی یہ مختلف ارتقائی منازل ہیں' جو یہ طے کر رہی ہیں۔ اور وہ ریسرچ سے بتاتے ہیں یہ جو کہا کرتے ہیں کہ وہاں یہ ہوا' کھدائی سے پتھر ملا اور انہوں نے کہا کہ ہاں صاحب! یہ پچاس کروڑ سال پہلے کا یا دس لاکھ سال پہلے کا' یہ یونہی نہیں ہے کہ ''ٹوئے لان ڈئے ہوندے نیں'' یہ سائنس بن گئی

ہے اب ان چیزوں کی۔قرآن نے یہ چیز چودہ سو سال پہلے کہی کہ کبھی یہ بھی تم نے غور کیا کہ یہ پہاڑوں کے اندر یہ مختلف قسم کے طبقات یہ رنگا رنگ کے کیسے بن گئے۔وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ(35:28)اور پھر تم نے اس پہ بھی غور کیا کہ یہ مختلف قسم کے حیوانات جو ہیں مختلف ان کی قسمیں' مختلف ان کے خواص' مختلف عادات' کیا کیا ہیں۔

کائنات پر غور کیے بغیر خدا تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا

عزیزانِ من! سوچئے کہ یہ سائنس کا کوئی شعبہ بھی اہم ہے جو اس نے اس کے اندر چھوڑ دیا ہو۔کیا ان چیزوں کے اوپر غور کیا تم نے اور آگے سنئے کہا کہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جنہوں نے اس پہ غور کیا ہے وہ حقیقت میں خدا کی عظمت کو پہچان سکتے ہیں۔اور عظمت کو پہچاننے کے بعد جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ کتنا محیر العقول سلسلہ ہے اس کی بارگاہ میں کھڑے ہوئے واقعی اس کی کبریائی کے سامنے وہ کانپ اٹھتے ہیں کہ صاحب! کتنا عظیم سلسلہ ہے۔الفاظ سنئے! اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا(35:28) یہ تو صرف ان علوم کے جو عالم ہونگے وہ تمہیں بتائیں گے کہ خدا کیا ہے۔

اجرامِ فلکی کی رفتار میں ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے کا فرق بھی کائنات کو تباہ کر سکتا ہے

عزیزانِ من! یہ علماء کا لفظ یہاں آیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (35:28) وہ یہ تمہیں بتائیں گے کہ کتنی قوتوں کا مالک ہے اور پھر اس نے اس کائنات میں حفاظت کے سامان کیا کیا کر رکھے ہیں۔حفاظت کے سامان۔ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر ان اجرامِ فلکی کی حرکت میں' رفتار میں اگر ثانیے کے کروڑویں حصے کا بھی فرق آ جائے' ساری کائنات ٹکرا کے تہس نہس ہو جائے۔حفاظت کا سامان' قرآن نے دوسری جگہ یہ چیز جو کہی ہوئی ہے کہ یہ جو تمہارا ATMOSPHERE ہے یہ تمہارے لئے حفاظت کی چھت ہے۔آج سائنٹسٹ ہمیں بتا رہے ہیں کہ یہ جتنے بھی شہاب ثاقب اوپر سے آتے ہیں یہ جنہیں آپ ٹوٹے ہوئے تارے کہتے ہیں کتنی کتنی بڑی چٹانیں ہوتی ہیں جو وہاں سے اترتی ہیں۔عزیزانِ من! وہ چٹان وہاں سے گرے وہ گرے کہیں مریخ' پہ کبھی چاند' پہ اور آ کے پڑے یہاں' سوچئے تو سہی اور وہ ہر آن لاکھوں کی تعداد کے اندر گرتی رہتی ہے اوپر کے کروں سے اور نیچے ہم بیٹھے ہیں۔صاحب! کچھ سمجھ میں بات نہیں آتی تھی کہ یہ پھر ہماری حفاظت ہوتی کیسے ہے۔ چودہ سو سال پہلے قرآن نے کہا کہ یہ یاد رکھو! یہ جو LAYERS ATMOSPHERE کی تمہارے اوپر لگا رکھی ہے جسے کہتے ہیں قریباً چودہ میل' اس نے کہا یہ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا(21:32) ہے تمہارے لئے' یہ چھت ہم نے بنا دی ہے جو تمہیں محفوظ رکھ رہی ہے۔اور آج وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کے اوپر وہ جو گردش تیزی سے ہو رہی ہوتی ہے ان کے اندر آ کے وہ پس جاتے ہیں' ذرّے بن جاتے ہیں' چٹان بن کے نہیں گرتے۔لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (6:99)۔

عزیزانِ من! سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (21:32) کا مفہوم کون سمجھے گا ان کے سوا۔ یوں قرآن سمجھ میں آتا ہے۔ انہیں علماء کہا ہے' انہیں قرآن نے مومن کہا ہے۔

سقف محفوظ کے اوپر گردش کی تیز رفتاری کا وہ عمل جو انسان زندگی کی حفاظت کا ضامن ہے

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی سورۃ یوسف کی آیت سے وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (12:105) اب دیکھئے ان کے اوپر جو اعتراض وارد کیا وہ کہا کہ تمہاری بات یہ نہیں مانتے' نہیں سنتے' غور نہیں کرتے' کوئی تعجب کی بات نہیں ہے' یہ تو ایک نظری بات ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ ان کم بختوں کی' اندھوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ چلتے پھرتے ادھر اُدھر ساری کائنات میں پھر رہے ہیں' اندھوں کی طرح پھر رہے ہیں جنہیں وہاں خدا نظر نہیں آتا' تمہارے ہاں خدا کیا نظر آئے گا۔ عزیزانِ من! آگے ایک آیت آتی ہے۔ یہ تو وہ جو ایمان لاتے ہی نہیں ہیں ہم تو بہر حال مومن ہیں۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔ وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ (12:106) اور پھر ان میں سے جو ایمان والے اپنے آپ کو کہتے ہیں ان میں سے بھی اکثریت کی کیفیت یہ ہے کہ مومن ہونے کا دعویٰ بھی ہے اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106) اور مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔ یہ مومن ہونے کے ساتھ مشرک رہنا۔

مومن ہونے کے باوجود مشرک ہونے کا کردار

عزیزانِ من! مشرک کی بات سن لیجئے' کافر تو وہ ہے جو سرے سے مانتا ہی نہیں ہے خدا کو' ٹھیک ہے' مشرک ہے کہ جو خدا کو بھی مانتا ہے اور اس کے علاوہ اور خداؤں کو بھی مانتا ہے' اس کے ساتھ اوروں کو بھی مانتا ہے' خدا کو بھی مانتا ہے۔ اسی لئے تو کہا ہے کہ وہ اکثر ان میں سے مومن ہوتے ہیں' خدا کو مانتے ہیں لیکن مشرک ہوتے ہیں۔ ہمیں اطمینان ہو گیا کہ الحمدللہ ہم تو بت پرستی نہیں کرتے ہم تو مشرک نہیں ہیں۔ عزیزانِ من! جہاں تک بت پرستی کا تعلق ہے بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ وہ جس بت کو پوجتے تھے ''اوہدا کوئی منہ متھا تے بنالیندے سن اپنے سامنے'' کوئی شکل تو ان کی ہوتی تھی' بت بناتے ہی اس قسم کا تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ پرانے زمانے میں ان کی ابھی وہ یہ جو سنگ تراشی تھی' ایسی اچھی نفیس نہیں تھی اور اس کے بعد تو پھر یونان کے بنائے ہوئے جو بت تھے پوچھو نہیں صاحب! زندہ انسان ان کے سامنے اتنے خوبصورت نہیں رہتے تھے' جتنے کہ وہ آپ کو نظر آتے تھے۔

ہمارے ہاں کا وہ مروجہ اسلام تو سراپا صدیوں سے سیکولرازم کا لباس زیب تن کیے ہوئے ہے اور پاکستان کی تاریخ اس پر گواہ ہے

لیکن میں نے کہا ہے کہ یہ تو بت پرستی والی بات جو ہے' یہ وہ نہیں ہے بات آگے جاتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ جو موجودہ اسلام ہے جس پہ قائم رہنے کے لئے اتنی شدت سے زور دیا جاتا ہے اس میں یہ چیز ہے کہ شخصی قوانین جو ہیں وہ شریعت کے مطابق اپنے اپنے اور پبلک لاز جو ہیں وہ جمہوریت کے قاعدے کے مطابق۔ یہ مسلمہ ہے سیکولرازم کا۔ تحریکِ پاکستان جو تھی اس میں یہ ایشو تھا جس پہ لڑائی تھی۔ وہاں کے یہ نیشنلسٹ علمائے کرام کہ جن کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی مرحوم' مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ جو تھے ان کا مسلک یہ تھا کہ ہندو ہم کو آزادی دیتا ہے مذہب کی یعنی عبادات کی' عقائد کی اور شخصی قوانین کی' یہ تو زندگی کا ایک حصہ ہوئے اور باقی جو پبلک لاز ہیں یعنی وہ بھی تو ان مسلمانوں کے لئے ہی تھے' وہ جو ہیں وہ اس سے نکال کے اور جمہوریت کے طریقے کے اوپر وہ کہتا ہے کہ وضع کئے جائیں گے۔ اور ان کا یہ اعلان تھا کہ یہ اسلام کا تقاضا ہے اسلام اس قسم کی آزادی کی اجازت دیتا ہے۔

یومِ آزادی پر علامہ پرویزؒ کا خصوصی خطاب

عزیزانِ من! یہ تھی وہاں کشمکش۔ ابھی سے اعلان کر دوں' اس دفعہ میرے ذہن میں یہ ہے کہ یہ چودہ اگست یومِ آزادی جو آتا ہے' اس پہ میرا ایک خاص درس ہوتا ہے یا خطاب ہوتا ہے۔ وہ تو ہم بعد میں فیصلہ کر کے عرض کریں گے کہ کہاں ہونا چاہئے۔ میں اس دفعہ ذرا واضح طور پہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ کشمکش کیا تھی وہاں' یہ کیا کشمکش تھی' ہندو اب تک کیوں پاکستان کے پیچھے پڑا ہوا ہے' یہ میرا موضوع ہوگا۔ اور یہ عجیب چیزیں آپ کے سامنے آئیں گی' سندوں سے آئیں گی' ان کے حوالوں سے آئیں گی' ان کے اپنے ہاں کی اتھارٹی سے آئیں گی۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ وہاں یہ چیز کہی جا رہی تھی۔ عملاً اب آپ کے ہاں اب بھی یہی صورت ہے شخصی قوانین جو ہیں اس کے لئے آپ اہلِ شریعت سے فتویٰ لیتے ہیں عبادات' عقائد' شخصی قوانین' ملک کے قوانین جمہوریت کی رو سے ہوتے ہیں۔

سیکولر گورنمنٹ کے لوازمات اور بنگلہ دیش کا پہلے روز کا اعلان

یہ چیز عام چلن ہے اس وقت' مسلمانوں نے بھی ACCEPT کیا ہوا ہے' اعلانیہ طور پہ جو بنگلہ دیش آپ سے الگ ہوا ہے وہاں پہلی شق یہ رکھی کہ وہاں سیکولر گورنمنٹ ہوگی۔ ذرا سیکولر کی DEFINITION سمجھ لیجئے کہ عقائد' عبادات' شخصی قوانین یہ اپنی شریعت کے مطابق' خدا کے احکام کے مطابق تم استعمال کرو' اور یہ پبلک لاز جنہیں آپ کہتے ہیں' وہ جمہوریت کے عام قاعدے کے مطابق بغیر کسی قسم کی اوپر سے شرط عائد کئے ہوئے' جو بھی آپ کی پارلیمان کے نمائندے پاس کر دیں۔ آپ نے غور فرمایا۔ آیئے اب

قرآن کی طرف۔ (39:45) بڑی عجیب آیت ہے۔ وہ بتوں کی تو پھر بھی کچھ خوبصورت شکل بنا لیتے ہیں' ہم جو قبروں پہ جا کے کرتے ہیں جن کی ہم شکل تک بھی نہیں بناتے اس سے کچھ مختلف ہوتا ہے یہ؟ یہ سارے خدا کو ماننے والے ہوتے ہیں یا نہیں؟۔ ان کے ہاں تصویر میں انسان کی شکل بنانا جو ہے وہ تو حرام ہے' بت بن جاتا ہے اور جو کچھ بتوں کے ساتھ جا کے ہم کرتے تھے اور جو ان سے مانگتے تھے' وہ بغیر شکل بنائے ہوئے جو بت ہیں ان سے جا کے مانگا چلا جاتا ہے۔ تو میں نے یہ ایک شکل بنائی ہے آپ کہیں گے بہرحال یہ جہالت ہے میں آگے بات کر رہا ہوں جو میں نے درمیان میں چھیڑ دی تھی' پھر وہاں آ جاتا ہوں۔ یہ نظام جو آپ کے ہاں ہے اکثر و بیشتر آپ کے ہاں مسلمان حکومتوں نے بھی یہ طے کیا ہوا ہے سیکولر فارم آف گورنمنٹ۔

سیکولرازم کے اندر زندگی کا وہ پہلو جس پر قانون مکافاتِ عمل پر یقین نہیں ہوتا

عزیزانِ من! سیکولرازم میں مذہب جو ہے اس سے انکار نہیں ہوتا وہ ایک دائرہ ہے زندگی کا جس کے اندر آپ کو اجازت ہوتی ہے کہ آپ اپنے خدا کے مطابق یہ بات کرتے رہیے۔ دوسرا دائرہ ہے جس کے اندر اس کو دخل نہیں ہے مذہب کو' اس میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا ہے۔ اس کے بعد آیئے جناب! مومن ہوتے ہوئے مشرک۔ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ (39:45) یہ لوگ جو لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ (39:45) قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتے ہیں آخرت اور مستقبل پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے خالص ایک خدا کی بات کی جاتی ہے بہت ہی منہ بسورتے ہیں اور دل میں بڑی کبیدگی محسوس کرتے ہیں کہ صاحب! کیا کہہ رہا ہے۔ یہ کیفیت کہ دل میں کبیدگی محسوس کرتے ہیں ''جنوں کیندے نیں وٹ چڑھ جاندا ہیگا اے'' اس میں وہ دل اور چہرہ دونوں ہی آ جاتے ہیں۔ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ (39:45) کیفیت یہ۔ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45) اور جب اس کے ساتھ اس کے علاوہ اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے بہت خوش ہو جاتے ہیں يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45)' باچھیں کھل جاتی ہیں ''گل ہوئی نا صاحب!''۔ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (39:46) ایسا کہنے والوں سے اعلان کر کے کہہ دو' پہلی چیز تو یہ کہ خدا وہ ہے جو اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا NOTHINGNESS سے BEING میں لایا اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا بڑی سے بڑی قوتوں والے جو ہیں ان سے کہہ کے بتاؤ کوئی چیز جو ہے نہیں اس کو ''ہے'' کے اندر تبدیل کرے۔ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (39:46) یہاں ایسی خصوصیت بتائی ہے جو ممکن ہی نہیں ہے کسی اور کے لئے۔ سارے سائنٹسٹ اس تک تو پہنچے ہیں کہ وہ واقعی NOTHINGNESS سے وجود میں آئی ہے۔ آنا ہی تھا وہاں وہ محوِ حیرت ہیں کہ یہ ہم کہہ نہیں سکتے کہ یہ کیسے ہے کیونکہ جو ہماری علم

کی حد ہے اس میں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ قرآن یہاں لایا ہے خدا کی پہلی صفت کہ پہلی بات تو یہ یاد رکھو۔ کیا خیال ہے کوئی اس کے اندر شریک ہوسکتا ہے!! عزیزانِ من! بڑے سے بڑا منکرِ خدا بھی اس صفت کے اندر نہیں کسی کو شریک کرے گا' یہ تو کہے گا کہ ہمیں پتہ نہیں' یہ تو کہہ دے گا کہ اتفاقیہ ایسا ہوگیا یہ نہیں بتا سکتا کہ نہیں صاحب! یہ نہیں تھا کوئی اور تھا۔ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ (39:46) دوسری چیز یہ جو میں نے ابھی غیب کی بات کہی جاننے والا ہے جو چیزیں مشہود طریق پہ تمہارے سامنے آ گئی ہیں ان کو بھی اور جو چیزیں تمہاری نگاہوں سے مستور ہیں اس کا بھی جاننے والا ہے۔ دوسری یہ صفت آ گئی۔ جب میں نے ابھی عرض کیا تھا انسانوں کی دنیا کے متعلق یہ غیب جو ہے خدا کے علاوہ کوئی انسان نہیں اس کو جان سکتا دوسری شرط یہ آ گئی۔

شرک اور توحید کی بنیادی خصوصیات

عزیزانِ من! بات آگے آئی کہ شرک پھر کیا ہے' خدا کی توحید کیا ہے اور وہ شرک کیا ہے۔ کہا کہ غور سے سنو اَنْتَ تَحْكُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْ مَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ(39:46) یہ ہے خدا کہ وہ انسانوں کے اندر ان کے اختلافی معاملات کے اندر فیصلہ کن قوانین دیتا ہے اس کا نام توحید ہے۔ اس نے یہ کہا۔ یہاں اگر خدا کے ساتھ کسی اور کو آپ نے شریک کرلیا تو مومن ہونے کے باوجود مشرک کے مشرک رہے۔ خدا کے قوانین کے ساتھ زندگی کے کسی شعبے میں بھی غیر خدائی قانون جو ہے' اسے آپ نے اگر شامل کرلیا تو یہ ہے شرک جو قرآن کہہ رہا ہے۔ کہا یہ جا رہا تھا' وہاں بھی یہ دھڑلے سے یہ کہتے تھے کہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ زندگی کے اس شخصی شعبے کے اندر تو خدا کے قوانین اور پبلک لاز جو ہیں ان میں وہ قوانین جو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے شرک۔ کہا کہ مومن ہونے کے باوجود اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106) اور اسی لئے اس نے یہ تاکید کی دعائے ابراہیمؑ جو ہے جسے ہم نماز میں نیت کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! اب تو وہ نہ نماز نماز رہی نہ اس کی نیت نیت رہی۔ بات ہی وہ یہ تھی اس بات کا اعلان اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ(6:79) ہر طرف سے کٹ کے میں بالکل ناک کی سیدھ میں اس کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں۔ وہی فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ(6:79) کی جو یہاں خصوصیت بتائی اس کی طرف۔ حَنِیْفًا(6:79) یکسوئی' کسی اور کا اس وقت یہ حکومت کا' فیصلہ کن حقیقتوں کا' قانون کا' عبودیت کا' کوئی اور تصور نہ ہو حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ(6:79) یہاں آتا ہے وہ۔ یہ ہے جو کہا گیا ہے اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106) کہتا ہے ایمان اول تو لاتے نہیں ہیں اس تعلیم کی رو سے نہیں لاتے کائنات کی ان کھلی ہوئی نشانیوں کو دیکھ کے ایمان نہیں لاتے' جو ایمان لاتے ہیں تو ان کیفیت یہ ہوتی ہے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں شرک کی واضح تر شکل یہ ہے کہ انسان اپنے سرکش جذبات کو بھی اپنا ہم سفر بناتا ہے

عزیزانِ من! آگے بڑھئے۔ یہ تو بات میں نے کہی کہ دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین جو ہیں وہ اگر درمیان میں آجائیں تو اسے شرک کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن تو بہت دور جاتا ہے یہیں نظر آتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین' کہتا ہے یہی نہیں اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ (25:43) کہا کہ اس مشرک کو بھی تم نے دیکھا کہ جس نے اپنی ہی خواہشات کو اپنا خدا بنالیا۔ عزیزانِ من! کوئی دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین تو ایک طرف اگر اطاعت وعبادت کے اندر تمہارے اپنے جذبات بھی شریک ہو جائیں تو یہ بھی شرک ہے' الہ۔ لا الہ جب آپ کہتے ہیں تو یہ لفظ وہی ہے کوئی الہ نہیں ہے الا اللہ۔ تو الہ میں تو وہ سب سے پہلے یہ لاتا ہے' خود جو تمہارے اندر الہ تم نے بنا رکھا ہے۔ یہ کیفیت ہے۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

یہ بھی اس فکر کی اصنام گرد' کارخانے کو دیکھئے جس میں ہر آن ایک نیا خدا ڈھلتا ہے' کیفیت پھر میری یہ ہے کہ

رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ایک خدا کی کسی جکڑ بندی سے چھٹکارا حاصل کرتا ہوں تو دوسرے کی ہتھکڑیاں پہن لیتا ہوں۔ اور اسی لئے اس نے کہا تھا کہ

رہمدہ اقبالؒ را در کعبہ اے شیخِ حرم

شیخِ حرم اس کو اقبالؒ کو کعبے میں نہ آنے دینا' حج کرنے گیا ہے مومن ہے کیوں نہ آنے دینا؟

ہر زمان در آستیں دارد خداوندے دگر

یہ تو ہر وقت اپنی آستیں کے اندر چھپائے ہوئے رکھتا ہے ایک نہ ایک خدا کو۔

یہ ہے مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ (25:43) یہ ہے مشرک۔ وَ مَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106) جو ایمان بھی لاتے ہیں اس انداز کا ایمان لاتے ہیں۔

علامہ پرویز کے ہاں درس کی اہمیت

عزیزانِ من! وقت ہو گیا۔ سورۃ یوسفؑ کی آیت 106 تک ہم آ گئے ہیں آیتیں تھوڑی سی باقی ہیں میں چاہتا تھا 111 تک ہو جائے لیکن بہر حال! ہم نے کونسا ختمِ قرآن شریف کا ثواب حاصل کرنا ہے۔ درس میں بات یہ ہے ''جنی زیادہ گہائی ہووے او ہنے ای چنگے دانے نکلدے ہوندے نیں' اے کسے پنڈ والے نوں پوچھو''۔ عزیزانِ من! جب یہ گیہوں پک جاتی ہے پھر اس کو بچھا دیتے ہیں

پھر اس کے بعد وہ تو دانے ان خوشوں کے اندر ملے ہوئے ہوتے ہیں وہ پرانا طریق جو تھا اس کے اوپر سارا دن بیلوں کو چلاتے رہتے ہیں چلاتے رہتے ہیں تآ نکہ ان میں سے وہ چھلکا الگ ہو جائے اور جو اصل مغز اور دانہ ہے الگ ہو جائے۔ چلاتے رہتے ہیں بار بار چلاتے رہتے ہیں' اسے عربی زبان میں درس کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہم سورۃ یوسف کی آیت 106 تک آ گئے 107 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ(2:127)

❀.....❀.....❀

گیارہواں باب: **سورۃ یوسف** (آیات 107 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1973ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یوسف کی آیت 107 سے ہو رہا ہے (12:107)۔

تجدید یادداشت

سابقہ آیت آپ کو معلوم ہے کہ بڑی وضاحت طلب تھی اور آدھا درس اس میں میں نے صرف کیا کہ بڑی اہم چیز تھی۔ ذہن میں آپ کے ہوگا تجدید یاداشت کے لئے دہرادوں کہ **وَ مَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ھُمْ مُّشْرِکُوْنَ** (12:106) اکثر لوگوں کو تم دیکھو گے کہ وہ زبان سے ایمان کا دعویٰ بھی کریں گے لیکن مشرک کے مشرک رہیں گے۔ یہ بڑی گہری چیز ہے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے میں

نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ یہ مسلمان ہونے کے باوجود' وہ مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔اور میں نے اس کی مختلف شکلیں بتائی تھیں اور ان میں سب سے زیادہ فریب انگیز شکل وہ تھی جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولر گورنمنٹ کہتے ہیں۔

سیکولر نظام کی تعریف (ا) عقائد' عبادات' شخصی قوانین' شریعت حقا کے تحت اور ملکی قوانین زندگی کے ضوابط جمہوری طریقے سے

وہ سیکولر جوان ملکوں میں عام طور پہ رائج ہے جنہیں DEMOCRATIC یا جمہوریت پسند کہا جاتا ہے۔اس کا ڈھانچہ یہ ہوتا ہے کہ عقائد' عبادات' شخصی قوانین' یہ تو اسلام کے مطابق ہوں' شریعتِ حقا کے مطابق ہوں اور باقی ملکی قوانین' زندگی کے ضوابط' یہ سارے جمہوری طریقے سے طے پائیں ان کے لئے یہ شرط نہ ہو کہ وہ خدا کی کتاب کے مطابق ہوں۔زندگی کے یہ دو حصے کر دئے جاتے ہیں ایک حصے میں بزعمِ خویش اسلام ہوتا ہے' ایمان ہوتا ہے اور دوسرا حصہ جو ہے وہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے تابع چلتا ہے۔اور اگر خدا کے ساتھ کسی اور اتھارٹی کو مان لیا جائے ایسا کہ اسے حقِ حکومت حاصل ہے تو یہ شرک ہے۔ایک تو وہ چیز ہوگی کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) وہاں یہ کہا ہے کہ وہ سرے سے اسے مانتے ہی نہیں ہیں کہ خدا' وحی' کتاب' جیسا کہ اکثر کمیونسٹ کنٹری کے اندر یہ چیز ہوتی ہے وہ مانتے ہی نہیں ہیں' ٹھیک ہے کھلے بندوں ایک چیز آ گئی کفر ہے۔

شریعت کے علمبرداروں کا کردار بڑا حیران کن ہوتا ہے

آپ دیکھیں گے کہ یہ ہمارے اربابِ شریعت' علمبردارانِ اقامتِ نظامِ خداوندی' یہ سب آپ دیکھیں گے کہ اس کفر کو تو یہ اچھا لیں گے اور یہ جو اپنے ہاں کا شرک ہے' اسے عینِ اسلام بتائیں گے۔تحریکِ پاکستان کے دوران جنگ کیا تھی؟ یہی چیز تھی' ہندو یہ کہتا تھا اور اس کے ساتھ ہمارے نیشنلسٹ علمائے کرام تھے کہ اسلام کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے اگر اعتقادات' عبادات اور شخصی قوانین کی آزادی مل جائے اور باقی حصۂ زندگی جو ہے وہ وہاں جمہوری طریقے سے طے پا جائے۔جونہی آپ نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا یہ ثنویت اس میں آپ لائے' یہ خدا کے ساتھ اور ملا دینے سے میں نے جیسا کئی دفعہ کہا ہے' خدا کا اس میں کچھ نہیں بگڑتا۔ساری دنیا خدا کو نہ مانے' اس کا کیا بگڑتا ہے۔وہ تو اس دن بھی خدا تھا جب دنیا تھی ہی نہیں۔سوال وہاں کا نہیں سوال تو تمہاری اپنی زندگی کے نظریے کا ہے۔زندگی کو آپ نے دو حصوں میں تقسیم کیا تو یہ شرک ہو گیا۔تو یہ جو چیز ہے کہ یہ ثنویت' یہ DUALISM جسے آپ کہتے ہیں عام اصطلاح میں جسے مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنا کہتے ہیں' یہ ہے وہ چیز جسے شرک کہا ہے قرآن نے۔

توحید کی بجائے آج مسلمان حکومتوں نے تو اعلانیہ طور پر سیکولر نظام کو اپنا رکھا ہے

عملاً توحید یہ ہے کہ خدا کی کتاب کے مطابق تمام معاملاتِ زندگی طے کئے جائیں یہ توحید ہے۔اس سے انکار ہی کر دیا جائے کہ یہ کچھ شے ہے ہی نہیں' انسان اپنی عقل وفکر سے سب کچھ کرے گا' یہ کفر ہے۔اور شرک یہ ہے کہ زندگی کے ایک حصے میں تو خدا کو مانا جائے اور دوسرے حصے میں اس سے انکار کر کے کوئی اور اتھارٹی انسان لے آئے' یہ شرک ہے۔تو شرک کی یہ شکل تو آج کل ساری دنیا میں کم و بیش یہ ہے۔آپ کی مسلمان حکومتیں جو ہیں ان میں بھی بیشتر وہی ہیں کہ جنہوں نے سیکولر فارم اپنے ہاں ADOPT کر رکھا ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ ہم یہ کر کیا رہے ہیں۔لیکن آج تو چونکہ آپ کے ہاں نہ کوئی مسلمان کا معیار ہے' نہ اس کی کوئی DEFINITION ہے لہٰذا وہ بھی مسلمان ہیں یہ بھی مسلمان ہیں' ہم بھی مسلمان ہیں۔اعلانیہ کہتے ہیں کہ ہمارا نظامِ حکومت سیکولر ہوگا اس کے باوجود' مسلمان ہیں۔دیکھتے ہیں قرآن کیا کہتا ہے وَ مَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106)۔

خدا کی کتاب کے ایک حصے کو ماننا اور دوسرے حصے سے انکار کرنا یہی تو شرک ہے

یہ جو اس قسم کے نظام ہیں' یہ زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا وہ جو سورۃ بقرۃ کی وہ آیت ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (2:85) کیا ان کی یہ کیفیت ہے کہ کتابِ خداوندی کے ایک حصے کو مانتے ہیں اور دوسرے سے انکار کرتے ہیں۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ(2:85) کیا ان کی یہ کیفیت ہے کہ انہوں نے دو حصے کر رکھے ہیں ایک حصہ اعتقادات' عبادات' شخصی قوانین کا وہ خدا کے احکام کے مطابق' دوسرا حصہ جو ہے اس میں اس سے انکار وہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق۔کہتا ہے ٹھیک ہے کر دیکھئے' زندگی میں شرک کا نتیجہ اس نے کہا ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت اور خواری اور پھر آخرت کی زندگی کے اندر اس سے زیادہ شدید تریں عذاب۔

غلط نظامِ زندگی کے تباہ کن نتائج غیر محسوس طور پر اثر انداز ہوتے ہیں

اسی لئے شرک کو اس نے ظلمِ عظیم کہا ہے' بارگاہِ انسانیت میں سنگین تریں جرم۔اب یہ جو اس طرزِ زندگی سے تباہی آتی ہے اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِیَهُمْ غَاشِیَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (12:107) تو کیا یہ انداز اختیار کرنے والے' یہ شرک کرنے والے' یہ مطمئن ہو کے بیٹھے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم پہ تباہی نہیں آ سکتی۔کہا اس تباہی آنے کے دو طریق اور دو انداز ہوتے ہیں یا تو یہ ایسے آیا کرتی ہے جیسے سورج کی روشنی مثلاً آہستہ آہستہ اندھیرے کی چادر لپٹتی جاتی ہے اور یہ نئی روشنی کی چادر بچھتی چلی جاتی ہے بڑی غیر محسوس طور پر' یہ چیز ہوتی ہے۔یہ جو ڈھانپ لینے والی چیز ہوتی ہے وہ بڑی غیر محسوس طور پر آتی ہے۔آپ کہیں بیٹھ کے دیکھتے

رہئے کہ وہ دھوپ کس طرح سے سست رفتاری سے غیر محسوس طور پر آگے بڑھتی ہے لیکن کیفیت اس کی یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر ہر شے کے اوپر چھا جاتی ہے۔ایک تو انداز یہ ہوتا ہے اور دوسرا انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ بَغْتَةً (12:107) آ جاتی ہے اچانک آ جاتی ہے وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (12:107) ان کے شعور میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ کہاں سے یہ مصیبت آ جائے گی۔اصل میں یہ جو طریق ہے یہ ہوتا تو یہ بھی ACCUMULATIVE EFFECT ہی ہے ایک مجموعی اثر ہوتا ہے آہستہ آہستہ SLOW POISONING کا کہ وہ تخریب والی' تباہ کرنے والی' موت لانے والی چیز' جمع ہوتی رہتی ہے۔اور یاد رکھئے! یہ موت بھی جو انسانی موت آتی ہے بجز اس کے کہ حادثہ کہیں ہو جائے تو وہ تو غیر طبعی اسے کہتے ہیں' طبعی موت کا سلسلہ ساری زندگی میں شروع رہتا ہے وہ آہستہ آہستہ یہ چیزیں اندر ہی اندر جسے آپ کہتے ہیں' یہ ہونی شروع ہوتی ہیں۔ہر بیماری موت کے لئے ایک سبب بن جاتی ہے خواہ اس سے آپ کو شفا ہی کیوں نہ ملے ایک اثر چھوڑ جاتی ہے۔تو وہ جس دن اس کا ACCUMULATIVE EFFECT اتنا ہو جاتا ہے کہ وہ پلڑا RESISTACE کی قوت کے اوپر بھاری ہو جاتا ہے' تو ایسے ہم کہتے ہیں کہ صاحب! اچھا بھلا سویا تھا' بس اچانک اس نے دو سانس لئے اور موت واقع ہو گئی۔پچھلے زمانے میں تو اس قسم کی موت کبھی کبھی ہوتی تھی اس لئے کہتے تھے' یہ بھی شہادت ہوتی ہے اور اب تو پھر ہر تیسرا آدمی شہید ہو جاتا ہے۔کہہ میں یہ رہا تھا کہ قرآن نے قوموں پر تباہی آنے کے دونوں طریقے اس نے بتا دئے۔ایک تو یہ ہے کہ خاموشی سے آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر وہ چادر کی طرح بچھتی چلی جاتی ہے اور ایک یہ ہے کہ وہ شعور نہیں ہوتا کہ آرام سے بیٹھے ہیں کہ نہیں صاحب! کچھ تباہی ہمیں نہیں آئے گی لیکن وہ بَغْتَةً (12:107) آ جاتی ہے۔شرک کے بعد یہ کہا۔اب اس کے بعد وہ عظیم آیت آتی ہے جسے بیسیوں دفعہ سامنے لایا گیا ہے۔عزیزانِ من! مذہب کی سٹیج کے اوپر ویسے تو قرآن سارا ہی بے مثل و بے نظیر ہے اس کی ساری تعلیم کی مثل کہیں اور نہیں مل سکتی لیکن بعض چیزیں ایسی اس میں نمایاں طور پر ابھری ہوئی آ جاتی ہیں کہ ذہن میں نہیں آتا کہ مذہب کی سٹیج سے یہ بات کہی جائے گی۔مذہب میں FAITH (ایمان) مان لینا جسے کہا جاتا ہے وہ ہوتا ہے آنکھیں بند کر لینا' کسی چیز پہ ایمان لے آنا۔وہ اسی لئے جو ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ایمان کا FAITH ہوا تو ہمارے یہ آنے والی نسل مانتی نہیں ہے۔اس نے کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ جس میں علم کو دخل نہ ہو' بصیرت کو دخل نہ ہو' اس بات کو آپ منوا رہے ہیں صاحب! اس چیز کو کیسے مانا جائے۔انگریزی میں انہیں پڑھایا ہم نے تو FAITH کہہ دیا ادھر ہم نے اس کو ایمان کہا تو ایمان کا مفہوم کچھ اس قسم کا دے دیا۔

مذہبی دنیا میں پائے جانے تصورات ہمیشہ فوق الفطرت چیزوں پر ہوتے ہیں

مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے' مذہب کا مدار ہی فوق الفطرت چیزوں پہ ہوتا ہے SUPER-NATURAL پہ ہوتا ہے'

SUPERSTITIONS پہ ہوتا ہے وہاں سوال ہی نہیں ہے عقل وفکر کا' REASON کا' RATIONALISM کا۔تو اسلام کو بھی تو ہم مذہب کی صفوں میں شمار کرتے ہیں' اسی سٹیج سے یہ بولتا ہے۔ویسے بھی بہرحال خدا کا ماننا' انبیاء کا آنا' وحی کا آنا' یہ چیزیں تو غلط ہی سہی' ان کا تصور دوسرے مذاہب میں' مذہب میں یہ چیزیں تو ہوتی ہیں' یہ قدرِ مشترک تو ہے۔مذہب کی سٹیج سے بولتا ہے اور کہتا کیا ہے! قُلْ(12:108) اے رسول اعلان کردو هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ (12:108) یہ ہے میرا راستہ۔سبیل ہے سُبل نہیں ہے' سبیل: ایک راستہ۔جہاں آپ امت کے اندر کسی معاملے میں تفرقہ پائیں اور دونوں اختلافی چیزوں کو سنت رسول اللہ ﷺ کہیں وہیں جھوٹ ہے۔ایک ہی راستہ' خود خدا نے کہا ہے اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (11:56) وہ بھی ایک صراطِ مستقیم پہ جاتا ہے۔اس کے رسول ﷺ نے کہا جہاں کہا اس نے سبیل کہا ہے ایک ہی راستہ ہے۔وہ اس پوری زندگی میں توحید سکھاتا ہے تو آپ کی اجتماعی زندگی کے اندر تفرقہ اور اختلاف سکھائے گا!! تفرقے کو اس نے شرک کہا ہے۔بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ (12:108) یہ ہے میرا راستہ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ (12:108) اور یہ یاد رکھو! کہ میں جو خدا کی طرف تمہیں۔دعوت دیتا ہوں تو علم وبصیرت کی بنا پہ دعوت دیتا ہوں۔

ہر رسول کی دعوت تو شروع سے لے کر آخر تک علی وجہٴ بصیرت ہوتی ہے اور یہی سنت رسول ہے

یہ ان معنوں میں FAITH نہیں ہے یہ CONVICTION ہے ترجمہ اس کا غلط کیا' وہ تو CHRISTIANITY کے الفاظ انگریزی زبان کے اندر موجود تھے' ہم نے بھی اٹھایا اور وہ ترجمہ کردیا' ہم نے کیا کہا ان لوگوں نے ہم سے پہلے ترجمے کئے تھے مغرب والوں نے' وہی الفاظ ہم نے اس میں استعمال کردئے' سمجھے ہی نہیں کہ یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ (12:108) میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں' علم کی بنا پر' عقل وفکر کی بنا پر' شعور کی بنا پر' REASON کی بنا پر' دلائل وبراہین کی بنا پر دعوت دیتا ہوں۔بَصِيْرَةٍ(12:108) کا ایک لفظ بڑا ہی جامع ہے خدا کی طرف دعوت اور RATIONALLY دعوت۔قُلْ(12:108)اعلان کردو تم اس کے متعلق' یہ ہے میرا راستہ اور میں جو خدا کی طرف تمہیں دعوت دیتا ہوں' علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں اور آگے ہے اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ط(12:108) میں بھی اسی طرح دعوت دیتا ہوں اور جو میرے پیچھے چلنے والا ہوگا وہ بھی اسی طرح سے دعوت دے گا۔عزیزانِ من! سنت رسول اللہ ﷺ کا متبع وہ ہے جو دین کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہے' اس کی شہادت قرآن ہے اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ط(12:108)۔پہلی شہادت اس کی کہ اتباعِ رسالت مآب ﷺ کون کرتا ہے! جو دعوت الی اللہ' علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہے۔خدا نے رسول سے کہا کہ تم اپنے متعلق بھی کہہ دو اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ط(12:108) اور جو میرا اتباع کرتا ہے۔یہ ہے آپ کا دین جس میں اب عقل کا نام لیا جائے تو سب سے پہلا فتویٰ۔

معتزلہ یعنی عقل سے کام لینے والے جن کے خون سے بغداد کی گلیاں رنگین ہوگئیں تھیں

آپ کو معلوم ہے یہ ایک لفظ ''معتزلہ'' آپ کے ہاں آتا ہے وہ انہوں نے اس کو قریباً گالی بنا دیا' وہ ایک فرقہ بنا دیا' اس فرقے کے متعلق یہ ہوا کہ وہ بغداد کی گلیوں میں اور ان کی نالیوں میں ان کے خون پانی سے بھی ارزاں تھے جس طرح سے ان کا خون بہایا گیا۔ اور اس کے بعد انہیں اس قدر گھناؤنا بنا دیا گیا کہ اب بھی جس کے نام کے ساتھ یہ جی چاہتا ہے کہ اس کو کفر اور الحاد اور بے دینی اور ان چیزوں سے ملوث کیا جائے' ایک لفظ اس کے لئے وہ معتزلہ کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ کون تھے؟ یہ وہ تھے جو کہتے تھے کہ ہم خدا کی طرف دعوت علیٰ وجہ البصیرت دیتے ہیں' یہ کافر اور ملحد' یہ مرتد۔ کتنا جرم تھا؟ وہ کہتے تھے کہ دین نام ہے خدا کی کتاب اور عقلِ انسانی' یہ ان کا جرم تھا۔

شرک سے ماوراء عقل وفکر کی بنا پر توحید پر مبنی دعوت الٰہی جس میں نہ کوئی مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی نہ کوئی شعبدہ بازی اور نہ کوئی معجزہ

خدا رسول سے کہہ رہا ہے کہ کہہ دو قُلْ (12:108) اعلان کر دو کہ میں علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ ط (12:108)۔ دعوت کیا تھی؟ وہی جو بات چلی آ رہی ہے توحید کی وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (12:108) اور سن رکھو کہ میری دعوت شرک کی دعوت نہیں ہے۔ میں انسانی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ میں خدا کا دائرۂ اختیار زندگی کے تمام گوشوں کو محیط سمجھتا ہوں اور آخری سانس تک اس کے اوپر قائم رہتا ہوں۔ یہ ہے مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (12:108)۔ اعتراض ہو گیا کہ صاحب! یہ علیٰ وجہ البصیرت دعوت' عقل وفکر کی بنا پہ' نہ کوئی معجزہ' نہ کوئی کرامت' نہ کوئی شعبدہ' یہ کس طرح سے یہ دعوت ہے' کیسے یہ کہہ رہا ہے کہ میں خدا کی طرف سے پیغمبر ہوں میں خدا کی طرف سے رسول ہوں' ہمارے جیسا ایک انسان' ان کے اعتراضات تھے۔ یعنی یہ قرآن نے ان کا اعتراض خود QUOTE کر دیا ہے۔ جرم کیا تھا صاحب؟ یہ کیسا رسول ہے ہم نے دیکھا ہے بازاروں میں چلتا پھرتا ہے سودا سلف لاتا پھرتا ہے' یعنی یہ رسالت کے منافی ہے' اس کے بیوی بچے ہیں' کھاتا پیتا ہے۔ مذہب نے تو تصور ہی کچھ اور دے رکھا ہوتا ہے جب تک اس کے اندر فوق الفطرت TOUCH نہ دیا جائے اس وقت تک تو وہ خدا کا بزرگ ہی نہیں۔ رسول تو خیر بہت بڑے مقام پہ ہیں' یہ عام اللہ کے مقربین اولیاء اللہ جن کو بنایا جاتا ہے ان کے لئے دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ حضرت صاحب نے یہ کیا' اور وہ یوں ہو گیا' چلئے شہادت اور دلیل مل گئی ان کے مقرب ہونے کی' ولی اللہ ہونے کی تو رسول کے متعلق یہ ہونا ہی چاہئے تھا۔ کہا کہ ان سے کہہ دو وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْ اِلَیْھِمْ مِّنْ اَھْلِ الْقُرٰی ط (12:109) میں کوئی انوکھی قسم کا رسول نہیں ہوں' جتنے رسول بھی آئے ان سے پوچھ کر دیکھو اہلِ کتاب تو کم از کم اپنے رسولوں کو جانتے ہیں' ان سے پوچھ کر دیکھو جتنے رسول بھی آئے

تھے فوق الفطرت کوئی چیز رکھنے والے نہیں تھے جس طرح سے کہ یہ بشر اور مرد ہے اسی قسم کے وہ انسان اور مرد تھے۔ بات صرف یہ تھی کہ نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ (12:109) ہم ان کی طرف وحی بھیجتے تھے۔ وہ اپنی ذات میں کچھ اس قسم کی چیز نہیں تھے ہم ان کی طرف وحی بھیجتے تھے۔ انہی بستیوں کے رہنے والے ہوتے تھے وہ بھی کہیں آسمان سے نہیں ٹپکتے تھے انہی میں سے ایک فرد کو منتخب کیا جاتا تھا اس کی طرف ہم وحی بھیج دیتے تھے۔ اور پھر اس کے بعد پوچھو ان سے کہ جو ان کی بات کو نہیں مانتا تھا جو اس کے خلاف چلتا تھا پھر اس قوم کا نتیجہ کیا ہوتا تھا۔

رسول کی دعوت تو بغیر کسی مزد و معاوضہ کے عالم گیر سطح پر ہوتی ہے

عزیزانِ من! دو باتیں دیکھئے پہلے یہ چیز کہی تھی آیت 104 میں کہ تم اعلان کر دو کہ میں خدا کی یہ دعوت دیتا ہوں اور اس کے لئے کوئی معاوضہ تم سے نہیں چاہتا میرا اپنا اس میں کوئی مفاد نہیں منفعت نہیں۔ یہ اگر نہیں مانتے تو ان سے کہہ دو کہ کوئی بات نہیں یا تم بھی سمجھ لو کہ کوئی بات نہیں یہ صرف انہی کے لئے نہیں ہے اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (12:104) یہ تو تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ کہا یہ تو ایک ایسی وحی تمہاری بھیجی جا رہی ہے جو نظری چیز ہے THEORATICAL چیز ہے ABSTRACT سی چیز ہے محسوس شے نہیں ہے۔ ان کی تو یہ کیفیت ہے وَ کَاَیِّنۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ یَمُرُّوۡنَ عَلَیۡہَا وَ ہُمۡ عَنۡہَا مُعۡرِضُوۡنَ (12:105) کائنات میں یہ چلتے پھرتے ہیں وہاں قدم قدم کے اوپر اس قسم کی علامات بکھری پڑی ہیں کہ جنہیں دیکھا جائے تو فوراً انسان کا ذہن بشرطیکہ وہ ذہن تعصب سے پاک ہو اور عقل و فکر سے کام لینے والا ہو فوراً وہ ان باتوں کے اوپر ایمان لانے کے لیے انسان کو BELIEVE کرنے کے اوپر آمادہ کر دیتا ہے۔

اس کائنات کا ذرہ ذرہ جو ایک اکائی کی حیثیت سے قانون واحد کے تحت سرگرم عمل ہے انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے

تو میں نے کہا تھا کہ قرآن نے خدا پر ایمان کا ایک بڑا ذریعہ کائنات پر غور و فکر کو قرار دیا ہے اور اس کے لئے میں نے بہت سی آیات پیش کی تھیں۔ وہ اہلِ ایمان کی یہ نشانیاں بتاتا ہے: خارجی کائنات کی مشینری پہ غور و فکر کرنے والے ارباب فکر و تدبر وہ متقین کی یہ نشانی بتاتا ہے۔ تو کہا کہ ان کی تو یہ کیفیت ہے کہ یہ کائنات میں سے ان گذرگاہوں میں سے چلتے ہیں اور اس کے بعد آنکھیں بند کئے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ خارجی کائنات جو اس قدر عظیم کائنات قانونِ واحد کے سہارے پہ چلتی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اس دور میں تو ابھی لوگ اس پہ نہیں پہنچے تھے ہمارے اس دور میں اس کائنات کے متعلق جو BASIC CHARATERISTIC بتایا گیا سائنٹسٹ کے نزدیک تمام سائنسدان دو بنیادی خصوصیتیں یہاں کائنات کی مانتے ہیں: ایک تو THE LAW OF CAUSE

EFFECT & یہ علت ومعلول جسے کہتے ہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے اس کے پیچھے اس کی ایک وجہ اور سبب ہوتا ہے' بلا سبب کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ اور دوسری ہے THE LAW OF UNIFORMITY OF NATURE کہ کائنات کی وحدت جو ہے یہ دوسری چیز ہے جہاں' جس جگہ اس قسم کے حالات ہونگے' وہاں کائنات میں وہی قانون کارفرما ہوگا۔ کائنات میں شرک نہیں ہے۔

Cause & Effect کی بنیاد پر آج کے سائنسی انکشافات اور قرآن حکیم کی وضاحت

تمام سائنسدان آج تجربے کر کے اپنی لیبارٹریز میں انہوں نے یہ دو قانون جو ہیں مشترکہ قانون انہوں نے بتائے ہیں علمِ سائنس کے LAW OF CAUSE & EFFECT کوئی بھی نتیجہ یا کوئی EFFECT جو ہے وہ بغیر کسی CAUSE کے نہیں ہوتا یہی ہے قانون اور دوسری چیز جو ہے LAW OF UNIFORMITY OF NATURE ساری کائنات میں ایک قسم کا قانون چلتا ہے۔ اور یہ کہہ کے کہا کہ یہ لوگ تو ان چیزوں پہ غور نہیں کرتے اس لئے وَ مَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ھُمْ مُّشْرِکُوْنَ (12:106) توحید پہ تو ان چیزوں نے لانا تھا۔ وحیِ خداوندی پہ غور کرتے یا کائنات میں جو قانونِ خداوندی کارفرما ہے اس پہ غور کرتے' ان کو پتہ چلتا کہ یہاں توحید کارفرما ہے۔ تو یہ وجہ ہے کہ یہ شرک کرتے چلے جاتے ہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک حقائق تک پہنچنے کے لیے تاریخی شہادتوں کی اہمیت

یہاں وحیِ خداوندی کے ساتھ خارجی کائنات پر غور وفکر کو ضروری قرار دیا اور یہاں وحیِ خداوندی کے ساتھ تاریخی شواہد کو ضروری قرار دیا کہ یوں نہیں مانتے تو ان سے کہو کہ پہلی قوموں کے احوال وکوائف پہ نگاہ ڈالیں' پھر دیکھیں کہ جس قوم نے اس قانون کے مطابق زندگی کی' جو انہیں اب ہم دے رہے ہیں' اس کے نتائج کیا ہوئے اور جس قوم نے اس کی خلاف ورزی کی' اس کے نتائج کیا ہوئے۔ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ط (12:109) کہ دیکھتے کہ وہ لوگ جو ان سے پیشتر گذر چکے ہیں۔ یہ لفظ عاقبۃ جو ہے ہمارے ہاں تو عاقبت وہ آخرت کو ہی کہتے ہیں یہاں کی دنیا کے ساتھ تو انہوں نے کچھ رکھا ہی نہیں کیونکہ اگر یہ معیار تسلیم کر لیا جاتا کہ خدا کے بتائے ہوئے پروگرام اور قوانین کا نتیجہ اس دنیا کے اندر بھی سامنے آتا ہے تو ان کا سارا کیا کرایا' گھروندا جو تھا' وہ ریت کی طرح بیٹھ جاتا۔

اُمت مسلمہ کے ہاں مروجہ اسلام نے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر ذلیل وخوار کر دیا ہے

یہاں جس مذہب کو یہ اسلام کہہ رہے ہیں' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی اتنی خوبیاں بتانے کے بعد پھر مرثیہ پڑھنے لگ جاتے ہیں' ساری دنیا کے مسلمانوں کا مرثیہ۔ عزیزانِ من! کوئی دو مسلمان اکٹھے ہوں وہ مرثیہ پڑھیں گے ''ہماری کیا حالت ہوگئی' ہم ذلیل

ہو گئے' خوار ہو گئے' انفرادی طور پر اجتماعی طور پر' ساری دنیا کی قوموں کے اندر ذلیل وخوار ہو گئے''۔ستیاناس! ذلت وخواری کی کوئی حد ہے کہ وہ پورے کا پورا عرب ملک یہاں سے وہاں تک سمندر کی طرح ایک ہی ملت وہاں بس رہی ہے جنہیں مسلمان آپ کہتے ہیں اور وہ بھی وہ عرب جن کو یہ دعویٰ ہے کہ یہ قرآن ہماری زبان میں نازل ہوا' ہماری طرف نازل ہوا' اس سے بڑا دعویٰ ہے ان کو۔ بات آ جاتی ہے ذرا سی شک کی لیکن یہ اور کی نہیں ہوتی۔

1958ء میں پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی ممالک کے جید علمائے کرام کے اجتماع میں علامہ پرویزؒ کی شرکت

1958ء میں یہاں ایک بہت بڑا سیمینار ہوا تھا پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے' اس میں تمام ممالکِ اسلامیہ کے جید علمائے کرام کو جمع کیا گیا تھا یورپ کے بھی اچھے اچھے مفسر اس میں آئے تھے اس میں DISCUSSIONS ہوئی تھیں پیپر بھی پڑھا گیا۔ بہرحال ! جیسا کہ ہونا تھا' پتہ نہیں کس نے یہ غلطی کر لی کہ مجھے بھی بلا بھیجا تو وہ میرے پیپر سے پہلے ہی یہاں ان علماء کو جو باہر سے آئے ہوئے تھے خاص طور پہ اکٹھا کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ ہے یہاں سب سے بڑا فتنہ' اس سیمینار کا ماحصل یہ ہونا چاہئے کہ اس کو کسی طرح سے شکست دیدی جائے۔ وہ دوسرے دن وہ پیپر تھا وہ وہاں میں نے پڑھا' وہ انگریزی میں پیپر تھا انہوں نے کہا تھا کہ WEST والے آئے ہوئے ہیں' ان کے لئے خاص طور یہ پیپر تمہارا بڑا مفید ہے تو اس کو پڑھئے' وہ پڑھا گیا' ان میں وہ بھی تھے کہ جو انگریزی جانتے تک نہیں تھے سب سے پہلے مخالفت شروع کر دی۔ اب وہ وفات پا گئے مصر کے' اب میں نام نہیں لینا چاہتا' مرحوم ہو گئے سید خاص طور پہ لکھتے تھے تو انہوں نے اٹھ کے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ کس طرح سے قرآن سمجھ سکتا ہے یہ کس طرح سے قرآن جان سکتا ہے' قرآن ہم جانتے ہیں اور دلیل یہ تھی کہ ہم قرآن جانتے ہیں' ہماری رگوں میں رسول اللہ ﷺ کا خون جاری وساری ہے۔ میں بیٹھا ہوا تھا ان یورپین کے درمیان میں' انہوں نے مجھے خاص طور پہ کہا تھا کہ ان میں بیٹھو ذرا باتیں وا تیں ان سے کرتے چلے جاؤ' ان میں سے کس کو یہاں بٹھائیں۔ کہنے لگے کہ ہماری رگوں کے اندر رسول اللہ ﷺ کا خون جاری وساری ہے' میں نے کہا ابوجہل کا کیوں نہیں کہا جاتا خون تو وہاں ایک ہی تھا دونوں کا' خون ہی کی اگر بات ہے تو۔ اب جہاں یہ حق اور صدق کا معیار قرار پا جائے کیا کہا جائے کسی کو۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہاں تو یہ عاقبت کا لفظ ہمارے ہاں آخرت کے لئے اور پھر آخرت کا لفظ بھی وہ بھی وہ مرنے کے بعد کے لئے ہی۔ وہ اقبالؒ بعض بڑے ہی دلکش اندر سے وہ کہتا ہے کہ میں ان سے گھنٹہ بھر وعظ کہتا رہا اور یہ بتاتا رہا کہ اسلام کیا اور اس کے بعد مولوی صاحب نے یہ کہا کہ الٰہی عاقبت بخیر' لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ ''یا اللہ ساہڈی عاقبت بخیر ہو جائے''۔ اس دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہاں یہ کہتا ہے **اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا** (12:109)۔

لفظ عاقبۃ کا لغوی، قرآنی مفہوم وہ نتیجہ وہ ذنب ہے جو جانور کی دم اُس کے ساتھ پیچھے چمٹی رہتی ہے

کیا یہ اس دنیا کے اندر چلے پھرے نہیں ہیں، کیا انہوں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ (12:109) ان سے پہلی قومیں جو گذر گئی ہیں ان کی عاقبت کیسی ہوئی۔ ''یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا (12:109) اپنی آنکھوں سے دیکھو'' وہ عاقبت تو نہ اس ارض پہ ہے نہ آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے۔ عزیزانِ من! عاقبۃ تو چیز ہی بڑی عجیب ہے، ہر عمل جو آپ کرتے ہیں، وہ پہلے عمل کرتے ہیں اور جیسے قرآن کہتا ہے کہ یہ کر کے وہ چلا جاتا ہے اور نتیجہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے ''چل ہاں بچو کتھے جانا ایں''۔ میں نے کہا تھا جسے وہ ذنب کہتا ہے جیسے یہ دُم کسی مویشی کے پیچھے چمٹی ہوئی ہوتی ہے کہ جہاں چلا جائے، وہ چمٹی ہوئی ہے، پیچھے لگی ہوئی ہے، وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ ہر کام جو انسان کرتا ہے اس کے پیچھے اس کا ایک نتیجہ آتا ہے، لگا ہوا ہے ''او جیہڑا کھرا نپدے ہیگے نیں'' یہ ہے وہ جو نتیجہ پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے۔ ان سے کہو کہ چلو پھرو اور دیکھو کہ پھر ان قوموں کے اعمال کا نتیجہ کیا ہوا۔ تو وہ ہوا جو کہا ہے کہ چلو پھرو ان ملکوں کے اندر، دوسری جگہ یہ ہے کہ تم ان کی بستیوں سے گذرتے ہو ان کے کھنڈرات پر ان کی تباہی کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ وہ تو تاریخ کو کتاب کے اندر لکھے ہوئے نوشتوں کو نہیں کہتا، وہ تو آرکیالوجی میں بھی یہ کہتا ہے کہ جاؤ کھودو ان زمینوں کو اور دیکھو ان کا انجام کیا ہوا۔ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ (12:109) اور تم دیکھو گے ان کا انجام کیا ہوا وَ لَدَارُ الۡاٰخِرَۃِ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا ؕ (12:109) اور یہ بھی تم دیکھو گے کہ مستقبل میں آخر الامر جسے آپ کہتے ہیں، وہی لوگ کہ جنہوں نے قوانینِ خداوندی کی نگہ داشت کی، ان کے حصے میں وہ چیز آئی۔ آخرت کا ترجمہ اگر FUTURE کیا جائے تو آپ دیکھئے یہ قوم کہاں پہنچ جائے۔

زندگی کے دوران Future یعنی مستقبل اور حال کی قدر و قیمت کو پیش نظر رکھنا بڑا اہم ہے

ایک وہ شخص ہے جو مفادِ عاجلہ ہی کے پیچھے ہوتا ہے، صبح کی کھالی، شام کو مولا پھر دے گا، چلے ہوئے ہیں توکل بخدا۔ ایک وہ قوم ہے کہ جو آج اس چیز کو کھاتی ہے اور دس دن تک اس کی نگاہ جاتی ہے، پوری جنریشن تک نگاہ جاتی ہے، نسلوں تک اس کی نگاہ جاتی ہے یہ ہے اس قوم کا مستقبل۔ مستقبل کو دیکھنے والی قوم جو ہے وہ ہے جس کے حصے میں درخشندگی آتی ہیں، فیوچر پہ نگاہ رکھنے والی۔ اور یہ ٹھیک ہے کہ انسانی زندگی کا فیوچر یہیں ختم نہیں ہو جاتا، زندگی تو یہاں ختم ہونے والی شے نہیں ہے، وہ تو انسان کا جسم ختم ہوتا ہے، گھوڑا راستے میں رہ جاتا ہے، گاڑی بدلنی پڑتی ہے کسی جنکشن پہ جا کے، اس کے اندر سے مسافر تو نہیں مرتا، وہ تو مستقلاً آگے چلتا ہے۔ لہٰذا جسے آخرت پر ایمان کہا گیا تھا، ہر سانس کے بعد اگلا سانس جو ہے، یہ پہلا سانس جو ہے اگلے کی آخرت ہو جاتا ہے، مستقبل کا سانس آخرت ہو جاتا ہے، کل کا دن اس کا آخرت ہو جاتا ہے، اگلا سال آخرت ہو جاتا ہے، ایک جنریشن کے بعد دوسری جنریشن آخرت ہو جاتی ہے۔ اور اسی

طرح سے چلتے ہوئے انسان کی اس زندگی کے ساتھ آگے جب یہ باڑھ سی ذرا سی گزر کے صحنِ چمن میں داخل ہو جاتی ہے' ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے' وہ بھی آخرت ہوتی ہے۔ جس قوم کو وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) پہلے قرآن کی آیت کے اندر یہ آیا ہے یہ قوم ہے جو دنیا کے اندر سربلند ہوگی وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) پہ مستقبل کے اوپر نگاہ رکھنے والی۔ آج ہم ہر ایک سے کہتے ہیں کہ صاحب! اس کا فیوچر کیسا ہوگا' یہی ترجمہ ہے آخرت کا۔ اور یہ جو میں کہہ رہا ہوں وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ (12:109) اس کے بعد ہے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (12:109) کیا یہ عقل وفکر سے کام لے کے بات نہیں سمجھتے۔ وہ جو آخرت ہے اس کے متعلق تو یہاں ہم یہ چیز نہ دیکھ سکتے ہیں نہ ہم اس کے اس شکل کو یوں سمجھتے ہیں' اس کے لئے دلائل ہیں۔ تو ضروری تھا کہ جہاں ایک طرف ان قوموں کا انجام بتایا' عاقبت بتائی کہ جنہوں نے ان قوانین کی خلاف ورزی کی' ساتھ ہی ان قوموں کا انجام بھی بتایا جاتا کہ جو اس کے مطابق چلے۔ تو وہ اگر یہاں دکھائی دینا تھا تو یہ بھی تو یہیں دکھائی دینا چاہئے تھا۔ اور پھر اس کے بعد میں نے کہا ہے کہ اُس آخرت کا میں منکر نہیں ہوں' نہ کوئی ہو سکتا ہے۔ وہ تو ہمارا ایمان ہے لیکن آخرت یا فیوچر وہی نہیں ہے یہاں ہر آنے والا دن جو ہے وہ آخرت کا دن ہے۔ اور کیا بات ہے صاحب! جو حدیث صحیح ہوتی ہے چمک اٹھتی ہوئی ہے وہ پڑی ہوئی جو بینر کے اوپر میں نے اسی لئے لکھ کے لگا دیا ہے۔

وقت کی قدر و منزلت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان اور ہماری پس ماندگی کی وجہ جواز

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دو دن ایک جیسے گذر جائیں یعنی اس کا آج گذشتہ کل سے زیادہ فروغاں نہ ہو۔ جس کے دو دن ایک جیسے گذر جائیں' وہ تباہ ہو گیا۔ وہ تو اسے فیوچر قرار دے رہے ہیں کل کے مقابلے میں آج فیوچر' اگر یہ آج بھی کل ہی جیسا ہے تو انسان جامد ہو گیا' متحرک نہ رہا۔ زندگی تو حرکت چاہتی ہے۔ یعنی ایک تو یہ ہے کہ وہ چیز کہ اس کے دل سے پوچھئے اس کے جگر سے پوچھئے' کس کے جگر سے؟ آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دور ہو ''بیٹھی پیریں تُرن لگ پیا''۔ یہ ہیں ہم۔ جہاں آپ مسلمان کی مجلس میں بیٹھیں گے' ماضی کا قصہ دہراتے چلے جائیں گے ''مسلمانوں نے یہ کیا' اور صدرِ اول میں یہ ہوا اور انہوں نے یہ کیا اور انہوں نے یہ کیا''۔ اور اس کے بعد پھر وہ ایک ان کے ہاں حدیث بنی ہوئی ہے' روایت بنا دی ہے انہوں نے کہا ہوا یہ ہے کہ سب سے بہتر زمانہ میرا ہے اس کے بعد پھر بدتر پھر بدتر پھر بدتر۔ اسی قوم کا یہ ہوا بدتر۔

فیوچر کی قدر و منزلت کو سمجھنے والی قوموں کا تابناک حال

معاف رکھئے گا یہ نہ ماننے والی قومیں جو تھیں ان کا تو ہر نیا سورج پہلے سے زیادہ درخشندہ ہوتا ہے۔ وہ تو دیکھتے ہی یہ ہیں کہ فیوچر کیسا ہے' ان کے ہاں فیوچر کی پلاننگ ہوتی ہے۔ وہ تو انسانیت کی بدبختی ہے کہ ان کم بختوں نے فیوچر اسی زندگی کو' جسم کے فیوچر کو فیوچر مان

لیا ورنہ اگر ذرا سی بات کوئی ان کے سامنے مقامِ کبریا رکھنے والا ہوتا اور ان کو بتانے والا آج ہوتا کہ فیوچر یہی نہیں ہے آگے چلنے والی بات ہے' پوچھئے نہیں آج انسانیت کہاں ہوتی۔ وہ فیوچر پہ ایمان رکھنے والے ہیں۔ تو دونوں چیزیں یہاں گنا دیں' کہا یہ چلے پھرے نہیں انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں کہ وہ اقوام جنہوں نے اس قانون کی' اس نظام کی خلاف ورزی کی' ان کا انجام کیا ہوا اور جو اس کے مطابق چلے ان کا مستقبل کیسا ہوا **اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (12:109) کیا یہ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ میں نے کہا تھا کہ مذہب کی سٹیج سے قرآن بات کر رہا ہے **اَدْعُوْا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ** (12:109) عاقبت اور آخرت کے الفاظ یہاں آئے ہوئے ہیں اور کہتا ہے **اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (12:109)۔ **اَفَلَا تُؤْمِنُوْنَ** نہیں کہا ان معنوں میں جن میں یہ کہتے ہیں کہ کیا اس میں ان کو BELEIF نہیں ہے۔ **اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (12:109) یہ تو عقل وفکر کی بات ہے۔

زندگی کے بعد آنے والے دور یعنی جہاں فردا کی زندگی کے خدوخال کا ادراک یہاں نہیں کیا جا سکتا

یہ ٹھیک ہے بعد کی زندگی کے متعلق وہ دلائل دیتا ہے' دلائل کی بنا پہ منواتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ وہ زندگی کیسی ہے یہ تو تم آج نہیں سمجھ سکتے۔ رحمِ مادر میں بچہ' ہزار افلاطون کیوں نہ اس کو وہاں سمجھائیں اس کے ذہن میں آ نہیں سکتا کہ ایک قدم کے اوپر باہر دنیا کیسی ہے۔ ذرا سی تو اوٹ ہوتی ہے' یہ ہم ایک بڑے سے مہیب ایک رحم کے اندر ہیں' یہاں اس کائنات میں' ایک نشاطِ ثانیہ ہے اس کے بعد کی' ایک نئی پیدائش ہے اس کے بعد کی۔ وہ تو اس خارجی دنیا میں آتے ہی جب بچہ یوں آنکھ کھولتا ہے کہ نظر آ جاتا ہے کہ کیا ہے' اس سے تو پہلے تو صاحب! یہ بات نہیں آتی۔ وہ کنہ وحقیقت کیسی ہے یہ نہیں سمجھ میں آتی' ہے وہ ضرور یہ قرآن سمجھا دیتا ہے اور اسی لئے اس نے اس زندگی کے متعلق بھی **اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ** (6:50) بھی کہا ہے **اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (12:109) بھی کہا ہے۔ عقل وفکر سے یہ سمجھایا جا سکتا ہے کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی' آگے چلتی ہے۔ اور اب تو یہ لوگ بھی اس کے اوپر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ لیکن میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں یہ زندگی آخرت اور عاقبت کے الفاظ **اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (12:109) لیکن یہ جو چیز بتائی گئی کہ نہ ماننے والوں کا انجام یہ ہوا' ماننے والوں کا مستقبل یہ ہوا' کہا کہ یہ پھر یونہی نہیں ہو گیا' بڑا سخت ٹکراؤ ہوتا ہے۔ حق اور باطل کا ٹکراؤ تو پہلے دن سے چلا آ رہا ہے ایک ESTABLISHED SYSTEM جو جا رہا ہو اس کو اکھیڑنا' درہم برہم کرنا' اس کی جگہ ایک نیا نظام قائم کرنا۔ وہ جن کا وہ نظام ہوتا ہے وہ آسانی سے تو اس کو اکھیڑنے نہیں دیتے تھے یہی ہے جس کو کشمکشِ حق وباطل کہتے ہیں۔ مفاد پرست گروہ' ان کے اتنے مفادات چھن رہے ہوتے ہیں' باقی کچھ نہیں رہتا ان کے پاس۔ پورا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ یہ جو رسول آتا ہے' پیغامبر آتا ہے' انقلاب جس نے لانا ہوتا ہے' یہ پیغام دیتا چلا جاتا ہے۔

رسول کا کام صرف پیغام پہنچانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے مطابق ایک معاشرے کی تشکیل کرنا بھی ہوتا ہے

عزیزانِ من! پہلی چیز اس کی یہ ہوتی ہے' یہ رسول صرف پیغام ہی نہیں دیتا یہ چٹھی رسان صرف نہیں ہوتا' پیغام پہنچانے کے بعد اس

پیغام کے مطابق اس نے ایک نظام متشکل کرنا ہوتا ہے اور نظام کی تشکیل کی خشتِ اول یہ ہے کہ ایک جماعت بنانی ہوتی ہے جو اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ یہ ہے جماعتِ مؤمنین جسے کہا ہے اور اس کے بغیر تو کوئی نظام' کوئی انقلاب آ نہیں سکتا' کوئی نظام قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ جب تک ایک ایسی جماعت نہ ہو کہ جو ایمان رکھتی ہے (ایمان قرآن کے معنوں میں) CONVINCED ہو اس کی صداقت پر۔ یہ جماعت وہ بناتا ہے وہ رسول لیکن اس کے راستے میں بڑی مشکلات ہوتی ہیں۔ جماعت آسمان سے تو لاتا نہیں' فرشتوں کی جماعت ہونی ہوتی تو پہلے ہی دن اس کے ساتھ لاکھوں کروڑوں ہوتے۔ وہ تو قرآن بتا رہا ہے کہ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ (33:43) اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ(33:56) وہ کہتا ہے خدا کے فرستادگان یا ملائکہ اور خود خدا اس رسول پر اور اس جماعت پر تحسین وتبریک کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

خدا کے نبی کو جماعت کی تشکیل کے لیے گروہ کے اندر سے بہترین انسانوں کا چناؤ کرنا ہوتا ہے

فرشتے تو اس طرح سے ان کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن اس نے تو انسانوں میں سے جماعت بنانی ہوتی ہے۔ اور انسان جو مخاطب ہوتے ہیں وہ سارے اس مفاد پرست گروہ کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے چن چن کے اپنے ساتھ ملانا کوئی آسان کام ہے!! یعنی ابوجہل اور عمرؓ جو ہیں ان میں سے چن کے کسی طرح سے اپنے ساتھ کسی کو ملا لینا۔ عمرؓ کو ملانے میں آپ سمجھتے ہیں کہ کتنی دقت پیش آئی ہوگی' ابوجہل نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ کہا یہ کیفیت ہو جاتی تھی' عرصہ اتنا لمبا ہو جاتا تھا کہ اس کشمکش میں پڑے رہتے ہیں۔

خدا کا نبی تو کسی شکل میں مایوس نہیں ہوتا لیکن ہمارے ہاں کی تفسیریں تو اور ہی کچھ کہتیں ہیں (معاذ اللہ)

حَتّٰٓی اِذَا اسْتَایْئَسَ الرُّسُلُ (12:110) پھر وہ بات آ گئی کہ جس کی تشریح میں میں نے کہا ہے کہ کبھی کبھی تو جگر شق ہو جاتا ہے۔ حَتّٰٓی اِذَا اسْتَایْئَسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ کُذِبُوْا(12:110) عام اس کا ترجمہ اور تفسیر جو جی میں آئے آپ اٹھا کے دیکھیں کہا یہ جاتا ہے کہ تآ نکہ رسول بھی مایوس ہو گئے وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ کُذِبُوْا (12:110) اور خیال کرنے لگ گئے کہ ان کے ساتھ خدا نے شاید (معاذ اللہ) جھوٹ ہی بولا تھا۔ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ (58:21) جو قرآن نے کہہ دیا ہے وہ یاد رکھو! ہم اور ہمارے رسول غالب آ کے رہیں گے۔ یہ کہا جاتا ہے اس کے لئے۔ پہلے یہ چیز کہی پھر اس کے بعد جو اس میں پھنس گئے' الجھ گئے کہ نکلنے کا راستہ نہ ہوا کہ صاحب! یہ کیا بات ہوگئی کہ وہ رسولوں کے متعلق یہ ذہن میں چیز لانا کہ صاحب! وہ یہ سمجھنے لگ گئے کہ صاحب! ہمارے ساتھ بھی خدا نے (میں عرض کر رہا ہوں کہ زبان زیب نہیں دیتی کہ لفظ سامنے لایا جائے)۔ تفسیریں اٹھا کے پڑھئے۔ اصل میں راستہ پھر کیا ان کا نکلتا ہے؟ کہ صاحب! دوسری قراءت میں یوں آیا ہے۔ یا اللہ!

اختلاف قرأت کے سلسلہ میں کی گئی سازش نے تو پوری قرآنی تعلیم کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے

عزیزانِ من! یہ جو اختلافِ قراءت والا آپ کے ہاں عقیدہ ہے' ایسی بڑی سازش ہے قرآن کے خلاف کہ بڑی سے بڑی دشمن کافر قوم بھی یہ کچھ نہ کر سکتی جو اس عقیدے نے آپ کے ساتھ کیا ہے۔ آپ نے نہ پڑھا ہو تو ضرور پڑھ لیجئے' جولائی کے پرچے میں اختلافِ قرآت پر مضمون' طلوعِ اسلام میں جو میرا شائع ہوا ہے' آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ لفظ ایسا رکھا ہوا ہے جس سے یہ نظر آتا ہے کہ جیسے وہ قاری آتے ہیں' یہ حجاز کے قاری ہیں' یہ مصر کے قاری ہیں ان کا اندازِ قراءت اور ہوتا ہے اُن کا اور ہوتا ہے تو گویا وہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے کا کچھ طریقہ اور ہوتا ہے اور ان کو پتہ نہیں ہے جسے یہ قراءت کا اختلاف ان کا بھی جو وہاں سے آتے ہیں وہ ہوتا یہ ہے کہ یہ دو راگ ہوتے ہیں۔ یہ حجاز والے جو ہیں وہ بھیروں کے اندر قرآن کو (میں تو پڑھتا ہی کہوں گا' لفظ ساتھ کچھ اور آنا چاہئے) پڑھتے ہیں اور یہ مصر والے جو ہیں وہ دوسرا ایک راگ بھیرویں ہوتا ہے۔ راگ ان کے ہاں حرام ہوتا ہے اور راگ میں یہ قراءتیں سن سن کے سبحان اللہ کرتے چلے جاتے ہیں۔

کیا قرآن حکیم حضرت عثمان نے جمع کیا تھا؟ یا نبی اکرم ﷺ نے

بہرحال! قراءت کے معنی تو' یہی قاری کے معنی تو' یہی ہوتا ہے کہ کوئی چیز ''پنجابی اچ اینوں کندے نے اوونچ'' کہ یہ کس انداز سے قرآن پڑھتا ہے' یہ کس انداز سے قرآن پڑھتا ہے۔ یہ آپ کے ہاں عقیدہ ہے: بے شمار آیتیں ہیں میں نے وہ گنائی ہیں قریباً دو ہزار کے قریب' جن میں یہ مانا جاتا ہے کہ یہ جو قرآن ہمارے پاس مروج چلا آ رہا ہے اس میں یہ اور طرح ہیں اور وہ صحابہؓ کے پاس اپنے اپنے نسخے تھے اس نے کہا تھا کہ نہیں! یہ آیت ہی یوں نازل ہوئی تھی۔ او یا میرے اللہ!! اسے کہا جاتا ہے اختلافِ قراءت کہ یوں بھی آئی ہے اور یوں بھی آئی ہے۔ اور یہ جو یوں اور یوں ہے اس میں معنوں میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ یوں بھی آئی ہے' قراءتِ حضرتِ ابنِ عباسؓ میں یوں آیا ہے یعنی وہ حضرتِ عثمان کے زمانے میں موجود تھے یا جب بھی ان کی تاریخ کے مطابق قرآن کو جمع کیا گیا یہ تو سارا قصہ ہی غلط ہے۔ عزیزانِ من! قرآن تو رسول اللہ ﷺ نے خود جمع' مدون' مرتب فرما کر اسی شکل کے اندر امت کو دیا تھا۔

قراءت میں اختلاف پر ایک دل خراش کہانی کی تفصیل

لیکن بہرحال جب بھی یہ کہتے ہیں یہ ہوا تھا اس زمانے میں یہ سارے صحابہؓ موجود تھے اور ان کے متعلق یہ چیز آپ کی روایات میں ہے کہ ان کے پاس اپنے اپنے الگ الگ صحیفے تھے: صحیفۂ ابنِ عباس' صحیفۂ ابنِ مسعود اور ان میں یہ آیتیں یوں لکھی تھیں اور ان کی ساتھ روایتیں دی ہوئی ہیں کہ حضرتِ ابنِ عباسؓ وہ اس آیت کو یوں پڑھتے تھے۔ اس میں آپ دیکھئے گا مثال بھی اس کی جو میں نے دی

ہے یہی جو قرآن کی آیت ہے کہ اس کے بعد متعہ کرلیا کرو ایک مہر دے کر' یہ تو ہے آپ کے ہاں یہ قرآن میں موجود ہے اور نکاح تو آپ کے ہاں معلوم ہے کہ ایک معاہدہ ہے ازدواجی زندگی بسر کرنے کا' وہ اس کے بعد موت سے یا طلاق سے ٹوٹتا ہے' فسق ہوتا ہے۔ ایک ہمارے ہاں طریق ہے شیعہ حضرات کے ہاں۔ آپ کو معلوم ہے میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں' کسی فرقے پہ میں تنقید نہیں کرتا۔ ایک مسلک امرِ واقعہ ہے کہ وہ عرض کرتا ہوں۔ ان کے ہاں یہ ہے کہ وہ ایک مدتِ معینہ کے لئے یہ معاملہ طے کرلیا جاتا ہے' اسے متعہ کہا جاتا ہے مدتِ معینہ کے لئے۔ ان کے ہاں یہ بھی عقیدہ ہے کہ یہ آیت جو نازل ہوئی تھی اس میں یہ الفاظ تھے کہ تم ان کے ساتھ نکاح کرو اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط (14:10) ایک مدت مقرر کر کے اس کے لئے۔ اس پہ ہے بنیاد ان کی۔ سنی جو ہیں انہوں نے تو فوراً ان کے ذمے اعتراض جڑ دیا کہ صاحب! قرآن کو محرف مانتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی۔ ٹھیک ہے الکافی میں ہے کہ یہ یوں نازل ہوئی تھی۔ آپ کو معلوم ہے! کہ آپ کے ہاں حضرتِ ابنِ عباس کی یہ قراءت ہے کہ یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط (14:10)۔ حضرتِ ابنِ عباسؓ تو یہ سنیوں کے حضرت ہیں شیعوں کے تو نہیں۔ طبری تفسیر لکھتا ہے اور اس میں اس آیت کے نیچے یہ لکھتا ہے کہ ایک تو قرآت یہ ہے جس میں یہ الفاظ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط (14:10) نہیں ہیں اور وہ ہمارے ہاں اس قرآن میں ہیں۔ وہ لکھتا ہے لیکن حضرتِ ابنِ عباسؓ کی ایک قرآت ہے جس کے اندر یہ لکھا ہے اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط (14:10)۔ میں نے بتایا ہے یہ اختلافِ قراءت کے معنی کیا ہیں۔ وہ اول تو میں ابھی عرض کروں گا۔ یہ زیر زبر سے بھی قرآن میں کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ وہ آیت کے اندر ایک ٹکڑا ہے جس ٹکڑے سے نکاح اور متعہ کا فرق سامنے آ جاتا ہے' قرآن کی رو سے متعہ کی سند مل جاتی ہے۔ حضرتِ ابنِ عباسؓ کی یہ قرآت ہے اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط (14:10)۔ اس کے بعد وہ طبری صاحب اس کے نیچے روایت لکھتے ہیں کہ ایک صحابیؓ دوسرے جو تھے وہ حضرتِ ابنِ عباسؓ کے پاس گئے انہوںؓ نے اس آیت کو پڑھا تو انہوںؓ نے کہا کہ نہ نہ! اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط (14:10) ساتھ پڑھو۔ انہوںؓ نے کہا کہ صاحب! ہمارے قرآن میں تو یہ نہیں ہے! کہنے لگے کیا کہتے ہو! میں جو تمہیں کہتا ہوں کہ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط (14:10)۔ اس نے کہا جی! کیا یہ سب تو حضرتِ ابنِ عباسؓ نے لکھا یہ ہے وہاں کہ خدا کی قسم تین دفعہ کھائی کہا کہ خدا کی قسم یہ آیت اس طرح ہی نازل ہوئی تھی جیسے میں کہہ رہا ہوں۔

آج بھی ہمارے ہاں قرآن حکیم کی تفسیروں کی یہی صورت ہے

آج بھی آپ کے ہاں یعنی آپ کہیں گے کہ وضعی روایتیں ہیں' یہ اس زمانے کی بات ہے' گذر گیا وضعی تھیں ختم ہوئیں' اب تو مسلمہ قرآن ہمارے پاس ہے۔ قرآن میں آپ دیکھیں گے جہاں تفسیریں آپ کے ہاں آئیں گی وہاں اس آیت کو لکھا ہوا پہلے تو جیسے اس

قرآن میں ہے اس کے نیچے لکھا ہوگا قراءتِ حضرتِ ابنِ عباسؓ میں یوں آیا ہے۔ کیا سن رہے ہیں آپ آج ان روایات کی۔ بنا دو پرویزؒ کو کافر' ان چیزوں کو کہاں لے جاؤ گے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ پھر کہاں کہاں یہ آ جاتی ہے' ہمارے ہاں یہ شیعہ سنی کے ہاں ایک اختلاف وضو میں ہے' سنی پاؤں کو دھوتے ہیں' شیعہ اس کو مسح کرتے ہیں۔ وضو کی آیت کے اندر ایک لفظ ہے اَرْجُلَكُمْ(5:6) یہ 'لَ' کے اوپر زبر ہے' وہ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ جسے زیر زبر کا فرق کہتے ہیں یہ فرق عربی زبان میں بنیادی معنی بدل دیتا ہے۔ اس زبان کا بڑا انحصار ان چیزوں پہ ہے جسے اعراب کہتے ہیں۔ یہ اس آیت کے اندر جس طرح سے یہ لفظ ہے 'لَ' کے زبر سے پڑھ لیا جائے تو یہ پھر وہ پاؤں کے دھونے کے معنی میں آتا ہے زیر سے پڑھ لیا جائے پاؤں کے مسح کرنے کے معنوں میں آتا ہے' 'لِ' کے زیر کے ساتھ پڑھ لیجئے اس کو تو وہ اس میں اس CONTEXT کے اندر مسح کرنا ہے۔ اور یہ چیز دونوں کے اندر چلی آ رہی ہے بڑا فرق چلا آ رہا ہے۔ شیعہ نہیں۔

پاؤں کے مسح کرنے اور پاؤں کے دھونے کا عمل یہ دونوں قراءتیں مستند ہیں اور متواتر چلی آ رہی ہیں (سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا فتویٰ)

آپ کے ہاں کے جید مفسر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے یہ پوچھا گیا کہ یہ صاحب! یہ فرق جو ہے یہ پاؤں دھونے کا اور پاؤں کے مسح کرنے کا' آپ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں ٹھیک ہے قرآن میں اگر اَرْجُلَكُمْ (5:6) ہو تو وہ ٹھیک ہے اس سے تو پاؤں دھونا ہوتا ہے اَرْجُلِكُمْ (5:6) ہو تو اس میں مسح کرنا آتا ہے۔ تو قرآن میں تو وہ اَرْجُلَكُمْ(5:6) ہی ہے جو ہم قرآن پڑھتے ہیں۔ اب یہ لکھتے ہیں کہ صاحب! یہ اَرْجُلَكُمْ (5:6) اور اَرْجُلِكُمْ (5:6) دونوں قراءتیں متواتر چلی آتی ہیں۔ اچھا جی! ان دونوں میں آپ بتا دیجئے کہ یہ غلط ہے یہ اس میں صحیح بات ہے' سیدھی سی بات ہے جو اس قرآن میں ہے۔ کہتے ہیں دونوں اس طرح اس قدر مستند ہیں اور متواتر ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے ایک ضعیف ہے اور دوسری جوان ہے' دونوں برابر چلی آ رہی ہیں۔ فرق دونوں میں اتنا ہے کہ ایک سے یہ معنی بنتے ہیں' دوسرے میں اس سے بالکل مختلف معنی ہیں۔ دونوں چلی آ رہی ہیں۔ یہ چلی آ رہی ہیں کیا ہوتا ہے جی؟ قرآنِ کریم کو خدا نے نازل کیا خدا کے رسول ﷺ نے امت کو دیا' قرآن خدا کی طرف سے بلفظہٖ نازل ہوا تو اور یجن ان کا جو آپ کہیں گے ابتداً وہ چلی آ رہیں تو بعد کی بات ہے جہاں سے انہوں نے سٹارٹ کیا ان دونوں قراءتوں نے وہ تو خدا کی وحی ہے تو گویا خدا نے دونوں طرح سے نازل کیا۔ سوچئے! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم' خدا نے رسول ﷺ کو دیا' رسول اللہ ﷺ نے امت کو دیا تو اگر اور یجن پھر یہاں مان لیا جائے جیسا رسول اللہ ﷺ نے دیا تو پھر یہ 'لُ' کے زبر سے بھی دیا زیر کے ساتھ بھی دیا یہ کہہ کے دیا کہ خدا کی وحی ہے۔ دونوں طرح کی وحی ہے!!

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوئی اختلافی بات نہیں

قرآن اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دیتا ہے کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (4:82) کہ اس میں تم بہت اختلاف پاتے اور یہ اختلاف وہ ہے جس کے متعلق یہ مانا جا رہا ہے کہ بہرحال (معاذ اللہ معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ اپنی طرف سے تو یہ نہیں کر سکتے تھے کہ کسی کو زبر کے ساتھ کہہ دیتے' دوسرے کو کہتے کہ تم زیر کے ساتھ ہی پڑھ لیا کرو۔ خدا نے رسول ﷺ کی طرف یہ وحی بھیجی آپ دیکھئے گا جو کہا جاتا ہے کہ صاحب! دونوں قراءتیں ایسی مستند اور ہیں بھی متواتر' یہ کیا چیز ہوئی' کہاں سے یہ دو قراءتیں چلیں؟ آج کی تفسیر میں بھی یہ لکھا جا رہا ہے کہ یہ چلی آ رہی ہیں اور یہ تو پھر اس میں مشکل ہے۔ جب آپ مانتے ہیں کہ دونوں یکساں سند کے ساتھ چلی آ رہی ہیں تو مشکل کیا کہتے ہو' ایک کا انکار کفر ہو جائے گا' آپ وحی کا انکار کرتے ہوا گر دونوں وحی ہیں۔ اب یہاں تک تو وہ آ گئے گاندھی جی بھی خوش رہیں اور راضی رہے سرکار۔ اب خود جو ہیں پاؤں دھونے والوں میں ہوئے' کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہمیں پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ عمل کیا تھا رسول اللہ ﷺ کا' صحابہؓ کا' پھر اس کے بعد امت کے امامِ اعظم کا۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایک پہلی شکل معقول ہے تو پھر دوسری کیا ہے؟

یہ الفاظ دیکھئے یعنی وہیں دونوں قرآتیں موجود ہیں رسول اللہ ﷺ بھی پاؤں دھونے والی قرآت جو ہے اس کے مطابق عمل کر رہے ہیں زبر والی پہ' صحابہؓ بھی ان کے بقول اس پہ عمل کر رہے ہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ معقول بھی یہی بات نظر آتی ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ) دوسری جو ہے تو یہ تو نامعقول نظر آتی ہے۔ معقول بھی یہی نظر آتی ہے کہ پاؤں دھونے والی یہ قراءت ہو اس لئے یہ دھونا جو ہے یہی ہم سب کرتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا ان میں سے جو ہزاروں ان کے اپنے معتقدین ہیں کہ صاحب! ٹھیک ہے اَرْجُلَكُمْ (5:6) والی کے حق میں آپ نے یہ رائے دیدی' پہلے کہہ رہے تھے کہ فیصلہ کرنا مشکل ہے' جب یہ دونوں مستند ہیں' متواتر ہیں وہیں سے اکٹھی چلی آئی ہیں تو وہاں والے کو تو زبر والے کو تو آپ نے کہہ دیا کہ اس پہ عمل بھی ہو رہا ہے رسول اللہ ﷺ نے بھی عمل کیا صحابہؓ نے بھی' وہ زیر والی جو تھی پھر وہ کہاں گئی جو خدا نے نازل کی ہوئی تھی۔ عزیزانِ من! کچھ سن بھی رہے ہیں! سن تو آپ اتنا ہی رہے ہیں کہ صاحب! یہ پرویزؒ منکرِ حدیث ہے' کافر ہے۔ یہ کچھ بھی کبھی آپ نے سنا ہے جو میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ یہ کچھ ان کے ہاں لکھا ہوا موجود ہے اور کوئی شخص ان سے پوچھتا نہیں ہے کہ بندۂ خدا یہ بتاؤ دوسری قراءت کا پھر کیا ہوا۔ اسے کہتے ہیں اختلافِ قراءت۔ دیکھتے ہیں کتنی بڑی سازش ہے۔

خدا تعالیٰ کی یہ نازل کردہ کتاب تو یقینی طور پر ہر قسم کے تضاد سے پاک اور غیر متبدل عالم گیر اصولوں پر مبنی ہے

عزیزانِ من! اسلام کے دینِ قیم، دینِ احسن، مکمل، غیر متبدل دین ہونے کی ایک ہی سند ہے کہ خدا کی یہ کتاب جس طرح خدا نے وحی کی، جس جس حرف کے ساتھ، جس جس اعراب کے ساتھ، بعینہٖ اسی طرح سے آج ہمارے پاس یہ موجود ہے، دلیل اس کی خدا کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اس میں اگر ذرا سا بھی شبہ گذر جائے کہ یہ قرآن جو ہے وہ نہیں ہے، خواہ ایک زیر زبر کا شبہ کیوں نہ گذر جائے، قرآن تورات اور انجیل کی سطح پہ آ گیا۔ ان کتابوں کے متعلق ہمیں پہلے ایمان لانا پڑتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ اور اتنا ہی ایمان لانا پڑتا ہے اس کے بعد یہ چیز کہ یہ ایسی نہیں کہ آج ان کے اوپر ہم عمل کریں کیونکہ ان میں تو تحریف ہوگئی ہے، تبدیلی ہوگئی ہے۔ اگر قرآن کے متعلق بھی۔

قرآن حکیم کے کسی ایک لفظ کی تبدیلی سے پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے

اگر قرآن کے متعلق بھی یہ چیز آ جائے کہ خواہ ایک لفظ کے متعلق ہی آپ کے ذہن میں ہو، امکان ہو جائے اس میں کسی تبدیلی کے ماننے کا تو کس کے متعلق آپ کہیں گے کہ وہ ہے کہ نہیں ہے۔ دین کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں وہ چلی آ رہی ہے کہ یہ قراءت بھی ہے یہ قراءت بھی ہے۔

قراءتوں کی کتاب المصاحف پر تھامس جعفری کا تبصرہ

کتنی بڑی کتاب ہے کتاب المصاحف، یہ تو مصحف ہے ایک قرآن، قرآنوں کی کتاب۔ بہت بڑے محدث ہیں آپ کے ہاں کے ابوداؤد، ان کے بیٹے ہیں وہ بھی بہت بڑے محدث ہیں ان کی جمع کردہ ہے یہ۔ اس میں انہوں نے یہ ساری کتابیں پھر مصاحف جو ہیں وہ سارے اس کے اندر دئے ہیں۔ اور پھر مستشرقین کو تو خدا دے صاحب! وہ کتاب تو بہت مشکل سے کمیاب تھی۔ پتہ ہے اس کے لئے کون اٹھا ہے؟ تھامس جعفری ایک بہت بڑا اور بنٹلسٹ ہے اس نے آدھی عمر صرف کر دی ان کتابوں کو حاصل کرنے میں۔ اور وہ لوگ تو ایسے نہیں ہے، جو دوسرے لوگ وہ بڑھتے ہیں ایک نسخے پہ اکتفا نہیں کرتے، اس نے دو تین ڈھونڈے ان کو COMPARE کیا اور اس کے بعد اس نے اپنے اہتمام سے اس کتاب کو شائع کیا، ساتھ اس کا انگریزی کے اندر TRANSLATION بھی شائع کیا اور اس پہ ایک بہت بڑا خلاصہ بھی لکھا اور یہ کہا کہ میں اور یجنل کتاب اس لئے شائع کر رہا ہوں کہ اگر میں نے یہی اپنا ترجمہ شائع کیا تو فوراً کہہ دیا جائے گا کہ نہیں صاحب! یہ لوگ تو سازشی ہیں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف تو ان کے دل میں ابدی بغض اور نفرت بھری ہوئی

ہے' میں نے اوریجنل کتاب آپ کے پاس شائع کردی ہے آپ دیکھ لیجئے۔ جواب اس کا۔

اس قسم کی عجمی سازشوں نے تو مسلمانوں کی قرآنی تعلیم کے روشن چہرے کو داغ دار کردیا ہے

ابنِ داؤد کی اس جمع کرنے والی چیز کا یا کچھ اور کرنے والی چیز کا جواب کیا ہے؟ ایک لفظ جواب ہے صاحب! کہ یہ تمام روایات جس میں اختلافِ قراءت آپ بتا رہے ہیں' یہ ساری عجم کی سازش ہے اور وضعی ہیں' خدا کا کلام' خدا نے حفاظت کا ذمہ لیا ہے' اس میں زیر زبر کا کہیں فرق نہیں ہے قیامت تک کے لئے۔ لیکن یہ کہنے والا منکرِ حدیث ہو جاتا ہے۔ عزیزانِ من! اس کا نام انکارِ حدیث ہے کہ جی! یہ صاحب دو حدیثوں کا انکار کرتے ہیں' یعنی پوری کی پوری وہ کتاب المصاحف ساری بھری ہوئی ہے۔ ٹھیک ہے جی مانتے جایئے۔ اس کتابِ عظیم کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کتاب کے ساتھ کیا ہونا تھا' وہ تو علمِ خداوندی ہے۔ یعنی یہ چیز ناممکن ہے لیکن میں بفرضِ محال کہتا ہوں کہ قرآن نہ بھی رہے' خدا اور اس کی کائنات کا کچھ نہیں بگڑتا' انسانوں کا بگڑتا ہے۔ سورج نہ رہے تو خدا کی دنیا میں تو اندھیر نہیں آ جاتا' انسانوں کی دنیا میں اندھیر ہوتا ہے۔ لیکن ہم نے کیا کیا اس کے ساتھ' کتنی بڑی سازش اس کے ساتھ ہوئی؟ اب یہ جو ماننے والے ہیں کہ صاحب! اس میں کوئی فرق نہیں ہوا' وہ ایک نسخے کے متعلق اختلافِ قراءت میں اپنی جگہ صحیح ہے' تلاوت اسی نسخے کی ہو رہی ہے کہ صاحب! اسی کو مانا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں تو یہ عقیدہ بھی ہے کہ اس کی پانچ سو آیات منسوخ ہو چکی ہیں

بہت اچھا جی! اس کو کیا مانا جاتا ہے! مانا جاتا ہے کہ اس کے اندر بہت سی آیتیں ایسی ہیں کہ جن کو پڑھا تو جاتا ہے' ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہوا ہے۔ مسلمہ عقیدہ ناسخ و منسوخ کا آپ کے ہاں چلا آ رہا ہے۔ کوئی قانون جو حکومت بنائے اور اس کے بعد اس نے اس حکم کو منسوخ کرنا ہو' اسی حکومت کی طرف سے یا جو بھی آپ کے ہاں ESTABLISH AUTHORITY ہے اس کی طرف سے ایک AMMENDMENT شائع ہوگی کہ اس حکم کا فلاں حصہ جو ہے وہ آج سے ABROGATE کیا جاتا ہے' منسوخ کیا جاتا ہے۔ وہ یہ NOTIFY کریں گے تو جب کورٹ تسلیم کرے گی کہ یہ حصہ جو ہے اب اس پہ عمل نہیں رہا۔ جب تک یہ چیز نہیں ہوگی اس کا حکم جاری رہے گا۔

ان پانچ سو منسوخ آیات کے متعلق شاہ ولی اللہ کا ردِ عمل اور پھر مولانا سندھی کا مومنانہ کردار

ان کے عقیدے کے مطابق قرآن کی قریباً پانچ سو آیتیں ایسی ہیں جو منسوخ ہوگئی ہیں اور خدا نے قرآن میں کسی ایک جگہ نہیں کہا کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ او یہ کس نے منسوخ کیا' کون ہے؟ علمائے کرام نے یہ فرمایا ہے' سلفِ صالحین نے یہ چیز کہی ہے منسوخ ہیں

پڑھی جاتی ہیں۔انہوں نے کس اتھارٹی سے فرمایا؟ سلفِ صالحین کے متعلق اتھارٹی پوچھتا ہے! آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے صاحب! اللہ اکبر اللہ اکبر! فلاں امام علیہ الرحمۃ' فلاں محدث علیہ الرحمۃ وہ ان کے متعلق پوچھتا ہے کہ اتھارٹی کیا ہے۔اوبابا! خدا کی کتاب کے متعلق پوچھتا ہوں۔انہوں نے فرمایا' فرماتے چلے گئے' اعتراض کرتے چلے گئے' تعداد کم ہوتی چلی گئی' عقیدہ اسی جگہ رہا۔پانچ سو تو پہلے دن تھیں شاہ ولی اللہ کے ہاں آ کے پانچ رہ گئیں۔عزیزانِ من! وہ بھی نظر آتا ہے دور وہ تھا ان کے عقیدے کے خلاف کچھ یوں گردن اڑ جاتی ہے۔نظر آتا ہے کہ شاہ صاحب نے بھی یہ دیکھا کہ اگر سرے سے اس عقیدے سے ہی انکار کر دیا تو وہ تو آپ جانتے ہیں کیا ہوگا۔انہوں نے عقیدے سے انکار نہیں کیا پانچ آیتیں وہ ایسی رکھ دیں کہ ذرا سا بھی غور کیا جائے اس میں تو نظر آ جاتا ہے کہ صاحب! اس میں وہ بات ہی نہیں ہے۔چنانچہ ان کے شاگرد مولانا سندھی نے پہلا کام ہی یہ کیا کہ ان پانچ آیتوں میں تطبیق دے کے کہا کہ صاحب! کوئی منسوخ نہیں ہے اور سندھی ہو گئے پھر منکرِ حدیث اور کافر۔اس کا اتنا حصہ منسوخ ہے جی۔

قرآنی آیات تو منسوخ ہیں لیکن ان کے پڑھنے سے دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے یا اللہ خیر!

یہ تو ہو گیا کہ آیتیں اس کے اندر موجود ہیں' پڑھی جاتی ہیں' ان کی تلاوت کی جاتی ہے' ان کا حکم منسوخ ہے۔اوبابا! جن کا حکم منسوخ ہے' تلاوت کیوں کی جاتی ہے؟ کہنے لگے صاحب! قرآن کا ایک حرف پڑھنے سے دس نیکیوں کا ثواب ہوتا ہے ''اینیاں آیتاں نہ پڑھیاں جان تے نیکیاں دا اینا ں گھاٹا پے جائے گا اوہدے وچ' ایس واسطے پڑھیاں تے ضرور جان گیاں''۔ناسخ و منسوخ کا عقیدہ' قرآن میں ہیں' حکم منسوخ ہے۔

قرآن حکیم میں آیات تو نہیں ہیں لیکن حکم ان کے مطابق ہو رہا ہے

اور پھر آگے چلئے جگر تھام لیجئے کہ یہ بھی عقیدہ ہے روایات پر کہ آیتیں ایسی بھی ہیں جو قرآن میں نہیں ہے اور ان کا حکم جاری ہے۔ ارے! یہ کیسے تم کہہ رہے ہو! یہ تو خیر ہوا کہ قرآن میں تو ہیں بہرحال قرآن کے اندر محفوظ ہیں حکم منسوخ سہی' قرآن میں نہیں ہے اور ان کا حکم جاری ہے۔

قرآن حکیم کو جمع کرنے کے سلسلہ میں پیدا ہونے والی مشکلات کا تذکرہ

قرآن جمع کرنے کی جو تاریخ آپ کے ہاں دی جاتی ہے روایات کی بنیاد پہ' اس پہ دیا یہ جاتا ہے کہ جب وہ قرآن جمع کرنے لگیں تو یہ کسی کتاب میں نہیں تھا کہیں ایک جگہ نہیں تھا' ہڈیوں پہ' ٹھیکریوں پہ' پتوں پہ' کوئی کسی کو یاد کوئی کسی کو یاد' ایک کمیٹی بنائی وہ بیٹھ گئے اور وہ پھر لوگ آتے گئے' اس نے کہا جی یہ آیت تھی' اس نے کہا میں نہیں مانتا دو گواہ لاؤ۔کب کی بات ہے؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے

زمانے کی' رسول اللہ ﷺ کی وفات کے چھ ہی مہینے بعد' جنگِ یمامہ میں کہتے ہیں کہ یہ ہوا تھا۔ جی! صحابہ کبارؓ مدینے میں بیٹھے ہوئے ہیں کمیٹی قرآن جمع کرنے پہ بٹھا رکھی ہے اور اسی زمانے میں صورت یہ ہو رہی ہے کہ یوں لوگ آتے ہیں وہ کہتا ہے یہ دو آیتیں مجھے یاد تھیں' انہوں نے کہا' دو گواہ لاؤ جناب۔ دو آیتوں کے متعلق یہ چیز ہوئی کہ یہ تو ہم پڑھتے تھے' کہنے والے حضرتِ عمرؓ کہ ہم تو پڑھتے تھے' ملتی نہیں ہیں' یہ کہتے ہیں تو دو گواہ نہیں ملتے۔ سر پیٹ لیجئے۔ تیئس سال نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے' اسی مکے اور مدینے کے اندر یہ صحابہؓ ان میں سے وہ بھی کہ جو پہلے دن اسلام لے آئے لیکن بہرحال کوئی دو سال بعد کوئی چار سال بعد کم از کم بیس سال پندرہ سال دس سال رسول اللہ ﷺ کی معیت ان کے نصیب ہے اور دن رات چرچا اس قرآن کا اور قرآن ہی تو کتاب تھی۔ اتنے جلیل القدر صحابیؓ دو آیتیں لے کے جاتے ہیں' دو گواہ نہیں ملتے۔ ایک طرف کہا یہ جاتا ہے کہ یہ ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وہ جو یمامہ جنگ ہوئی حضرتِ عمرؓ نے حضرتِ ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ اس میں قریباً ستر حافظِ قرآن شہید ہو گئے ہیں اگر یہ سلسلہ جاری رہا حفاظ کے شہید ہو جانے کا تو وہ قرآن جو ہے کہیں غیر محفوظ نہ ہو جائے' اس کو محفوظ شکل میں لکھ بھی لینا چاہئے اور بنیاد یہ ہے۔ تو گویا ایک جنگ میں اور جنگ وہاں ایٹم بم کی تو ہوا نہیں کرتی تھی جنگوں کے اندر کتنے لوگ شہید ہوتے تھے! نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں قریباً یہ غزوے اور سرایا ملا کے اسی بیاسی کے قریب ہیں' ایک ہزار کے قریب ہیں یہ ساری مخالفین کی اور ادھر مسلمانوں کی تو چھ سو کے قریب ہیں' ساری جتنی بھی جنگ کے اندر یہ کام آئے وہ جنگیں ایسی ہوتی تھیں۔ بہرحال جنگ تھی اس کے اندر کہنے لگے کہ ستر حافظ شہید ہو گئے ہیں تو آپ سوچئے کہ وہ کتنے حفاظ موجود تھے جن میں سے جنگ کے اندر جا کے بھی ستر شہید ہو گئے اور وہیں انہوں نے کہا کہ وہ جمع کر لیجئے۔ وہ جمع کرنے والی کمیٹی بیٹھی ہوئی ہے حضرتِ عمرؓ دو آیتیں لا رہے ہیں دو شاہد نہیں مل رہے۔ یہ سارے حافظ جو تھے ''اوکاہدے حافظ ہیگے سن''۔

آخری حج کے موقع پر ایک لاکھ صحابہ کی موجودگی ہے لیکن آیات کی گواہی کے لیے دوسری طرف دو شہادتوں کی تلاش ہے

ان حفاظ کے متعلق یہ بھی روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ ہر رمضان میں قرآن دہرایا کرتے تھے صحابہؓ کے ساتھ اور حضور ﷺ نے اپنے آخری رمضان شریف میں دو دفعہ قرآن کو پڑھا ہے۔ حضور ﷺ کے پیچھے ساتھ دہرانے والوں میں ہزار ہا کی تعداد ان کی ہوگی' آخری حج میں حضور ﷺ کے ساتھ ایک لاکھ صحابیؓ موجود تھے۔ دو گواہ نہیں ملتے تھے۔ کیا ہو گیا وہ! یہ قسمیں کھا رہے ہیں کہ ہم تو پڑھا کرتے تھے۔

دو قرآنی آیات بکری کھا گئی اور اور ارشاد خداوندی یہ ہے کہ ہم نے اسے مکمل کر دیا

آپ کی تاریخ میں عجیب چیزیں ہیں۔ دوسرے ایک صحابیؓ ہیں وہ کہتے ہیں تم تو کاروبار کرنے جایا کرتے تھے سوداگری کرنے کے لئے' ہم یہاں رہا کرتے تھے تمہاری بات مانیں یا ہماری بات قابلِ قبول ہوگی۔ اچھا جی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس آئے کہ یہ دو آیتیں ملتی نہیں ہیں۔ انہوںؓ نے کہا کہ بیٹا! یہ آیتیں تمہیں کہاں سے ملیں گی میں تمہیں بتاتی ہوں' یہ یہاں کھجور کے پتوں پہ لکھی ہوئی تھیں اور یہاں ہمارے ہاں چارپائی کے پاس رکھی ہوئی تھیں (قرآن کی آیتیں چارپائی کے پاس!!!)۔ رسول اللہﷺ نے وفات پائی گھر میں کہرام مچا' ہم نے صحن میں بکری باندھی ہوئی تھی اس نے رسہ تڑایا ہم تو اِدھر مصروف تھے وہ اندر گئی اور وہ پتہ کھا گئی' تو تمہیں یہ آیتیں کہاں سے اب ملیں۔ ایک آیت تو ہے کہ بڑا آدمی کسی کا دودھ پی لے تو وہ دودھ سے رشتہ حرام ہو جاتا ہے تو وہ رشتہ حرام ہو جاتا ہے' ایک تو اس سے متعلق تھی آیتِ رضاعتِ کبیر۔ اور ایک آپ کے ہاں ہے کہ زنا کی سزا سنگسار ہے پتھر سے مار دینا۔ قرآن میں تو نہیں ہے قرآن میں تو اس کی سزا دُرے ہی ہے۔ تو دوسری آیت یہ تھی جس میں یہ لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے صاحب! قرآن میں تو درج نہیں کیا جا سکتا۔ حضرتِ عمرؓ تھے وہ کہتے تھے کہ یہ چیز ہم پڑھتے تھے چنانچہ آپس میں COMPROMISE اس پہ ہوا کہ قرآن میں اسے داخل تو نہ کیا جائے کیونکہ شہادت نہیں ملتی لیکن چونکہ یہ کہتے ہیں کہ تھی' اس لئے حکم اسی کے اوپر رہے گا۔ قرآن مرتب ہو رہا ہے !!! اوبابا! کیا کیا میں سناؤں آپ لوگوں کو' کیا کیا بتاؤں آپ لوگوں کو۔ جس کتابِ عظیم پہ آپ کے ہاں کے اسلام کی بنیاد ہے' دعویٰ یہ ہے خدا کی آخری کتاب جس میں اس نے خود لکھا ہے کہ **تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (6:115) ہم نے مکمل کر دیا اپنے دین کو صدق و عدل کے ساتھ اس کتاب کے اندر' کوئی اسے تبدیل نہیں کر سکتا' کوئی اختلاف نہیں ہے قرآن کی آیتوں میں' ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں اس قرآن کی آیات کی۔ رسول اللہﷺ سے فرمایا **بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ** (5:67) جو کچھ تمہیں دیا گیا اس کو پہنچاؤ اگر نہ پہنچایا تو تم نے فریضۂ رسالت ادا نہیں کیا۔ قرآن میں یہ ہے کہ اس کے لکھنے والے اتنے معزز' مکرم ہیں۔ خود بتایا جاتا ہے کہ رسول اللہﷺ کے چھبیس کاتب تھے قرآن لکھنے والے۔ دوسری طرف یہ بھی روایتیں چلی آ رہی ہیں۔

بہرحال بات یہاں سے چلی تھی کہ اس آیت کے متعلق ایک تو یہ کہ رسول مایوس ہو گئے **وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا** (12:110) اور انہوں نے خیال کر لیا (معاذ اللہ معاذ اللہ) کہ صاحب! ہمارے ساتھ جھوٹ بولا گیا۔ جب یہ ہوا تو کہا کہ نہیں صاحب! دوسری صورت جو ہے وہ شد کے ساتھ اس کو پڑھئے۔ اس سے اور اعتراض وارد ہو گیا۔ میں اس باریکی میں نہیں جانا چاہتا کہ یہ کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک نے کہا کہ نہیں! 'ذ' کے زبر کے ساتھ۔ جو قرآت بنائی تھی اس کے اوپر ایک اور اعتراض آ پڑا۔

رسول ﷺ کے مایوس ہونے کا تصور کہاں تک صحیح ہے؟ آپ ﷺ کس معاملے میں مایوس ہوئے اور آخر آپ ﷺ کو ہجرت کیوں کرنا پڑی

بات کتنی صاف تھی کہ رسول کسی مقام سے ہجرت کیوں کرتا ہے' انہیں میں یہ اٹھتا ہے جن کے اندر یہ پیدا ہوتا ہے' پہلی مخاطب قوم وہ ہوتی ہے' کوشش کرتا ہے کہ اس کے اندر سے ایک امت کو وہ متشکل کرلے۔ اتنا لمبا عرصہ تیئیس سالہ نبوت کا عرصہ' تیرہ برس مکے کے اندر گذر گئے اور اس کے بعد جو یہ باقی رہ گئے ان کو یہ چھوڑ کے ہجرت کر کے کیوں چلا گیا؟ خدا کے حکم سے کہ اب ان کو چھوڑ دیجئے۔ وہ ان کی طرف سے مایوس ہوگیا کہ اب یہ ایمان نہیں لانے کے اس لئے اب مجھے دوسرے مقام میں جانا چاہئے جہاں میں ان لوگوں کو ساتھ لے جا کے اس نظام کو متشکل کروں دوسرا طریقِ عمل اختیار کروں' نظام وہاں قائم کروں اس نظام کے خوشگوار نتائج کو دیکھ کے کشاں کشاں چلے آئیں گے یہ لوگ۔ یہ ہے وہ مقامِ ہجرت۔ ان لوگوں کی طرف سے رسول پھر مایوس ہوتا ہے کہ اب یہ نہیں ایمان لانے کے حَتّٰـــی اِذَا اسۡتَایۡـَٔسَ الرُّسُلُ (12:110)۔ انہیں وہ کہتا چلا آ رہا تھا کہ یہ اگر تم نے نہ مانا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تو خدا کی طرف سے ایسا عذاب آئے گا ایسی تباہی آئے گی کہ یاد کرو گے اور تیرہ برس تک یہاں وہ رہ رہے ہیں ان پہ تو تباہی کوئی آئی نہیں ہے وَ ظَـنُّـوۡۤا اَنَّـهُـمۡ قَـدۡ كُـذِبُوۡا (12:110)) اور ان لوگوں نے یہ خیال کرلیا کہ ہم سے یہ جھوٹ ہی کہتا چلا جار ہا تھا کہ تباہی آئے گی تباہی آئے گی' تباہی آ ہی نہیں رہی۔ جَـآءَ هُـمۡ نَصۡرُنَـا(12:110) اور اس کے ساتھ خدا کی نصرت آ گئی۔ یہ آیت سامنے پڑی ہے وہی الفاظ ہیں کتنی صاف ہے' دونوں چیزیں بیک وقت ہوتی تھیں۔ متعدد مقامات میں یہ چیز ہے کہ وہ آ کے کہتے ہیں کہ لاؤ وہ تباہی جس کا تم کہتے تھے' ہم کو ڈراتے چلے آئے اور دھمکاتے چلے آئے' اتنا عرصہ گذر گیا تیرہ سال ہوگئے صاحب! یہاں بھی۔ باقی انبیاء کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا! لاؤ وہ کہاں ہے۔ وہ کہتے تھے کہ صاحب! اس کا یوں لے آنا تو میرے بس کی بات نہیں ہے وہ ایک مہلت کا وقفہ ہے اس کے بعد وہ آئے گی آ کے تو رہے گی۔ وہ کہتے تھے ہیں! آ کے رہے گی۔ یہ ہے جسے تکذیب کہتا ہے' سارا قرآن اس لفظ سے بھرا پڑا ہے۔ اوسیدھی سی بات یہ ہے کہ رسول نے یہ سمجھ لیا کہ اب یہ جو باقی رہ گئے ہیں ان میں اب وہ سعید روحیں نہیں ہیں جو اس انداز سے ایمان لائیں گے ان کی طرف سے مایوس ہوگئے تھے۔ ان کی طرف سے' خدا کی نصرت سے رسول اللہ ﷺ مایوس ہو جائیں گے!!(معاذ اللہ)۔ وَ ظَـنُّـوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا (12:110) اور یہ لوگ جو تھے انہوں نے یہ کہہ دیا کہ صاحب! ہمارے ساتھ یہ جھوٹ بولتا چلا آیا تباہی آئے گی تباہی آئے گی' وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ جَآءَ هُمۡ نَصۡرُنَا (12:110) ہماری نصرت آ گئی۔ کہا ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں یہ چیز ہوتی ہے۔ فَـنُـجِّـىَ مَنۡ نَّشَآءُ ؕ(12:110) محفوظ رکھنا ہم نے انہیں اس تباہی سے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق۔ اب یہاں پھر وہ کہتے

ہیں مَنۡ نَّشَآءُ(12:110) جسے ہم نے چاہا محفوظ رکھ لیا۔ چار لفظ جو ساتھ پڑے ہوئے ہیں وہ نہیں پڑھے جاتے۔ وَ لَا یُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ(12:110) یہ جو ہے کہ ہم نے اپنے قانون مشیت کے مطابق بچا لیا قانونِ مشیت یہ تھا کہ جو قومِ مجرمین نہیں وہ بچ جاتی ہے اور یہ جو قومِ مجرمین تھی ان سے ہمارے عذاب کو کوئی نہ ٹال سکا۔ تو وہ تو جرم کی بنا پہ عذاب آتا ہے مَنۡ نَّشَآءُ(12:110) کے معنی تو واضح ہو گئے۔ لَقَدۡ کَانَ فِیۡ قَصَصِہِمۡ عِبۡرَۃٌ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ؕ(12:111) یہ اقوامِ سابقہ جن کے کھنڈرات کے اوپر ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں ان کا ذکر کرنے میں۔ یہ قَصص لفظ ہے' قِصص تو قصے کی جمع ہوتا ہے' قَصص کے معنی ان کا ذکر ان کی داستان۔ ان کی داستان جو ہے لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (12:111) صاحبانِ عقل وبصیرت کے لئے۔ یہاں عقل بھی نہیں ہے عقل کا اگلا درجہ ہے الباب' یہ ہمارے ہاں بھی لبِ لباب ہے'' کہ جی! ایہدالبِ لباب اے ہے۔ جنوں تت کڈ لینا کیندے ہیگے نیں'' یہ وہ لفظ ہے۔ یعنی عقل سے بھی اگلا ایک درجہ ہے نہایت متوجہ سے CONCENTRATE کر کے عقل وفکر کے اوپر وہ اگر اس پہ غور کریں گے تو لفظ عِبۡرَۃٌ (12:111): ہمارے ہاں تو یہ لفظ عبرت اور موعظت عام لفظ آتا ہے۔

عقل کا اگلا درجہ الباب یعنی جو آیاتِ قرآنی کے حقائق تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہیں

میں نے آپ کو آیت کے معنی بتائے تھے کہ فی ذاتہٖ وہ چیز نہیں ہوتی' جنگل میں کہیں کوئی بستی آپ کو نظر نہ آئے کہیں کوئی انسان نظر نہ آئے' انسان کی آواز تک نہ سنائی دے' کوئی سراغ تک نہ ملے لیکن کہیں اگر آپ کو دھواں نظر آ جائے تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نیچے آگ ہے اور آگ ہے تو کوئی انسان بھی ہوگا۔ یا جنگل میں' صحرا میں جہاں کہیں پانی نہیں' کوئی پرندہ اڑتا نظر آ جائے تو آپ سمجھیں گے کہ کہیں پانی ہے۔ کتے بھونکنے کی آواز آ جائے تو آپ سمجھ لیں گے کہ کہیں کوئی بستی ہے۔ یہ جو چیزیں ہیں کہ دھواں آگ کے لئے' وہ پرندہ پانی کے لئے' یہ آواز اس کے لئے' یہ عربی زبان میں آیت کہلاتی ہے اس چیز کی جو وہ نیچے ہوتی ہے۔ یہ جو خدا نے کائنات کو آیات اللہ کہا ہے وہ یہ کہا ہے کہ اس دھوئیں سے تم اس شعلۂ مستور کو پہچان سکتے ہو۔ یہی لفظ عبرۃ ہوتا ہے ایسی جگہ کہ جہاں یوں آدمی ایک تو سڑک ہے جو چلی جا رہی ہے وہ مقصود بالذات ہوتا ہے اس کے اوپر چلنا جو ہوتا ہے' راستے میں ایک پل آ جاتا ہے سڑک وہاں نہیں رہتی' پل کا یہ حصہ جو ہے اور یہ پورا پل کا ہے کے لئے ہے؟ اگلی سڑک تک پہنچنے کے لئے ہے' اس کا یہی مصرف ہے' پل بجائے خویش تو کسی مصرف کی چیز نہیں ہوتی' ندی ہے بہتی ہے بہتی رہے میرا کیا' لیکن میں نے تو اس پار جانا ہے اس کے لئے یہ چیز ایک ذریعہ بنتی ہے کہ یہ جو ہے یہاں سے اگر آپ دیکھیں گے کہ یہ تمہیں یہاں پہنچا دے گی' اسے عبرت کہتے ہیں۔ عبور کا لفظ تو ہمارے ہاں بھی ہے' یہیں سے اس کو پل کہتے ہیں۔ پل کی داستانیں وہ پل ہے صراطِ مستقیم پہ بنا ہوا کہ یہاں آؤ گے اور اس کو تم پار کرو گے تو وہاں جا پہنچو گے اس نتیجے

کے اوپر کہ واقعی یہ ہوتا ہے۔

لفظ تصدیق یعنی کسی بات کو سچ کر دیکھانا کہ اس کا کیا معیار ہے

عزیزانِ من! کیا الفاظ ہیں قرآن کے!! عِبۡرَةٌ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ؕ مَا کَانَ حَدِیۡثًا یُّفۡتَرٰی (12:111) کہا سوچو! اس قسم کی باتیں کوئی انسان افترٰی بھی کر سکتا ہے' کوئی جھوٹ موٹ بھی بنا سکتا ہے اس قسم کی چیزیں۔ وَ لٰکِنۡ تَصۡدِیۡقَ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡهِ (12:111) اب پھر وہ ایک اور لفظ آ گیا' ہر جگہ آپ ترجمہ دیکھیں گے ''تصدیق کرتی ہے یہ ان کتابوں کی جو اس سے پہلے ہوگئی ہیں''۔ یہ کتاب اگر انہی کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ سچی ہیں تو اس کی ضرورت پھر کیا ہے' اور اس کے ساتھ ہی اس کی کیفیت یہ ہے کہ ان کتابوں کے متعلق یہ کہتا ہے کہ محرف ہیں' اپنی اصلی شکل میں وہ ہیں ہی نہیں' بار بار اعتراض کرتا ہے یہودیوں پہ نصرانیوں کے اوپر کہ تم اپنی کتاب میں یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡهِمۡ ۫ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (2:79) خود اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہو اور اس کو اس کتاب کے اندر داخل کر کے کہتے ہو یہ ہے کتاب۔ قرآن خود کہتا ہے' تو جن کے متعلق خود کہتا ہے ان کی تصدیق کرے گا!! کہ صاحب! یہ بالکل سچی باتیں ہیں۔ تصدیق جن معنوں میں ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے یہ وہ ترجمہ ہے ''سارے قرآن نوں اسی پنجابی اچ یا اردو اچ سمجھ لیا ہویا اے''۔ تصدیق VERIFY کرنا TESTIFY کرنا۔

انسانوں کے ہاتھ سے حاصل کردہ روٹی کو عزت کے ترازو میں نہیں تولنا چاہیے

قرآن محرف کی تصدیق کرے گا!!! پوچھو قرآن سے' زبان جاننے والوں سے کہ یہ لفظ صدق کہاں آتا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ جو وعدے تمہارے انبیاء نے تم سے کئے تھے اور ان کتابوں میں بھی اس زمانے میں آئے تھے یہ ان وعدوں کو سچ کر کے دکھائے گا۔ تصدیق کے معنی ہوتے ہیں کسی وعدے کو سچ کر کے دکھا دینا۔ یہ الفاظ و حروف میں وہاں تھے' سچ بن کے سامنے نہیں آئے تھے۔ یہ کتاب تمہیں صرف تعلیم ہی نہیں دیتی' وہ طریق عمل بھی دیتی ہے کہ جس سے اس تعلیم پہ عمل کیا جائے تو وہ نکھر کے نتائج سامنے آئیں اور یوں پتہ چلے کہ ہاں صاحب! حضرتِ عیسٰیؑ نے بھی اپنی جماعت سے صحیح کہا تھا جب یہ کہا تھا کہ عزت کی روٹی وہی ہے کہ جو تمہیں خدا کی طرف سے آسمان سے ملے' انسان کے ہاتھ کی دی ہوئی' روٹی عزت کی روٹی نہیں ہوتی' یہ بتا دے گا کر کے کہ رزقِ کریم کیسے ملتا ہے۔ عزیزانِ من! اسے تصدیق کہتے ہیں۔ وَتَفۡصِیۡلَ کُلِّ شَیۡءٍ (12:111) تفصیل کے معنی پھر ہمارے ہاں والی DETAIL آ گئی کُلِّ شَیۡءٍ (12:111) ہر شے کی DETAIL۔

عربی کے الفاظ کو اردو کے الفاظ میں نہیں سمویا جا سکتا

اب پوچھتے ہیں اعتراض کرنے والے کہ صاحب! بتایئے اس میں تصدیق کہاں ہے۔ پہلے تو وہ کُلِّ شَیۡءٍ (12:111) کے معنی یہ انہوں نے لے لئے کہ جتنی چیزیں ہیں ان کی تفصیل بتانی چاہئے بتایئے صاحب! ملیریا بخار کہاں لکھا ہے اس کے اندر۔ جنہوں نے سمٹا کے یہ بھی لیا کہ مذہب کے متعلق ہے انہوں نے کہا کہ تفصیل ہونی چاہئے تفصیل تو اس میں نماز تک کی نہیں ہے۔ تفصیل کے اردو میں معنی لئے اس کو قرآن کے اندر پہنایا۔ تفصیل کا تو مادہ 'ف ص ل' ہے فاصلہ تو آپ کو معلوم ہے یہ فصل کے معنی ہوتا ہے الگ الگ کر دینا، نکھیڑ کے بیان کر دینا نکھار کر بیان کرنا' الگ الگ کر کے DISTINCTLY ایک چیز کو بیان کر دینا۔ اور بیان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے DISTINCTLY بیان کیا جائے۔ وَّ ھُدًی وَّ رَحۡمَۃً (12:111) جتنی چیزیں انسانی راہنمائی کے لئے اور ان کی نشوونما کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے جسے ہم دین کا نظام کہتے ہیں' اسے یہ نکھار کر' ابھار کر بیان کر دیتا ہے' کوئی ابہام نہیں رہتا' الجھاؤ نہیں رہتا' التباس نہیں رہتا تَفۡصِیۡلَ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ ھُدًی وَّ رَحۡمَۃً (12:111) راہنمائی ہے سامانِ نشوونما ہے۔ پوچھا جائے گا کہ یہ سارے نہ ماننے والے کافر' گالیاں دینے والے ان کے لئے تو یہ ہے ہی نہیں' کہا لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (12:111) ہم آپ اس میں سے کیا راہنمائی لیں گے' اس جماعت کے لئے کہ جو اس کی ابدی صداقتوں کو علیٰ وجہ البصیرت مانے کہ یہ سچی ہیں۔ اور جب اس چیز پر آپ CONVINCED ہو جائیں گے تو آگے چلیں گے' جبھی آپ کو راستہ فائدہ دے گا جب آپ کو یقین ہو کہ یہ سڑک وہاں جاتی ہے جہاں میں نے پہنچنا ہے۔ اگر چلتے وقت ہی تذبذب ہو' من بھر کا بھاری قدم ہو جاتا ہے چلتے وقت۔ یقین ہو اس چیز کا کہ یہ صراطِ مستقیم مجھے وہاں پہنچائے گی' یہ کہا ھُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (12:111) ۔عزیزانِ من! سورۃ یوسف آج ختم ہو گئی اب ہم اس کے بعد اگلے درس میں سورۃ رعد یعنی تیرہویں سورۃ شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔معراجِ انسانیت)